



# غیر مسلم معاشرے میں مسلمانوں کی دینی و اخلاقی ذمہ داری

مقالہ

برائے پی ایچ ڈی۔

مقالہ نگار

ندیم اشرف

نگراں

پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی

شعبہ سنی دینیات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

THESIS

۲۰۱۱

T-9209



T9209

THESIS

انتساب



والد اور والدہ کے نام

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا



## فہرست

۱۲-۱	مقدمہ
۸۵-۱۳	باب اول: مسلم معاشرہ کے اجزائے ترکیبی: خصوصیات اور امتیازات
۱۴	سماجی و معاشرتی زندگی کی ضرورت
۱۵	معاشرہ کی تعریف
۱۵	معاشرہ کی خصوصیات
۱۶	معاشرتی تبدیلی
۱۶	معاشرتی تبدیلی کے عوامل
۱۹	اسلامی معاشرہ
۲۲	حقوق انسانی کا مفہوم
۲۲	بنیادی انسانی حقوق
۲۳	اسلام سے پہلے حقوق انسانی کی پامالی
۲۳	رحمت عالم ﷺ کا ظہور قدسی
۲۴	اسلام میں انسانی حقوق کا تصور
۲۵	اسلام میں انسانیت کا احترام
۲۸	انسانی اخوت و محبت اور مساوات
۳۱	عام انسانوں پر رحم و کرم
۳۲	انسانی جان کی حفاظت
۳۷	ملکیت و تصرف کا حق اور مال کی حفاظت

۴۱	انسانی عزت و ناموس کا تحفظ
۴۵	شخصی آزادی کا تحفظ
۴۶	مذہبی آزادی کا تحفظ
۴۹	اظہارِ رائے کی آزادی کی حفاظت
۵۰	تعلیمی حقوق کا تحفظ
۵۲	ظلم و زیادتی کے خلاف احتجاج
۵۳	شہری حقوق کا تحفظ
۵۵	معاشرتی عدل و انصاف
۵۷	اسلامی معاشرہ میں عورتوں کے حقوق
۶۱	اسلامی معاشرہ میں بچوں کے حقوق
۶۲	والدین کے حقوق
۶۶	اسلام میں غلاموں کے حقوق
۶۶	مظلوموں، کمزور طبقوں اور حاجت مندوں کے حقوق
۶۸	اسلام میں دیگر اقوام اور اہل مذاہب کے حقوق
۶۹	کفار کے ساتھ حسن سلوک
۷۰	یہودیوں کے ساتھ حسن سلوک
۷۱	عیسائیوں کے ساتھ حسن سلوک
۷۳	غیر مسلم رعایا (ذمیوں) کے حقوق
۷۴	منافقین کے ساتھ حسن سلوک
۷۵	مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے والوں کے سلسلے میں اسلامی ہدایات
۷۷	وطن کی محبت اسلام میں
۷۸	خلاصہ
۸۱	حواشی و مراجع

۱۱۳-۸۶	باب دوم: انبیاء علیہم السلام غیر مسلم معاشرہ میں
۸۷	انبیاء دعوت کے آئینے میں
۸۸	ہادی اور رہبر کی ضرورت
۸۹	انبیاء کی بعثت کا مقصد
۹۰	دعوت الی اللہ کے امتیازات
۹۲	دعوت الی اللہ کے مقاصد
۹۴	دعوت الی اللہ کے پیغمبرانہ آداب
۹۸	دعوت میں مخاطب پر بے جا بار نہ ڈالنا
۹۹	براہ راست تنبیہ سے صرف نظر
۱۰۰	عقلی دلائل کا سہارا
۱۰۲	مشکل حالات میں دعوت
۱۰۳	عفو و درگزر انبیاء کا اہم وصف
۱۰۴	محمد عربی ﷺ
۱۱۰	خلاصہ
۱۱۳	حواشی و مراجع
۱۶۶-۱۱۴	باب سوم: غیر مسلم معاشرے میں مسلمانوں کی آبادی اور ان کے مسائل
۱۱۵	حضور اکرم ﷺ کی مکی و مدنی زندگی ہمارے لیے اسوہ
۱۱۶	غیر مسلم معاشرہ میں مسلمانوں کی آبادی کے مسائل
۱۱۹	سیاسی مسائل
۱۲۲	انتخابی سیاست میں مسلمانوں کی شرکت
۱۲۳	الیکشن میں امیدوار بننا
۱۲۴	حق رائے دہی کا مناسب استعمال
۱۲۵	ووٹ کی شرعی حیثیت

- ۱۲۵ مسلم سیاسی جماعت کا قیام
- ۱۲۸ اسلامی مخالف پارٹی میں مسلمانوں کی شمولیت اور ووٹ
- ۱۲۸ غیر مسلم سیاسی جماعتوں سے معاہدہ اور انتخابی تال میل
- ۱۳۰ فرقہ پرست سیاسی جماعتیں اور مسلمان
- ۱۳۱ اسلام دشمن پارٹیوں کے منشور میں تبدیلی اور مسلمانوں کا لائحہ عمل
- ۱۳۳ ہر حال میں خدا کی ذات پر توکل اور بھروسہ
- ۱۳۳ سیاست میں مسلمانوں کی شرکت اور فقہ اکیڈمی نئی دہلی کے فیصلے
- ۱۳۴ ہندوستانی سیاست اور مسلمان
- ۱۳۴ جمہوریت کی تعریف
- ۱۳۵ ہندوستانی میں جمہوریت کی عملی شکل
- ۱۳۵ جمہوری ہندوستان کے کمزور پہلو
- ۱۳۷ مسلمانوں کی سیاسی حکمت عملی
- ۱۳۹ مسلم نمائندوں کی مسلم مسائل سے عدم دلچسپی
- ۱۴۰ خلاصہ
- ۱۴۰ سماجی مسائل
- ۱۴۱ معاشرہ میں قیام امن
- ۱۴۳ معاشرہ میں قیام امن کے لیے اجتماعی تنظیم کا قیام
- ۱۴۴ غیر مسلموں سے ہدایا قبول کرنے کی شرعی حد
- ۱۴۶ غیر مسلموں کی امداد اور خدمت خلق
- ۱۴۸ غیر مسلموں کی خوشی و غم میں شرکت
- ۱۵۰ غیر مسلموں کی تجہیز و تکفین اور جنازے میں شرکت اور استغفار
- ۱۵۲ غیر مسلموں کے ساتھ تجارتی معاملات
- ۱۵۲ خلاصہ
- ۱۵۳ غیر مسلم معاشرہ میں مسلمانوں کے دینی مسائل





۱۸۳	اوقاف کی بحالی
۱۸۴	چیرمٹی ورک
۱۸۴	این جی اوز کا قیام
۱۸۵	نجی سیکٹر
۱۸۵	معاشی ترقی
۱۸۶	خلاصہ
۱۸۷	دینی ذمہ داریاں
۱۸۷	ملی تشخص کی حفاظت
۱۸۸	مسلم پرسنل لا کا تحفظ اور اس کی تفہیم جدید
۱۸۹	اصلاح عقائد و رسوم
۱۹۰	دعوت و تبلیغ
۱۹۲	شہادت حق سے مراد
۱۹۲	دعوت حق سے صرف نظر کا خمیازہ
۱۹۳	تحقیر کی وجہ
۱۹۴	مشکل حالات میں مسلمانوں کا مطلوب طرز عمل
۱۹۵	مقصد کے تئیں آگہی
۱۹۵	داعیانہ اوصاف
۲۰۰	تعلیمی نظام
۲۰۰	مؤثر میڈیا کا قیام
۲۰۱	اجتماعی اجتہاد
۲۰۳	اخلاقی ذمہ داریاں
۲۰۳	اقوام عالم کی اخلاقی صورت حال
۲۰۵	اخلاق انسانی زندگی کی اہم ضرورت

۲۰۶	اسلام اور اخلاق
۲۰۸	غیر مسلم معاشرہ میں اخلاقی ذمہ داریاں
۲۰۹	ہمدردی و صلہ رحمی
۲۰۹	غیر مسلم والدین کے ساتھ حسن سلوک
۲۱۰	دوسرے غیر مسلم رشتہ دار
۲۱۱	غیر مسلم پڑوسیوں سے تعلقات
۲۱۲	غیر مسلم مریض کی عیادت
۲۱۲	غیر مسلم کی تعزیت
۲۱۲	غیر مسلم عزیز کی قبر کی زیارت
۲۱۲	غیر مسلموں کے تہواروں میں بعض حدود کے ساتھ شرکت
۲۱۲	غیر مسلموں سے مشترکہ امور میں تعاون
۲۱۵	خلاصہ
۲۱۶	غیر مسلم معاشرہ میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے چند ضروری اصول
۲۱۸	حواشی و مراجع
۲۲۳-۲۲۹	کتابیات:



## مقدمہ

اقوام عالم میں رائج مذاہب اور ان کی تعلیمات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دیگر اقوام و مذاہب کے مقابلے ایک صالح معاشرے کی تشکیل، امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے، کیوں کہ اسلام امن و سکون اور بلند اخلاق و کردار سے پر معاشرے کا جو جامع تصور پیش کرتا ہے۔ دیگر مذاہب وہ تصور پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ اسلامی معاشرہ ان تمام محاسن و خوبیوں کا جامع ہے جو دیگر مذاہب میں بکھری ہوئی شکل میں اور ناقص حالت میں نظر آتی ہیں۔ مثلاً سچ بولنا ایسی صفت ہے جو تمام مذاہب میں محدود و مطلوب ہے۔ اگر ہم لوگوں سے یہ پوچھنا شروع کر دیں کہ کیا سچ بولنا اچھا ہے یا جھوٹ بولنا، تو ہر شخص کا جواب یہی ہوگا کہ سچ بولنا اچھا ہے، خواہ اس کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ فطرتاً سب انسان ایک جیسے ہیں۔ اب انہی لوگوں سے یہ پوچھنا شروع کر دیں یہ جانتے ہوئے کہ سچ بولنا اچھا ہے کیا ہر انسان سچ بولتا ہے؟ تو جواب یقیناً مختلف ہوگا۔ یعنی فطرت تو ہر انسان کی ایک سی ہے، لیکن ضرورت فرق ڈال دیتی ہے اور جب بات ایک مسلمان کی ہوگی تو اس کے لئے ہر حال میں یہ معیار مقرر کیا گیا ہے کہ ”مسلمان کچھ بھی ہو سکتا ہے، لیکن جھوٹا نہیں ہو سکتا۔“

مطلب یہ ہے کہ اسلام کا معاشرتی معیار یہ ہے کہ محاسن و خوبیاں معاشرہ کے ہر ایک فرد کے اندر کامل درجے کی پائی جائیں۔

اسلامی معاشرے کی تشکیل سے مراد یہ ہے کہ خواہ مسلمان کسی بھی معاشرے کا حصہ ہو، خواہ وہ تکثیری معاشرہ اور غیر مسلم معاشرہ ہی کیوں نہ ہو، وہاں بحیثیت مسلمان اس کی کچھ معاشرتی ذمہ داریاں ہیں جن کو ادا کر کے صحیح ڈھنگ سے اسلامی تعلیمات اور اسلامی طرز معاشرت کو لوگوں کے سامنے پیش کر سکتا ہے، وہ لوگوں کو بتلا سکتا ہے کہ اسی زندگی میں دونوں جہاں کی بھلائی ہے۔ کیوں کہ اسلام کی تعلیم سروری و جہاں بانی کی تعلیم ہے، اسکی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ یہ دین اپنے ماننے والوں میں بغیر شائبہ تکبر کے خود داری، بغیر کسی فریب نفس کے اعتماد و یقین اور ہر حال میں صابر و شاکر

رہنے کا ملکہ اور جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اسلام یہ بھی جذبہ پیدا کرتا ہے کہ انسان اس طرح سے زندگی گزارے کہ اس کی ذات سے خیر کے چشمے جاری ہوں، اس کی جسمانی اور روحانی صلاحیتیں اور مالی وسائل دوسرے انسانوں کے کام آئیں۔ اپنی حد استطاعت کے اندر وہ ان کی مادی اور اخلاقی مدد کرے، وہ گھر سے فتنہ و فساد پھیلاتا ہو انہ نکلے، بلکہ انسانوں کے خیر خواہ اور فلاح و بہبود چاہنے والے کی حیثیت سے سامنے آئے۔ وہ جہاں بیٹھے امن و سلامتی کا پیغام بکھیرتا رہے، دوسروں کی مشکلات کو دور کرے اور ان کی دینی و اخلاقی اصلاح کی کوشش میں لگا رہے۔ اس طرح وہ عملی شکل میں اسلام کو پیش کر سکتا ہے۔

اسلام فرد کو معاشرہ کی مادی اور اخلاقی خدمت پر جس طرح ابھارتا ہے اور اس کا جذبہ اس کے اندر پیدا کرتا ہے اس کا اندازہ ایک حدیث سے ہو سکتا ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”ایاکم والجلوس علی الطرقات فقالوا مالنا بذا انما ہی مجالسنا نتحدث فیہا، قال فاذا ابیتم الا المجالس فاعطوا الطريق حقها قالوا وما حق الطريق قال غض البصر وكف الاذی ورد السلام وامر بالمعروف ونهی عن المنکر۔“<sup>۱</sup>

(راستوں میں بیٹھنے سے بچو۔ صحابہ نے عرض کیا کہ ہمارے لئے اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے، یعنی بیٹھنا ہی پڑتا ہے۔ یہ ہماری مجلسیں ہیں۔ ان میں ہم بات چیت کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: اگر تم بیٹھنا ضروری سمجھتے ہو تو راستہ کا حق ادا کرو۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ راستہ کا حق کیا ہے؟ ارشاد ہوا نگاہیں نچلی رکھنا، ایذا رسانی سے بچے رہنا، سلام کا جواب دینا، معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا۔)

یہ حدیث بتاتی ہے کہ اسلام ایک مسلمان پر جو معاشرتی ذمہ داریاں عائد کرتا ہے، اسے ان کا راستوں، بازاروں میں، مجلسوں اور محفلوں میں، ہر جگہ خیال رکھنا چاہیے۔ وہ دوسروں کی عفت و عصمت کا پاسبان ہے، اسے کسی پر بری نگاہ ڈالنے کی اجازت نہیں ہے۔ وہ دوسروں کی تکلیف دور

کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے، اس کی ذات سے کسی کو کسی قسم کی اذیت نہیں پہنچنی چاہیے۔ جیسے آمد و رفت میں رکاوٹ ڈالنا، گندگی پھیلانا، راہ گروں سے الجھنا اور بدزبانی کرنا وغیرہ۔ دوسروں کو ایذا رسانی کی جتنی بھی صورتیں ہو سکتی ہیں ان سب سے اس کا دامن پاک ہونا چاہیے۔ کوئی اس پر امن و سلامتی کی دعا بھیجے تو فوراً اس کا جواب دینا چاہیے، تاکہ وہ اس کی طرف سے اطمینان محسوس کرے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے اوپر ترجیحی طور پر یہ ذمہ داری بھی عائد کی گئی ہے کہ وہ ہر جگہ معروف کی تلقین کرے اور منکر سے روکے۔ اس سے معاشرہ میں نیکیوں کو فروغ حاصل ہوگا اور برائیاں ختم ہوں گی۔ جب کوئی شخص کوئی غلط اقدام اٹھانے کا ارادہ کرے گا، اسے محسوس ہوگا کہ سوسائٹی میں اس کی پکڑ کرنے والے لوگ موجود ہیں۔ اسی طرح ایک مسلمان سے اسلام کا معاشرتی مطالبہ یہ بھی ہے کہ اس کے انداز گفتگو اور انداز مخاطب میں شرافت اور پاکیزگی پائی جائے اور شیریں کلامی اس کی شناخت اور پہچان ہوتا کہ وہ اپنی نرم گفتگو اور شیریں کلامی کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں اسلامی اقدار و خیالات اور روشن تعلیمات کو بہتر طور پر جاگزیں کر سکے۔ قرآن مجید نے شیریں کلامی اور حسن مخاطب کو اتنی اہمیت دی ہے کہ ایک جگہ نماز اور زکوٰۃ سے پہلے اس کا ذکر آیا ہے:

”وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ.“ (البقرہ: ۸۳)

(اور لوگوں سے اچھے طریقے سے بات کرو، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔)

اسلام یہ بھی ترغیب دیتا ہے کہ معاشرہ کا جو بھی فرد ضرورت مند اور محتاج ہو اس کی حاجت روائی کی جائے۔ اگر وہ بھوکا پیاسا اور لباس کا محتاج ہے تو ایک مسلمان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس ضرورت مند شخص کو کھانا پانی اور لباس فراہم کرے۔ وہ بے گھر ہے تو اس کی رہائش کا انتظام کرے، اگر وہ بیمار ہے تو اس کا علاج اور تیمارداری کرے، وہ بے روزگار ہے تو اسے روزگار سے لگائے، وہ جاہل ہے تو اسے علم و حکمت سے آراستہ کرے اور وہ مظلوم ہے تو ظالموں کے ظلم سے اس کی حفاظت کرے۔ اس جذبہ کو نکھارنے اور سنوارنے کے لئے اسلام نے نہ صرف ظلم و زیادتی کی مذمت کی، اس کی قباحت واضح کی بلکہ اس بات پر بھی زور دیا کہ کوئی بھی شخص کسی کی کمزوری، ناتوانی، غربت اور جہالت کا استحصال نہ کرے، بلکہ اسے نفع پہنچانے میں جو کمی رہ گئی ہے اسے دور کرنے کی کوشش کرے۔ اسے کسی تکلیف میں گرفتار نہ دیکھ کر خوشی محسوس نہ کرے بلکہ اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھے

اور جن مصائب میں وہ گھرا ہوا ہے ان سے نکلنے میں اس کی مدد کرے۔ اس طرح اسلام ایک ایسا معاشرہ فراہم کرتا ہے جس میں ظلم کے خلاف شدید نفرت پائی جائے، ضرورت مندوں کی ضرورتیں بلا تفریق مذہب محض انسانیت کی بنیاد پر پوری کی جائیں اور ہر طرف عدل و احسان کے جذبات کی حکمرانی ہو۔

اسلام کی نظر میں معاشرتی و اخلاقی ذمہ داریوں کا مفہوم کافی وسیع ہے، مثلاً اگر سماج کے افراد کے ساتھ حسن سلوک اور خدمت کی بات کی جائے تو اس سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ صرف ان کی مالی مدد کی جائے اور ان کی مادی ضرورتیں پوری کی جائیں، بلکہ حسن سلوک اور خدمت کے ساتھ محبت، ہمدردی، دل جوئی اور اعلیٰ اخلاق کا وہ رویہ بھی مطلوب ہے جو ایک شریف انسان دوسرے انسان کے ساتھ اختیار کرتا ہے اور جسے حسن سلوک سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انسان اس دنیا میں اسی کا محتاج نہیں ہے کہ پیٹ بھرنے کے لئے اسے دو وقت روٹی، تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا اور سر چھپانے کے لئے مکان مل جائے، بلکہ وہ اس بات کا بھی محتاج ہے کہ اگر وہ بیمار پڑ جائے تو اسے علاج کے لئے اسپتال پہنچا دیا جائے، اگر وہ غریب اور نادار ہے تو اسے حقیر اور ذلیل تصور نہ کیا جائے۔ اس کے ساتھ انسانیت کی بنیاد پر برابری اور مساوات کا برتاؤ کیا جائے۔ بیماری میں دوا کے ساتھ تیمارداری بھی کی جائے۔ اس سے کوئی غلطی ہو جائے تو عفو و درگزر سے کام لیا جائے، اس کی خوشی اور غم میں شرکت کی جائے اور مادی تعاون کے ساتھ گفتگو، میل جول، تعلقات اور معاملات میں اعلیٰ اخلاقی رویہ اختیار کیا جائے، کیوں کہ بعض اوقات عمدہ اخلاق، ہمدردی کا ایک لفظ، محبت بھری ایک بات اور ایک کلمہ خیر کی اہمیت مالی تعاون سے زیادہ ہوتی ہے۔

ایک غریب اور نادار شخص کی خدمت تو روپیہ پیسہ کے ذریعے کی جاسکتی ہے، لیکن جس کے پاس خود دولت ہو اسے ہمارے پیسے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ البتہ ہمدردی، محبت اور اخلاقی رویہ کا محتاج ہر شخص ہے۔ اس سے نہ کوئی امیر بے نیاز ہو سکتا ہے اور نہ کوئی فقیر۔

اسلام اپنے ماننے والوں کو نہ صرف مسلم قوم کا ہمدرد بناتا ہے، بلکہ جس سماج اور معاشرہ کا وہ حصہ ہیں، اس معاشرہ کے ہر ایک فرد کا خواہ وہ دوسرے مذہب اور عقیدے کا ہی کیوں نہ ہو وہ سب کا ہمدرد بناتا ہے۔ تعصب آدمی کو نفرت اور عداوت سکھاتا ہے۔ جو شخص قومی تعصب میں گرفتار ہو وہ اپنی

قوم کے سوا کسی دوسری قوم کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا روادار نہیں ہوتا۔ اسلام اس کے خلاف ہے۔ اس کے نزدیک مخلوق اللہ کا کنبہ ہے جو ان کی جتنی خدمت کرے وہ اس کا اتنا ہی محبوب ہے۔ حضرت انسؓ اور حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”الخلق کلہم عیال اللہ و احبہم الیہ انفعہم لعیالہ۔“<sup>۱</sup>

(مخلوق ساری کی ساری اللہ کا کنبہ ہے اس میں وہ شخص اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہے جو اس کے کنبہ کو زیادہ نفع پہنچائے۔)

قرآن مجید نے مسکینوں، محتاجوں، معذوروں، یتیموں اور وسائل سے محروم انسانوں کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا عام حکم دیا ہے۔ کہیں بھی اس نے یہ ہدایت نہیں کی کہ صرف مسلمانوں یا انسانوں کے کسی خاص گروہ کی خدمت کی جائے اور دوسروں کی نہ کی جائے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ خدمت پوری نوع انسانی کی ہو، اپنوں کی بھی اور غیروں کی بھی۔ ہم خیال اور ہم عقیدہ افراد کی بھی اور ان لوگوں کی بھی جو ہم سے اختلاف رکھتے ہیں۔ نوع انسانی کا ہر فرد اس بات کا حق رکھتا ہے کہ آلام و مصائب میں اسے تنہا تڑپتے نہ چھوڑا جائے اور رنگ، نسل، قوم اور وطن کے اختلاف کے باوجود امکان کی حد تک اس کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ قرآنی آیات کے علاوہ احادیث میں مطلق انسانوں کے ساتھ رحم و کرم اور ان کی خدمت کی تعلیم دی گئی ہے، حضرت جریر بن عبد اللہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”لا یرحم اللہ من لا یرحم الناس۔“<sup>۲</sup>

(اللہ اس شخص پر رحم نہیں فرماتا جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا۔)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”لا تنزع الرحمة الا من شقی۔“<sup>۳</sup>

(رحم اور ہمدردی تو اس شخص کے سینہ سے نکال دی جاتی ہے جو بد بخت ہو۔)

ایک اور حدیث میں آپؐ نے ارشاد فرمایا:

<sup>۱</sup> ابویعلیٰ، مسند ابویعلیٰ، دار ایمان للتراث، دمشق، ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۸ء

<sup>۲</sup> الصحیح البخاری، کتاب التوحید، باب قل ادعو اللہ

<sup>۳</sup> ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی رحمة الناس

”خیر کم من یرجی خیرہ ویومن شرہ وشر کم من لا یرجی خیرہ ولا یومن شرہ۔“<sup>۱</sup>

(تم میں بہترین شخص وہ ہے جس سے خیر کی توقع کی جائے اور جس کے شر سے لوگ محفوظ رہیں اور تم میں بدترین شخص وہ ہے جس سے خیر کی توقع نہ کی جائے اور جس کے شر سے لوگ محفوظ نہ رہیں۔)

ان احادیث میں کسی فرق و امتیاز کے بغیر خدا کی ساری مخلوق کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جو شخص بھی ہماری ہمدردی اور مدد کا محتاج ہے اس کی مدد کرنی چاہیے۔ اس معاملہ میں انسانوں کو گروہوں اور جماعتوں میں تقسیم کرنا یا اپنے اور پرانے، شناسا اور اجنبی، ہم مذہب اور دوسرے مذہب والے کے درمیان فرق کرنا اسلام کے مزاج اور اس کی ہدایت کے سراسر خلاف ہے۔ اسلامی تعلیمات میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

انسان کو ماں باپ، بیوی بچہ اور قرابت داروں سے فطری طور پر محبت ہوتی ہے۔ وہ ان سے ایک طرح کا قلبی تعلق محسوس کرتا ہے، اس وجہ سے ان کی خدمت کو اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہے، لیکن معاشرہ کے دوسرے افراد سے اس طرح کی جذباتی وابستگی نہیں ہوتی۔ اس لئے اس کا رویہ بھی ان کے سلسلے میں مختلف ہوتا ہے۔ اسلام انسانوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت، ان کے درجات اور مراتب کی پوری رعایت کرتا ہے اور ان کے حقوق کا تعین کرتا ہے۔ اسی لئے اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ تم ان ہی افراد کے ساتھ حسن سلوک اور خدمت کو اپنا فرض نہ سمجھو جن سے تمہارا خونی رشتہ ہے، بلکہ وہ لوگ بھی تمہارے بہترین سلوک کے مستحق ہیں جن سے خونی رشتہ یا مذہبی رشتہ نہیں ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ ایک مسلمان کا رشتہ اس کے گھر اور خاندان تک محدود نہ رہے بلکہ پورے سماج اور معاشرے سے اس کا رشتہ قائم ہو اور وہ ہر فرد کو اپنے گھر اور خاندان کا فرد تصور کر کے اس کی خدمت کرے، اس کے ساتھ ہمدردی کرے اور بہترین سلوک کرے۔

دنیاوی تجربے کی بات ہے کہ بہت سے لوگوں میں خدمت کا تو جذبہ ہوتا ہے، لیکن نظر محدود ہوتی ہے۔ انہیں اپنی ذات کی طرح بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی بیوی، بچوں، خاندان اور قبیلہ والوں سے



ہی لگاؤ ہوتا ہے، لیکن یہی لگاؤ اور تعلق دوسرے وسیع تعلقات کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ ان کے سامنے صرف اپنے قریب ترین افراد کا مفاد ہوتا ہے، ان ہی کی فلاح و بہبود کے بارے میں وہ سوچتے ہیں، ان کے علاوہ کسی کے سود و زیاں سے انہیں کوئی سرور کار نہیں ہوتا۔ فائدہ پہنچانے کے لئے دوسروں کو نقصان پہنچانے سے بھی وہ دریغ نہیں کرتے۔

اسلام نہ تو فرد کی اہمیت کم کرتا ہے اور نہ خاندان اور قبیلہ کو نظر انداز کرتا ہے۔ اس نے دونوں کے حقوق اور ان کی ذمہ داریاں واضح کر دی ہیں۔ البتہ وہ خدمت اور بھلائی کا وسیع تصور دیتا ہے۔ وہ یہ احساس بیدار کرتا ہے کہ انسان پر اس کی ذات، اس کے خاندان اور مذہب کے لوگوں کے حقوق ہی عائد نہیں ہوتے، بلکہ وہ معاشرہ بھی اپنے حقوق رکھتا ہے جس کا وہ ایک فرد ہے۔ وہ معاشرہ جہاں اس کی نشوونما ہوئی اور وہ معاشرہ جس کے افراد کے ساتھ اپنے شب و روز بسر کرتا ہے پھر بھلا وہ کس طرح اس معاشرہ کو نظر انداز کر سکتا ہے اور کیوں کر اس کے حقوق کو فراموش کر سکتا ہے۔

اسلام نے اپنے ماننے والوں کے جو معاشرتی ذمہ داریاں طے کی ہیں ان میں کسی طرح کی تفریق اور عصبیت نہیں ہے، بلکہ اس نے یہ کہا کہ سارے مسلمان ایک امت ہیں، انہیں ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونا چاہیے۔ لیکن یہ حقیقت انہیں فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ وہ پوری نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے ذمہ دار ہیں اور اس ذمہ داری کا تقاضا ہے کہ کسی فرد بشر سے تعصب نہ برتا جائے اور وقت ضرورت اس کی ممکنہ خدمت کی جائے۔ یہ وہ معاشرتی ذمہ داریاں ہیں جو ایک مسلمان کو ہر حال میں ہر معاشرے میں ادا کرنی ہے خواہ وہ اس معاشرہ میں اقلیت کی حیثیت سے رہ رہا ہو یا اکثریت کی حیثیت سے رہ رہا ہو۔ لیکن چوں کہ آج مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد تکثیری اور غیر مسلم معاشرے میں رہتی ہے، ایسے معاشرہ میں ان ذمہ داریوں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اسلام ایسے معاشرہ میں خاص طور پر مسلمانوں کو دینی و اخلاقی اقدار کا حامل بننے پر زور دیتا ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ لوگ مسلمانوں کے اخلاق و کردار اور انسانی خدمات کے تئیں ان کی وارفتگی کو دیکھ کر اسلام کے محاسن کو تسلیم کریں اور اس کی طرف مائل ہوں، کیوں کہ ایک مسلمان درحقیقت داعی الی اللہ ہے، جس کا اولین تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے بندوں سے داعی کا تعلق نصیح و خیر خواہی کا ہو۔ اس کا مقصد صرف یہ ہو کہ کس طرح وہ لوگوں کو کفر و شرک کی تاریکی سے باہر نکالے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے اسی

امت اجابت کے ہاتھ وہ نسخہ کیمیا دے رکھا ہے جس سے جاں بلب انسانیت کو حیات نول مل سکتی ہے۔ روز اول سے ہی اسلام مخالف طاقتیں اس جھوٹے پروپیگنڈہ میں شامل رہی ہیں کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے۔ یہ پروپیگنڈہ محض عناد پر مبنی ہے۔ کیوں کہ ایک انصاف پسند شخص حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھے گا تو یہ محسوس کرے گا کہ جس زمانے میں اسلام طلوع ہوا، اسلام قبول کرنا اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالنا تھا۔ ان ہی خطرات اور مصائب کے مقابلے کی وجہ سے مہاجرین فضیلت میں اول درجے پر ہیں۔ دن بدن اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد اور اسلام کا فروغ اسلام کے ذاتی محاسن، رسول اللہ ﷺ کی تسخیر اخلاق اور مسلمانوں کے طرز عمل کے ذریعے ہی ہوا۔ اس حقیقت کو غیر متعصب لوگ قبول کرتے ہیں۔ فتح مکہ کا واقعہ اس کی کھلی دلیل ہے۔ نبی کریم ﷺ اگر چاہتے تو اپنے مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کا بدلہ تلوار کے ذریعے لے سکتے تھے اور لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کر سکتے تھے، لیکن آپؐ نے اس دن کو یوم المرحۃ قرار دیا اور کسی کو اس کی طبیعت کے خلاف جانے پر مجبور نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ جو ڈرے اور سہمے تھے وہ نبی کریم ﷺ کے اخلاق کریمانہ سے متاثر ہو گئے اور جوق در جوق اسلام میں داخل ہو کر یدخلون فی دین اللہ افواج کی عملی تفسیر بن گئے۔

اس کے علاوہ بے شمار واقعات ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے زیادہ دنیا میں کوئی شخص حلیم و کریم، بردبار و خوش خلق، نرم خو، سخت سے سخت جرم میں درگزر کرنے والا اور خون ریزی سے بچنے والا نہ تھا۔ پھر بھلا یہ الزام اسلام کے دامن پر کیسے لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے۔ جیسا کہ ماقبل میں عرض کیا گیا کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد غیر مسلم معاشرہ میں رہتی ہے اور ان کے اخلاق و کردار کے ذریعے ہی اسلام کی تصویر دیگر اقوام کے سامنے آتی ہے۔ اس لیے مسلمانوں کی نہ صرف دینی بلکہ اخلاقی ذمہ داری بھی ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے انسانیت کے تین اسلام کی جو روشن تعلیمات ہیں، ان کو عملی شکل میں پیش کر دکھائیں اور اپنے اخلاق و عمل سے یہ ثابت کر دکھائیں کہ یہ اس نبی کی امت ہیں جن کی بعثت مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے ہوئی تھی۔ ایسا کر کے نہ صرف مسلمان اپنے لئے توشہ آخرت جمع کر سکتے ہیں، بلکہ ناواقفیت، جہالت، تقلید اور عناد کی وجہ سے مخلوق کا ایک بڑا حصہ جو اپنے خالق سے غافل ہے وہ غفلت کی دبیز چادر سے باہر نکل کر اسلام کی خوبیوں سے واقف ہو کر اس کے مفہوم سے آشنا ہو کر اور ایک خدا کی عبودیت اختیار کر کے نہ صرف خود کو بلکہ پورے

معاشرے کو اور پوری انسانیت کو قہر الہی کا نشانہ بننے سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

ہر زمانہ میں اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی کہ مسلمانوں کو ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا جائے اور ان ذمہ داریوں کی ادائیگی میں ہونے والی کوتاہیوں پر متنبہ کیا جائے۔ شعبہ سنی دینیات جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے دینی شعور کا ترجمان ہے، اس نے اس ضرورت کو شدت سے محسوس کیا اور قرآن وحدیث اور مستند مآخذ ومصادر سے مزین ایک علمی دستاویز پی ایچ۔ ڈی مقالے کی شکل میں پیش کرنے کے لئے احقر کو یہ ذمہ داری دی اور مقالے کا عنوان ”غیر مسلم معاشرہ میں مسلمانوں کی دینی و اخلاقی ذمہ داری“ رکھا۔

میں شعبہ دینیات کا ممنون و مشکور ہوں کہ اس قدر حساس اور اہم موضوع پر کام کرنے کا موقع عنایت فرمایا:

اس مقالے میں کل چار ابواب ہیں:

(۱) مسلم معاشرہ کے اجزائے ترکیبی: اس باب میں سب سے پہلے سماج کی تعریف، اس کے اجزائے ترکیبی، خصوصیات، سماج میں تبدیلی کے محرکات اور اس کے عوامل بیان کیے گئے ہیں پھر مسلم معاشرہ کی خصوصیات اور امتیازات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور خاص طور پر مسلم معاشرہ کے ممتاز ہونے کی جو بنیادی وجہ ہے یعنی انسانی حقوق کا پاسبان ہونا، اس کے تمام جزئیات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ مسلم معاشرہ کو دیگر معاشرے پر جو فوقیت حاصل ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ انسانی حقوق کے تئیں جس قدر حساس مسلم معاشرہ ہے، دوسرے معاشرے اس کے کافی پیچھے ہیں۔

(۲) اس باب میں ”انبیاء غیر مسلم معاشرہ میں“ کے تحت انبیاء کی دعوت، ان کی بعثت کا مقصد، آداب دعوت، حسن معاشرت، خدمت، عفو و درگزر اور صبر و تحمل وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے۔ چوں کہ انبیاء کی بعثت غیر مسلم معاشرہ میں ہی ہوئی ہے، اس لئے ان کا طرز عمل، ان کا کردار اور طریقہ دعوت ان مسلمانوں کے لئے نمونہ عمل ہے جو تکثیری معاشرہ میں رہتے ہیں اور فریضہ دعوت انجام دینے میں آلام ومصائب اور غیر موافق حالات کا سامنا کرتے ہیں۔

(۳) اس باب میں غیر مسلم معاشرہ میں مسلمانوں کی آبادی اور ان کے مسائل بیان کئے گئے ہیں اور اس کے تحت آبادی کے مسائل، دینی مسائل، سماجی مسائل اور سیاسی مسائل پر تفصیل سے

روشنی ڈالی گئی ہے اور مختلف حوالوں سے یہ بتایا گیا ہے کی غیر مسلم معاشرہ میں رہنے والے مسلمانوں کو کس طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان کے تذکرہ کی کیا شکل ہے۔ مثلاً جن ملکوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں ایک سوال بار بار سامنے آتا ہے کہ ان کے اکثریت کے ساتھ کس قسم کے روابط ہونے چاہئیں؟ کیا وہ ان سے الگ تھلگ اور کنارہ کش رہیں گے یا ان سے قریبی تعلقات رکھیں گے۔ یہ تعلقات کسی خالص دائرے میں محدود نوعیت کے ہوں گے یا ان کا دائرہ وسیع ہوگا۔ وہ انہیں حریف اور مخالف سمجھ کر معاملہ کریں گے یا ان کے ساتھ الفت و محبت، ہمدردی اور حسن سلوک کا رویہ ہوگا۔ اسی طرح اور بھی دوسرے مسائل پیش آتے ہیں جیسے کہ سیاسی نوعیت کا یہ مسئلہ ہے کہ تکثیری معاشرہ میں سیاسی سرگرمیوں میں غیروں کے ساتھ شرکت ہوگی یا علیحدہ اپنی کوئی تنظیم ہوگی۔ اس کے علاوہ دینی مسائل بھی پیش آتے ہیں جن کا حل قرآن و سنت میں ڈھونڈھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۴) یہ مقالہ کا اہم اور آخری باب ہے۔ اس میں ”غیر مسلم معاشرہ میں مسلمانوں کی ذمہ داریاں“ کے تحت مسلمانوں کی دینی ذمہ داریوں، سماجی ذمہ داریوں اور اخلاقی ذمہ داریوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک مسلم کو کس طرح غیر مسلم معاشرہ میں دینی ذمہ داریوں کو ادا کرنا چاہیے اور اس سے دین کن کن چیزوں کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ جس معاشرہ میں رہتا ہے اس کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے اس کی کچھ سماجی ذمہ داریاں بھی ہیں جن کو ادا کر کے وہ خود کو ایک بہتر مسلمان ثابت کر سکتا ہے۔ اور چوں کہ نبی کریم ﷺ کی بعثت مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے ہوئی تھی، اس لئے ان کی امت ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کی کچھ اخلاقی ذمہ داریاں بھی ہیں جن کو ادا کر کے وہ نہ صرف اسلام کی سچی تعلیمات لوگوں کے سامنے پیش کر سکتا ہے، بلکہ اس غلط خیال کی تردید بھی کر سکتا ہے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے اور یہ بتا سکتا ہے کہ اسلام کی بنیاد الحاد، بے دینی، خدا بے زاری، فحاشی اور عریانی، بد اخلاقی، جھوٹ اور مکر و فریب پر نہیں ہے، بلکہ حق گوئی، نیکی، تقویٰ اور اعلیٰ و عمدہ اخلاق ہی اسلام کی شناخت اور پہچان ہے۔

مجھے اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ اپنی تساہلی اور کوتاہ علمی کے باعث اس عنوان کا حق ادا نہیں

کر سکا۔

کسی بھی عنوان پر تحقیق کے لئے اس کے مآخذ و مراجع کی طرف رجوع کرنے کے لئے اور اس

کے رموز و نکات کو جاننے کے لئے ایک ماہر نگراں کا ہونا ضروری ہے، کیوں کہ بنیادی طور پر جب ایک طالب علم تحقیق کے میدان میں داخل ہوتا ہے تو وہ اس کے اصول سے ناواقف ہوتا ہے کہ ریسرچ کا معیار کیا ہونا چاہیے اور کن مآخذ و مراجع کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ یہ میرے لئے سعادت اور خوش بختی کی بات ہے کہ مجھے اپنے مقالہ کی تکمیل کے سلسلے میں پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی کی نگرانی میں کام کرنے کا موقع ملا۔ موصوف نے نہ صرف یہ کہ علمی مقالہ نگاری کے بنیادی اصول، تحقیق و مطالعہ اور مآخذ و مراجع کے سلسلے میں رہنمائی کی، بلکہ اس راہ میں حائل تمام مشکلات و دشواریوں کو دور کرنے میں گراں قدر تعاون دیا۔ میں استاذ محترم کے لئے دعا گو ہوں کہ اللہ انہیں جزائے خیر عطا کرے اور دونوں جہاں میں سرخروئی عطا کرے۔ آمین۔

میں اپنے والد محترم جناب سلطان احمد (سابق ایم۔ ایل۔ اے، دربھنگہ) اور والدہ محترمہ کا مشکور ہوں کہ والد محترم ایک سیاسی کارکن ہونے کے باوجود ہمیشہ مجھے اپنے دینی منصب کے تئیں آگاہ کرتے رہے اور کام کی تکمیل کے لئے ابھارتے رہے اور والدہ محترمہ اپنی دعاؤں سے نوازی رہیں۔ اللہ ان دونوں کا سایہ تادیر قائم رکھے اور مجھے ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے کا ذریعہ بنائے۔

اپنی شریک حیات شہناز (شینہ) کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ہر قدم پر اس علمی کام کو مکمل کرنے کے لئے ساتھ دیا۔

اپنے بھائیوں ڈاکٹر حسن اشرف اور حسین اشرف اور بہنوں شہلا کوثر و رضیہ نیز پردیز محسن، نیاز عالم، امیر احمد صاحب و مریم امیر صاحبہ کا شکریہ ادا کرنا اخلاقی فریضہ سمجھتا ہوں، کہ ان سب کے خلوص کا میں قرض دار ہوں۔

مولانا آزاد لائبریری، سمینار لائبریری شعبہ دینیات لائبریری شعبہ اسلامک اسٹڈیز اے ایم یو، خدا بخش لائبریری پٹنہ، رضا لائبریری رام پور، کتب خانہ دارالعلوم دیوبند اور کتب خانہ مدرستہ تعمیر ملت علی گڑھ کے احباب کا بھی مشکور ہوں کہ انہوں نے مطلوبہ علمی مواد کی فراہمی میں اپنا تعاون دیا، خاص طور پر سمینار شعبہ سنی دینیات کے اشتیاق بھائی اور ابرار بھائی کے علمی تعاون کو اپنے لئے احسان عظیم سمجھتا ہوں۔

شعبہ سنی دینیات کے چیرمین ڈاکٹر عبدالخالق صاحب، تمام اساتذہ اور ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی جناب پروفیسر علی محمد نقوی صاحب کا بھی مشکور ہوں کہ ان سب لوگوں نے ہر موقع پر حوصلہ افزائی کی۔ اخلاقی تعاون کے لئے فیکلٹی کے تمام غیر تدریسی کارکن کا شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فریضہ سمجھتا ہوں۔

اخیر میں دعا ہے کہ اللہ رب العزت تمام کوتاہیوں کو درگزر فرمائے اور اس عنوان کے حوالے سے جو باتیں لکھی گئی ہیں نہ صرف وہ علمی طور پر مقبول ہوں بلکہ ہماری عملی زندگی پر بھی اس کے اثرات نمایاں ہوں۔ آمین۔

ندیم اشرف

## باب اول

مسلم معاشرہ کے اجزائے ترکیبی: خصوصیات اور امتیازات

## سماجی و معاشرتی زندگی کی ضرورت

انسان کی زندگی میں اجتماعیت پنہاں ہے۔ یہی مطلب ہے حکما کے اس قول کا کہ انسان مدنی الطبع ہے اور یہی مطلب ہے ماہرین سماجیات کے اس قول کا کہ انسان ایک سماجی جانور ہے۔ اللہ نے انسان کو پیدا کر کے اس کے حوائج و ضروریات کو ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ کر دیا ہے کہ اگر یہ چاہے بھی تو دوسروں سے بے نیاز اور الگ تھلگ رہ کر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ غذا ہی کی احتیاج کو مثلاً لیجیے، صبح و شام جس کی اسے ضرورت رہتی ہے تنہا اس کے حصول کے لیے کتنے لوگوں کی خدمات حاصل کرنا پڑتی ہیں، پہلے کسان اناج بوئے گا، پھر چکی میں پیسے گا، پھر ایک آدمی اسے گوندھے گا اور پکائے، تب کہیں جا کر یہ اس لائق ہوگا کہ وہ انسان کی بھوک مٹا سکے۔

مگر اس سے پہلے کسان کے آلات زراعت بھی تیار کرنے ہوں گے، اس لیے مزارع کے ساتھ بڑھی اور لوہار کا بھی اضافہ ہوگا، تو گویا ایک لقمہ حلق میں اتارنے کے لیے ہمیں اتنے لوگوں کو کام میں لگانا پڑے گا، یہی معاشرتی اور اجتماعی زندگی کی ابتدائی بنیادیں ہیں۔

معاشرتی زندگی کی ضرورت بچاؤ اور دفاع کے نقطہ نظر سے بھی پڑتی ہے۔ حیوانات صحیح معنوں میں انفرادی زندگی بسر کر سکتے ہیں کیوں کہ ان کو خطرات سے بچاؤ کے لیے تلوار اور ڈھال استعمال کرنے کی ضرورت نہیں پیش آتی بلکہ اللہ نے انہیں ایسی کھال بخشی ہے اور سینگ، پنچے اس طرح کے عطا کیے ہیں کہ وہ بخوبی آلات دفاع کا کام لے سکتے ہیں۔

انسان ان چیزوں سے محروم ہے، اس کی ان ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اللہ نے دو چیزیں مرحمت فرمائیں۔ ایک ہاتھ، دوسرے عقل۔ ہاتھ اور عقل کی مدد سے وہ طرح طرح کے آلات اور کل پرزے بناتا ہے جن کے ذریعے وہ دفاع کر سکتا ہے اور ظاہر ہے ان چیزوں کو بنانے اور استعمال میں لانے کے لیے بھی اسے ایک گروہ کی ضرورت پڑتی ہے جو اس کی مدد کرے۔ اس دفاعی ضرورت نے اسے اس



بات پر مجبور کیا کہ وہ مل جل کر رہے۔ اس لحاظ سے اجتماعیت انسانی زندگی کے لیے ضروری ٹھہری ورنہ اس کی تخلیق کا منشا پورا نہیں ہو پاتا۔<sup>۲</sup>

### معاشرہ کی تعریف:

ماہرین سماجیات نے سماج و معاشرہ کی مختلف تعریضیں کی ہیں، مشہور ماہر سماجیات (Maciver) میک آنسور معاشرہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ معاشرہ اقتدار، باہمی ربط کے طریقہ کار کے اس نظام کو کہتے ہیں جو مختلف گروپ کی روایت، عادات و اطوار کو کنٹرول کرتا ہے۔<sup>۳</sup>

گنسبرگ (Ginsberg) کے نزدیک معاشرہ افراد کے ایسے گروہ کا نام ہے جس کے آپس کے تعلقات اور طور طریقے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ یہی چیز انہیں افراد کے دوسرے گروہوں سے ممتاز کرتی ہے جن کے طور طریقے اور آپسی تعلقات ان سے مختلف ہوتے ہیں۔<sup>۴</sup>

### معاشرہ کی خصوصیات:

#### ۱- یکسانیت اور اختلاف:

معاشرہ کے لیے یکسانیت اور اختلاف دونوں کا پایا جانا ضروری ہے تاکہ تعلقات میں مضبوطی اور استحکام پیدا ہو، کیوں کہ سماج کے لوگوں کے مزاج، دلچسپیوں اور صلاحیتوں میں فرق پایا جانا لازمی ہے۔ ہر ایک کو ایک سانچے میں نہیں ڈھالا جاسکتا، بلکہ معاشرہ کے مزاج کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایک دوسرے سے فائدہ اٹھانے کی صورت ممکن ہو اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب بعض چیزوں میں یکسانیت پائی جائے اور بعض چیزوں میں اختلاف ہو۔

#### ۲- ایک دوسرے پر انحصار

معاشرہ کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ سماج و معاشرہ کی تشکیل کے لیے افراد میں ایک دوسرے پر انحصار ہوتا ہے۔ مثلاً خاندان جو ایک بنیادی سماج ہے اس میں مرد اور عورت کا ایک دوسرے پر انحصار ہوتا ہے، بچے کا ماں پر انحصار ہوتا ہے اور جب بچہ بڑا ہو جاتا ہے تو ماں کا انحصار بچے پر ہوتا ہے۔

#### ۳- امداد باہمی

امداد باہمی سماجی زندگی کی اہم خصوصیت ہے۔ اگر ایک دوسرے کی مدد نہیں کریں گے تو سماجی

۱- در مورد ترغیب و تنبیذ، چه می دانید؟

۱۴۰۰

۱۰۸: اے محمدؐ کی سیدہ زینبؓ

۵-۶-۷-۸-۹-۱۰-۱۱-۱۲-۱۳-۱۴-۱۵-۱۶-۱۷-۱۸-۱۹-۲۰-۲۱-۲۲-۲۳-۲۴-۲۵-۲۶-۲۷-۲۸-۲۹-۳۰-۳۱-۳۲-۳۳-۳۴-۳۵-۳۶-۳۷-۳۸-۳۹-۴۰-۴۱-۴۲-۴۳-۴۴-۴۵-۴۶-۴۷-۴۸-۴۹-۵۰-۵۱-۵۲-۵۳-۵۴-۵۵-۵۶-۵۷-۵۸-۵۹-۶۰-۶۱-۶۲-۶۳-۶۴-۶۵-۶۶-۶۷-۶۸-۶۹-۷۰-۷۱-۷۲-۷۳-۷۴-۷۵-۷۶-۷۷-۷۸-۷۹-۸۰-۸۱-۸۲-۸۳-۸۴-۸۵-۸۶-۸۷-۸۸-۸۹-۹۰-۹۱-۹۲-۹۳-۹۴-۹۵-۹۶-۹۷-۹۸-۹۹-۱۰۰-۱۰۱-۱۰۲-۱۰۳-۱۰۴-۱۰۵-۱۰۶-۱۰۷-۱۰۸-۱۰۹-۱۱۰-۱۱۱-۱۱۲-۱۱۳-۱۱۴-۱۱۵-۱۱۶-۱۱۷-۱۱۸-۱۱۹-۱۲۰-۱۲۱-۱۲۲-۱۲۳-۱۲۴-۱۲۵-۱۲۶-۱۲۷-۱۲۸-۱۲۹-۱۳۰-۱۳۱-۱۳۲-۱۳۳-۱۳۴-۱۳۵-۱۳۶-۱۳۷-۱۳۸-۱۳۹-۱۴۰-۱۴۱-۱۴۲-۱۴۳-۱۴۴-۱۴۵-۱۴۶-۱۴۷-۱۴۸-۱۴۹-۱۵۰-۱۵۱-۱۵۲-۱۵۳-۱۵۴-۱۵۵-۱۵۶-۱۵۷-۱۵۸-۱۵۹-۱۶۰-۱۶۱-۱۶۲-۱۶۳-۱۶۴-۱۶۵-۱۶۶-۱۶۷-۱۶۸-۱۶۹-۱۷۰-۱۷۱-۱۷۲-۱۷۳-۱۷۴-۱۷۵-۱۷۶-۱۷۷-۱۷۸-۱۷۹-۱۸۰-۱۸۱-۱۸۲-۱۸۳-۱۸۴-۱۸۵-۱۸۶-۱۸۷-۱۸۸-۱۸۹-۱۹۰-۱۹۱-۱۹۲-۱۹۳-۱۹۴-۱۹۵-۱۹۶-۱۹۷-۱۹۸-۱۹۹-۲۰۰-۲۰۱-۲۰۲-۲۰۳-۲۰۴-۲۰۵-۲۰۶-۲۰۷-۲۰۸-۲۰۹-۲۱۰-۲۱۱-۲۱۲-۲۱۳-۲۱۴-۲۱۵-۲۱۶-۲۱۷-۲۱۸-۲۱۹-۲۲۰-۲۲۱-۲۲۲-۲۲۳-۲۲۴-۲۲۵-۲۲۶-۲۲۷-۲۲۸-۲۲۹-۲۳۰-۲۳۱-۲۳۲-۲۳۳-۲۳۴-۲۳۵-۲۳۶-۲۳۷-۲۳۸-۲۳۹-۲۴۰-۲۴۱-۲۴۲-۲۴۳-۲۴۴-۲۴۵-۲۴۶-۲۴۷-۲۴۸-۲۴۹-۲۵۰-۲۵۱-۲۵۲-۲۵۳-۲۵۴-۲۵۵-۲۵۶-۲۵۷-۲۵۸-۲۵۹-۲۶۰-۲۶۱-۲۶۲-۲۶۳-۲۶۴-۲۶۵-۲۶۶-۲۶۷-۲۶۸-۲۶۹-۲۷۰-۲۷۱-۲۷۲-۲۷۳-۲۷۴-۲۷۵-۲۷۶-۲۷۷-۲۷۸-۲۷۹-۲۸۰-۲۸۱-۲۸۲-۲۸۳-۲۸۴-۲۸۵-۲۸۶-۲۸۷-۲۸۸-۲۸۹-۲۹۰-۲۹۱-۲۹۲-۲۹۳-۲۹۴-۲۹۵-۲۹۶-۲۹۷-۲۹۸-۲۹۹-۳۰۰-۳۰۱-۳۰۲-۳۰۳-۳۰۴-۳۰۵-۳۰۶-۳۰۷-۳۰۸-۳۰۹-۳۱۰-۳۱۱-۳۱۲-۳۱۳-۳۱۴-۳۱۵-۳۱۶-۳۱۷-۳۱۸-۳۱۹-۳۲۰-۳۲۱-۳۲۲-۳۲۳-۳۲۴-۳۲۵-۳۲۶-۳۲۷-۳۲۸-۳۲۹-۳۳۰-۳۳۱-۳۳۲-۳۳۳-۳۳۴-۳۳۵-۳۳۶-۳۳۷-۳۳۸-۳۳۹-۳۴۰-۳۴۱-۳۴۲-۳۴۳-۳۴۴-۳۴۵-۳۴۶-۳۴۷-۳۴۸-۳۴۹-۳۵۰-۳۵۱-۳۵۲-۳۵۳-۳۵۴-۳۵۵-۳۵۶-۳۵۷-۳۵۸-۳۵۹-۳۶۰-۳۶۱-۳۶۲-۳۶۳-۳۶۴-۳۶۵-۳۶۶-۳۶۷-۳۶۸-۳۶۹-۳۷۰-۳۷۱-۳۷۲-۳۷۳-۳۷۴-۳۷۵-۳۷۶-۳۷۷-۳۷۸-۳۷۹-۳۸۰-۳۸۱-۳۸۲-۳۸۳-۳۸۴-۳۸۵-۳۸۶-۳۸۷-۳۸۸-۳۸۹-۳۹۰-۳۹۱-۳۹۲-۳۹۳-۳۹۴-۳۹۵-۳۹۶-۳۹۷-۳۹۸-۳۹۹-۴۰۰-۴۰۱-۴۰۲-۴۰۳-۴۰۴-۴۰۵-۴۰۶-۴۰۷-۴۰۸-۴۰۹-۴۱۰-۴۱۱-۴۱۲-۴۱۳-۴۱۴-۴۱۵-۴۱۶-۴۱۷-۴۱۸-۴۱۹-۴۲۰-۴۲۱-۴۲۲-۴۲۳-۴۲۴-۴۲۵-۴۲۶-۴۲۷-۴۲۸-۴۲۹-۴۳۰-۴۳۱-۴۳۲-۴۳۳-۴۳۴-۴۳۵-۴۳۶-۴۳۷-۴۳۸-۴۳۹-۴۴۰-۴۴۱-۴۴۲-۴۴۳-۴۴۴-۴۴۵-۴۴۶-۴۴۷-۴۴۸-۴۴۹-۴۵۰-۴۵۱-۴۵۲-۴۵۳-۴۵۴-۴۵۵-۴۵۶-۴۵۷-۴۵۸-۴۵۹-۴۶۰-۴۶۱-۴۶۲-۴۶۳-۴۶۴-۴۶۵-۴۶۶-۴۶۷-۴۶۸-۴۶۹-۴۷۰-۴۷۱-۴۷۲-۴۷۳-۴۷۴-۴۷۵-۴۷۶-۴۷۷-۴۷۸-۴۷۹-۴۸۰-۴۸۱-۴۸۲-۴۸۳-۴۸۴-۴۸۵-۴۸۶-۴۸۷-۴۸۸-۴۸۹-۴۹۰-۴۹۱-۴۹۲-۴۹۳-۴۹۴-۴۹۵-۴۹۶-۴۹۷-۴۹۸-۴۹۹-۵۰۰-۵۰۱-۵۰۲-۵۰۳-۵۰۴-۵۰۵-۵۰۶-۵۰۷-۵۰۸-۵۰۹-۵۱۰-۵۱۱-۵۱۲-۵۱۳-۵۱۴-۵۱۵-۵۱۶-۵۱۷-۵۱۸-۵۱۹-۵۲۰-۵۲۱-۵۲۲-۵۲۳-۵۲۴-۵۲۵-۵۲۶-۵۲۷-۵۲۸-۵۲۹-۵۳۰-۵۳۱-۵۳۲-۵۳۳-۵۳۴-۵۳۵-۵۳۶-۵۳۷-۵۳۸-۵۳۹-۵۴۰-۵۴۱-۵۴۲-۵۴۳-۵۴۴-۵۴۵-۵۴۶-۵۴۷-۵۴۸-۵۴۹-۵۵۰-۵۵۱-۵۵۲-۵۵۳-۵۵۴-۵۵۵-۵۵۶-۵۵۷-۵۵۸-۵۵۹-۵۶۰-۵۶۱-۵۶۲-۵۶۳-۵۶۴-۵۶۵-۵۶۶-۵۶۷-۵۶۸-۵۶۹-۵۷۰-۵۷۱-۵۷۲-۵۷۳-۵۷۴-۵۷۵-۵۷۶-۵۷۷-۵۷۸-۵۷۹-۵۸۰-۵۸۱-۵۸۲-۵۸۳-۵۸۴-۵۸۵-۵۸۶-۵۸۷-۵۸۸-۵۸۹-۵۹۰-۵۹۱-۵۹۲-۵۹۳-۵۹۴-۵۹۵-۵۹۶-۵۹۷-۵۹۸-۵۹۹-۶۰۰-۶۰۱-۶۰۲-۶۰۳-۶۰۴-۶۰۵-۶۰۶-۶۰۷-۶۰۸-۶۰۹-۶۱۰-۶۱۱-۶۱۲-۶۱۳-۶۱۴-۶۱۵-۶۱۶-۶۱۷-۶

[illegible]

یہ تہذیبیہ صورتیں ہیں کہ انھوں نے ان کے لیے جو کچھ بنایا ہے اس کے لیے یہ تہذیبیں ہیں کہ انھوں نے ان کے لیے جو کچھ بنایا ہے

ترتیباً منہ سے نکال کر ریاست کی حکومت میں بھیج دیتے ہیں، اور ان کے لیے ریاست کی حکومت میں

[illegible][illegible]

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

۴۰: تہ نہی کی کپڑا

[illegible]

کے

الحمد لله الذي هدانا لهذا الذي كنا لنهتدي لولا أن هدانا الله

ہر شخص کے لئے ایک نیا آغاز ہے اور اس کے اندر مددگار اور ہمدردی کے خزانے ہیں۔

بہارِ نبویؐ سے مستفید ہوں، اور اے نبیؐ، میں نے تجھ کو اپنا پیار کیا ہے، اے اہل بیتؑ

جنت سرخس خرم - ۱۰

۱۔ خدمتِ نبویہ از تہذیب و اسلام

အရှင်ဘုရားတော်ကြီးကတော့ ခုနက ခုနက အရှင်ဘုရားတော်ကြီးကတော့

یہی نہ بھروسہ، نہ ایمان، نہ حقیت ہے کہ یہ جہاں، اے اے کہ، تو اس کے، لے خجائے لے

[illegible]

حاصل اسی ہے کہ وہی جو خیریت کی مدد کرتے ہیں اور خیریت کی خبر دیتے ہیں۔ خیریت کی خبر دینا اور خیریت کی مدد کرنا ایک ہی چیز ہے۔

## ۱- معاشی عوامل

معاشی جدوجہد کے نتیجہ میں مفاد پرستی اور کمزور طبقہ کا استحصال ہوتا ہے اور سماج میں تفرقہ پڑتا ہے۔ مزدور، سرمایہ دار اور حکمران طبقوں میں آپسی کش مکش ہوتی ہے جس کی وجہ سے سماج میں تبدیلیاں آتی ہیں بالخصوص انقلاب آتے ہیں جو سماج کو بدل دیتے ہیں۔

## ۲- آبادی

آبادی میں تبدیلی کا بھی معاشرہ پر اثر پڑتا ہے۔ مثلاً آبادی میں بہت بڑا اضافہ بھی معاشرتی تبدیلی کا باعث ہوتا ہے، کیوں کہ اس کی وجہ سے نئے نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں جیسے کہ وسائل کی قلت اور آبادی کی کثرت بے روزگاری کے اضافہ کا سبب بنتی ہے، جس کے نتیجے میں جرائم اور منہرب اخلاق سرگرمیاں بڑھ جاتی ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب آبادی میں اضافہ انسان کے معیار زندگی پر اثر ڈالتا ہے تو لوگوں کا طرز عمل بدلتا ہے، طور و طریقے اور رسم و رواج بدلتے ہیں۔

## ۳- جغرافیائی حالات

جغرافیائی حالات ایک خاص قسم کا مزاج اور ذہن پیدا کرتے ہیں جو ترقی کی جدوجہد اور سماجی تبدیلی کے لیے زیادہ موزوں ہوتے ہیں۔ مثلاً معتدل آب و ہوا کے علاقے، اس کے برعکس بعض علاقے انسانی جدوجہد کو محدود کرتے ہیں۔ مثلاً قطب شمالی اور جنوبی پر زیادہ سردی کی وجہ سے اور ریگستان میں زیادہ گرمی اور زمین کی ناموزونیت کی وجہ سے آبادی بہت کم ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں سماجی تبدیلی کی رفتار بہت سست ہوتی ہے۔

## ۴- تہذیب و تمدن کا تنوع

جب دو تہذیبیں ملتی ہیں یا ان میں تصادم ہوتا ہے تو بھی سماج میں تبدیلی ہوتی ہے۔ مثلاً انیسویں صدی میں انگریزوں کے تہذیبی اثرات سے ہندوستانی معاشرہ میں تبدیلیاں ہوئیں۔

## ۵- انسانی نفسیات

نفسیاتی پہلو بھی سماجی تبدیلی لانے کا باعث ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ انسان فطری طور پر تبدیلی پسند کرتا ہے اور وہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ نئی نئی چیزیں معلوم کرے تاکہ معاشرہ میں ترقی کرے

اور اس کے پرانے رسم و رواج اور طور طریقوں کی جگہ نئے طور طریقے لے لیں۔ اس طرح برابر سماج میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔

## ۶۔ سائنس اور ٹکنالوجی

تاریخ کے ہر دور میں کچھ نہ کچھ سائنس اور ٹکنالوجی رہی ہے جو سماج میں تبدیلی لانے کا باعث تھی۔ اٹھارویں صدی کے بعد سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کی رفتار بہت تیز ہو گئی اور نئی نئی چیزیں وجود میں آئیں۔ عصر حاضر میں ٹکنالوجی نے صرف مادی وسائل میں اضافہ نہیں کیا بلکہ سماجی زندگی انتہائی پیچیدہ اور مشینی ہوتی جا رہی ہے اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سماجی تبدیلی اور ٹکنالوجی میں بہت گہرا تعلق ہے۔ سماج نئی ٹکنالوجی پیدا کرتا ہے اور نئی ٹکنالوجی سماج میں تبدیلی لاتی ہے۔ ۵۔

## اسلامی معاشرہ

اسلامی نظام معاشرت کی بنیاد خاندان ہے۔ خاندانی نظام دراصل انسانی معاشرت کا حقیقی اور پاکیزہ یونٹ ہے جو نسل انسانی کے بقا اور ارتقا کی ضمانت فراہم کرتا ہے اور انسانی تعلقات کو اعتبار اور استحکام عطا کرتا ہے۔ خاندان اگر بکھر جائے تو اس کا عذاب معاشرہ کو بھگتنا پڑتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے جگہ جگہ پوری بصیرت اور صراحت کے ساتھ خاندانی نظام کے تصور کو واضح کیا ہے، اس کے ترکیبی عناصر کی نشان دہی کی ہے اور اس کے تقاضوں کی تکمیل کی دعوت دی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

”وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيرًا“

(الفرقان: ۵۴)

(وہی ذات ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا، پھر اسے نسبی اور سرالی رشتہ عطا کیا اور

تیرا رب قدرت والا ہے۔)

خاندانی نظام میں میاں بیوی، ماں باپ، اولاد، بھائی بہن اور خونی رشتہ دار تشکیلی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں، چنانچہ قرآن کریم نے ان کے باہمی تعلقات کی فطری اور سماجی حیثیت کو اجاگر کیا ہے اور ان کے حقوق و فرائض کو بھی عدل و حکمت کے ساتھ متعین کیا ہے۔ انسانی جذبات کی بے اعتدالی جب ان رشتوں اور تعلقات میں نا انصافی اور پیچیدگی پیدا کرتی ہے تو قرآن انسانی ذہن کو فطری اعتدال کی طرف بلاتا ہے اور وقتی خواہشات کے مقابلہ میں دائمی قوانین فطرت کی پابندی کا مطالبہ کرتا ہے تاکہ رویوں میں اعتدال پیدا کر کے معاشرہ کو انتشار سے بچایا جاسکے اور اسے شاہ راہ ترقی پر لگایا جاسکے انسانیت کی فلاح خواہشات کی تکمیل میں نہیں بلکہ قوانین فطرت کی تعمیل میں پوشیدہ ہے۔ لہذا رشتوں و ناطوں اور خاندانی تعلقات کے تقاضوں کی تکمیل میں اپنی خواہشات و جذبات کو معیار نہ بنایا جائے، بلکہ قدرت کے مقرر کردہ ضابطوں اور حدود کو معیار بنایا جائے اور اسی کی روشنی میں سماجی ضابطوں اور معاشرتی قدروں کی تشکیل اور تعمیل کی جائے۔ قرآن میں ہے:

”آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيضَةٌ مِّنَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا.“ (النساء: ۱۱)

(تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے تمہیں نہیں معلوم کہ کون تمہارے لئے زیادہ نفع بخش ہیں۔  
اللہ کا مقرر کیا ہوا حصہ ہے، بے شک اللہ علم و حکمت والا ہے۔)

ایک مہذب سماج اور مقدس نظام خاندان میں رشتوں کی پاکیزگی کا احترام اور حقوق و فرائض کی تعمیل کا اہتمام دین و دنیا کی سعادت کا ضامن ہے اور اللہ کی رحمت و برکت کا داعی ہے۔ جہاں رشتوں کا احترام اور حقوق و فرائض کی ادائیگی کا اہتمام نہیں ہوتا وہاں خاندان ٹوٹ جاتا ہے اور معاشرہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ تو گویا اسلامی معاشرہ کا بنیادی عنصر یہ ہے کہ رشتوں کا احترام کیا جائے اور حقوق و فرائض کا اہتمام کیا جائے۔ اسلام کے مقابلے میں اگر مغربی معاشرہ کا جائزہ لیا جائے تو یہ صاف نظر آئے گا کہ اسلام کا معاشرتی نظام پاکیزگی، طہارت، سکون اور اخروی بشارت کا ضامن ہے، جب کہ مغرب کی اباحت پسند اور شہوت پرست تہذیب انتشار، بے چینی بربادی اور آخرت کی نامرادی پر مبنی ہے۔

اسلام کی نظر میں مطلوب اور آئیڈیل وہ خاندان اور معاشرہ ہے جس میں ہر فرد رشتوں ناطوں اور قربتوں میں جڑا ہوا ہو، یہ تعلقات اس کے لئے زنجیر نہ ہوں بلکہ راحت و سکون کا ذریعہ ہوں، جس معاشرہ میں فرد اپنی راحت کا قیدی اور مجرد پسند زندگی کا قیدی نہ ہو، اپنی خواہشات کی تکمیل کی حدود سے واقف اور صحیح راستہ پر گامزن ہو، جس کے لئے اولاد اور ازواج آنکھوں کی ٹھنڈک ہوں، جو نہ صرف اپنے اہل خانہ کی مادی اور سماجی ضرورتوں کو پورا کرتا ہو بلکہ پورے معاشرے کے افراد کے حقوق و فرائض کے تئیں حساس و بیدار ہو، جو اپنی ذمہ داریوں سے فرار نہ اختیار کرتا ہو بلکہ ان کو انجام دے کر روحانی سکون محسوس کرتا ہو۔

انسان ایک تمدنی زندگی کا نام ہے، تہذیب و تمدن سماج کی پہچان اور اس کی روح ہے۔ اگر کوئی شخص سماج و معاشرہ سے کٹ کر الگ ہو جائے تو لوگ اس سے نفرت اور دوری اختیار تو کرتے ہی کرتے ہیں، مگر الگ ہونے والا شخص خواہ کتنی ہی صلاحیتوں کا مالک ہو، بے نام و نشان ہو جاتا ہے۔ وہ انسانی معاشرہ میں گم ہو کر رہ جاتا ہے، اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ معاشرہ لوگوں کے عمل ارتباط اور باہمی ہم آہنگی کی شہادت دیتا ہے۔

مذہب کے بنیادی عناصر خدا، پیغمبر، صحائف، تعلیمات، عمل و عادت اور برگزیدہ بندوں کی مسلسل کوششوں سے زندہ و تابندہ رہتے ہیں۔ لیکن معاشرہ کی بہتری کے لئے اچھے افراد کی ضرورت ہوتی ہے، افراد سازی کے لئے اس مذہب کی تعلیمات اور اس کے احکام مضبوط اور ٹھوس ہونا از حد ضروری ہے، ورنہ مذہب کے پیروکار کا خاتمہ اور اس کی عطا کردہ تہذیب کا اختتام ہو جانا یقینی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں بہت سے مذاہب نے جنم لیا، ہر مذہب نے اپنے متبعین کی تعداد بڑھانے اور اپنے احکامات کو عام کرنے میں کافی جتن کیے، لیکن اس کے باوجود بہت سے مذاہب ناپید ہو گئے، ان کا نام و نشان تک مٹ گیا اور کچھ مذاہب اختتام کی لگاری پر کھڑے ہیں۔ مذاہب کے بے نام و نشان ہونے اور اختتام کی دہلیز پر قدم رکھنے میں کسی غیر کا ہاتھ کم اور خود اس مذہب کی تعلیم اور اس کے پیروکاروں کا ہاتھ زیادہ ہوتا ہے۔ اگر تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات عیاں ہو جائے گی کہ مذہب کو ختم کرنے میں اس کی تعلیمات و احکامات اور اس کے متبعین سب سے آگے ہیں۔

موجودہ دور میں جو مذاہب مثلاً عیسائیت، یہودیت، ہندو ازم، بدھ ازم، پارسی اور اسلام کے ماننے والے پائے جاتے ہیں، اگر آپ ان کے اصلی پیشوا کے طرز عمل کو دیکھیں گے اور ان مذاہب کی تعلیمات و احکامات کا متعصبانہ ذہن سے ماورائی ہو کر جائزہ لیں تو آپ کو مذہب اسلام دنیا کے تمام ادیان سے بے مثال و لا جواب اور ممتاز نظر آئے گا۔ گو تمام مذاہب نے اجتماعیت، اشتراکیت، اتحاد و اتفاق، امن و سلامتی، اخوت و محبت، شفقت و ہمدردی، ایثار و قربانی، خدمت خلق اور حقوق کی ادائیگی پر زور دیا ہے، ظلم و ستم، قتل و غارتگری، فتنہ و فساد، زنا کاری، بدکاری، بد خلقی اور تشدد کے خلاف آواز بلند کی ہے، مگر عملی نمونہ پیش کرنے میں اسلام کے سوا ہر مذہب قاصر ہے۔

اسلام میں انسانیت و روحانیت کا توازن سب سے زیادہ ہے۔ اسلام فرد و معاشرے کی تربیت میں ممتاز ہے، اسلام ایک بامقصد زندگی گزارنے کا شعور بخشتا ہے، دنیا و آخرت کی کامیابی کے لئے ایک معقول اور مستحکم لائحہ عمل پیش کرتا ہے، نیک و بد کی تمیز اور ان کے درمیان ایک حد فاصل کھینچتا ہے، اسلام کی تعلیمات کا سرچشمہ قرآن و حدیث ہے، قرآن و حدیث نے حسن معاشرہ پر کافی زور دیا ہے۔ ہم ذیل میں اسلام کی تعلیمات جو ایک صالح مسلم معاشرہ کی تشکیل کے سلسلے میں ہیں اور اس معاشرہ کے اجزائے ترکیبی پر روشنی ڈالتی ہیں۔ مثلاً ایثار و قربانی، شفقت و محبت، بھائی چارگی و ہمدردی، امن و سلامتی، خدمت خلق اور

لوگوں کے حقوق کی ادائیگی، ان تمام تعلیمات کو قرآن وحدیث کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ جن سے یہ واضح ہوگا کہ اسلامی معاشرہ تمام مذاہب سے ممتاز، اس کی خصوصیات سب سے نمایاں اور موازنے میں دوسرے مذاہب اس کے مقابل تو کیا اس کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتے۔ اسلامی معاشرہ میں سب سے پہلے بات حقوق انسانی کی کی جائے گی جو کہ ایک صالح معاشرہ کی بنیاد ہے۔

**حقوق انسانی کا مفہوم:**

حقوق حق کی جمع ہے، کسی فرد یا جماعت کے لئے ثابت شدہ اور واجب حصہ کو حق کہا جاتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ.“ (الذاریات: ۱۹)

(اور ان کے مالوں میں سوالی اور غیر سوالی کا حصہ تھا۔)

انسان چوں کہ مدنی الطبع واقع ہوا ہے، اس کی فطرت میں مل جل کر رہنے کا جذبہ ہے، وہ اپنی ضروریات کی تکمیل اور آفات ومصائب کے ازالہ کے سلسلے میں دوسرے انسانوں کا محتاج ہوتا ہے، اس لئے ہر انسان کا یہ فطری حق بنتا ہے کہ دوسرا اس کی مدد کرے۔ اسی طرح ہر فرد بشر پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ دوسرے فرد یا مختلف افراد اور طبقوں کے حقوق کی پاس داری کرے۔

انسانی حقوق کا مسئلہ بین الاقوامی سطح پر نہایت اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے دسمبر ۱۹۴۸ء کو بنیادی انسانی حقوق کا ایک منشور پاس کیا ہے، جو تیس دفعات پر مشتمل ہے۔ ۹۹ وقتا فوقتاً اس میں کچھ اضافے بھی کئے جاتے رہے ہیں۔ یہ منشور انسانی حقوق کے تحفظ کے حوالہ سے اگرچہ خاصا ہم ہے، لیکن قرآن وحدیث کی تعلیمات نے انسانی حقوق کا جو منشور چودہ سو سال سے بھی پہلے پیش کیا تھا وہ ہر لحاظ سے ہمہ گیر، مفید ترین اور دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔ نیز نبی رحمت ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جو تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا تھا وہ تاریخ انسانی کی اولین منشور کی حیثیت رکھتا ہے، جس میں انسان کے تمام بنیادی و فطری حقوق کا احاطہ کیا گیا ہے۔

**بنیادی انسانی حقوق:**

بنی نوع انسان کے بنیادی اور فطری حقوق میں جن امور کو شامل کیا جاتا ہے ان میں انسانیت کا احترام، مساوات کا حق، انسان کی جان کی حفاظت، انسانی مال کی حفاظت، انسانی عزت و آبرو کی حفاظت،





سے جزیرۃ العرب امن وامان اور سکون وعافیت کا گہوارہ بن گیا اور سارا عالم آپ کے فیضانِ رحمت سے معمور ہو گیا۔

### اسلام میں انسانی حقوق کا تصور:

اسلام نے بنی نوع انسان کو جو گونا گوں حقوق عطا کئے ہیں ان میں احترامِ انسانیت، بشری نفسیات و رجحانات اور انسان کے معاشرتی، تعلیمی شہری، ثقافتی اور معاشی تقاضوں و ضرورتوں کا مکمل لحاظ کیا گیا ہے۔ اسلام چوں کہ دینِ رحمت ہے، اس لئے اسلام کی تعلیمات میں رحمت کا پہلو نمایاں ہے۔ انسانی حقوق کے سلسلے میں قرآن و حدیث کی تعلیمات میں یہی رحمت و محبت جلوہ گر نظر آتی ہے۔ انسانوں سے جتنی محبت ہوگی ان پر اتنا ہی کرم و رحم ہوگا، ان کے حقوق کی ادائیگی کی اتنی ہی فکر ہوگی اور حقوقِ انسانی کی پامالی سے اجتناب کا جذبہ اتنا ہی بیدار ہوگا، یہی محبت و رافت انسانی حقوق اور اسلامی اخلاق کی بنیاد ہے جو کہ مسلم معاشرہ کے لئے اجزائے ترکیبی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بنی نوع انسان پر اسلام کی رحمت و رافت کا بنیادی مظہر عقیدہ توحید ہے۔ اللہ پر ایمان اور عقیدہ توحید سے انسان میں اپنے عمل کے تئیں احتساب، جواب دہی، خوفِ خدا اور آخرت کی فکر پیدا ہوتی ہے۔ جس سے شریعت کے تمام احکام کی بجا آوری اور اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق کی ادائیگی میں مدد ملتی ہے۔ حقوق کی ادائیگی کو اسلام نے اتنی اہمیت دی ہے کہ اگر کسی شخص نے دنیا میں کسی کا حق ادا نہیں کیا تو آخرت میں اس کو ادا کرنا پڑے گا۔ حتیٰ کہ جانوروں کے آپسی ظلم و ستم کا بھی انتقام لیا جائے گا۔ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”لنودن الحقوق الى اهلها يوم القيامة حتى يقاد للشاة الجلاء من الشاة

القرناء۔“ ۱۰

(حق والوں کو ان کے حقوق تمہیں ضرور قیامت کے دن ادا کرنے پڑیں گے، یہاں تک کہ

بے سینگ والی بکری کو سینگ والی بکری سے بدلہ دلایا جائے گا۔)

اسلام میں حقوقِ انسانی کا جو جامع تصور پیش کیا گیا ہے اس میں انسانیت کا احترام، عام انسانوں پر رحم و کرم، انسانی اخوت و مساوات کی پاسداری، انسانی جانوں کی حفاظت، حق ملکیت کی آزادی، اظہارِ رائے کی آزادی، حصولِ تعلیم کا حق، تنقید و احتجاج کا حق، شہری حقوق کا تحفظ، پیشہ اختیار کرنے کی آزادی

حق ملازمت کا تحفظ، تشکیل حکومت کا حق، ظلم و جبر کے خلاف چارہ جوئی اور کمزور طبقوں کے حقوق کا تحفظ نیز معاشرتی عدل و انصاف کا قیام، اقلیتوں اور دیگر اقوام کے حقوق کی حفاظت اور ان کے ساتھ رواداری وغیرہ امور شامل ہیں۔

### اسلام میں انسانیت کا احترام:

اسلام نے انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا ہے، اس کے احترام و اکرام کی تعلیم دی ہے اور انسان ہونے کے ناطے اس کو پوری کائنات پر فضیلت و برتری عطا کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا.“ (نبی اسرائیل: ۷۰)

(ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی اور خشکی و دریا میں ان کو سوار کیا اور روزی دی ان کو پاکیزہ چیزوں سے اور ہم نے ان کو بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی ہے۔)

اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات میں انسانوں کو سب سے اچھی شکل و صورت عطا فرمائی ہے۔ ارشاد باری ہے:

”لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ.“ (التین: ۴)

(ہم نے انسان کو اچھی شکل و صورت میں پیدا کیا)

انسانیت کو مزید شرف عطا کرتے ہوئے اسلام نے یہ اعلان کیا کہ دنیا کی تمام نعمتیں حق جل شانہ نے انسانوں کے لئے پیدا فرمائی ہیں اور انسانوں کو اپنی عبادت کے لئے پیدا فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا.“ (البقرہ: ۲۹)

(اللہ نے تمہارے نفع کے لئے زمین کی ساری چیزیں پیدا کی ہیں۔)

پھر ایک دوسری جگہ اس کی تخلیق کے مقصد کو بیان کرتے ہوئے کہا گیا:

”وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ.“ (الذاریات: ۵۶)

(میں نے سارے جناتوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا۔)

شاعر مشرق علامہ اقبال نے ان دونوں آیتوں کے مفہوم کو اپنے شعر میں اس طرح ادا کیا ہے:

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسمان کے لئے  
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

اللہ تعالیٰ نے انسانیت کا مقام اتنا بلند کیا ہے کہ انسانوں کو اپنی نیابت کا شرف بخشا اور ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کی عزت و عظمت، مجدد و شرافت کا انکار کرنے اور ان کے سامنے سجدہ تعظیسی ادا نہ کرنے پر ابلیس کو ہمیشہ کے لئے بارگاہِ صمدیت سے ذلیل و خوار کر کے نکالا گیا۔ (البقرہ: ۳۰-۳۴)

اسلام میں انسانی حرمت و شرافت کی کتنی پاس داری ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام نے تعلیم دی ہے کہ انسان کا احترام پس مرگ بھی ضروری ہے اور یہ حکم ہے کہ مردے کو پوری عزت و احترام کے ساتھ غسل دیا جائے، صاف ستھرا کفن پہنا کر خوشبو سے معطر کیا جائے، نماز جنازہ پڑھی جائے، پھر کاندھوں پر اٹھا کر اسے قبرستان لے جایا جائے اور دفن کیا جائے۔

انسان ہونے کے ناطے ہر شخص کا احترام ضروری ہے۔ ایک بار ایک غیر مسلم عورت کا جنازہ گزر رہا تھا، سرکارِ دو عالم ﷺ جنازہ دیکھ کر کھڑے ہو گئے، صحابہ نے عرض کیا یہ تو یہودی عورت کا جنازہ ہے، ارشاد فرمایا کہ موت ایک خوفناک چیز ہے، پس تم جنازہ دیکھ کر کھڑے ہو جایا کرو:

”عن جابر قال مر بنا جنازة فقام لها رسول الله ﷺ وقمنا فقلنا يا رسول الله

انها جنازة يهودى قال فاذا رأيتم الجنازة فقوموا.“

دوسری روایت میں ہے:

”عن عبدالرحمن بن ابی لیلی قال کان سهل بن حنیف و قیس بن سعد قاعدین

بالقادسیة فمر علیها بجنازة فقاما فقیل لهما انها من اهل الارض ای من اهل

الذمة فقالا ان رسول الله ﷺ مرت به جنازة فقام فقیل له انها جنازة يهودى

فقال اليست نفسا.“

زمانہ جاہلیت میں جنگ کے دوران دشمنوں کے ساتھ ہر برا سلوک روا رکھا جاتا تھا، ان کے جسمانی اعضا کاٹ دیئے جاتے تھے، دشمنوں کی کھوپڑیوں میں شراب پی جاتی تھی، سرکارِ دو عالم ﷺ کے محترم چچا حضرت حمزہؓ کے بدن کے بعض اعضا بھی غزوہ احد کے موقع پر دشمنانِ اسلام نے کاٹ لئے تھے۔ اسلام نے انسانی حرمت کو پامال کرنے والے ان کاموں کو سختی سے روک دیا اور مردوں کی ہر طرح کی بے

حرمتی ناجائز قرار پائی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مردہ کی ہڈی کو توڑنا زندہ کی ہڈی توڑنے کے مانند ہے۔

”عن عائشة ان رسول الله ﷺ قال كسر عظم الميت ككسره حيا.“ ۱۳

اسلام میں انسانی عظمت کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اسلامی عقیدہ کے مطابق جتنے انبیاء و رسل دنیا میں انسانوں کی ہدایت کے لئے تشریف لائے وہ سب کے سب انسان تھے۔ یہودی حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت عزیر علیہ السلام کی نسبت یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ان میں سے ہر ایک خدا کے بیٹے ہیں۔ عیسائی عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے، قادر مطلق اور تین ارکان الوہیت میں سے ایک ہیں۔ (التوبہ: ۳۰)

ان عقیدوں سے انسانیت کی توہین لازم آتی ہے کہ انسانیت کا درجہ اتنا کمتر ہے کہ مذکورہ عظیم شخصیات انسانوں میں سے نہیں پائی جاسکتی ہیں، بلکہ یہ مقام بلند ان ہستیوں کے لئے خاص ہے جو حقیقتاً انسان نہ تھے۔ اسلام کے عقیدے کے مطابق انسانیت کا درجہ بلند تر ہوتا ہے، کیوں کہ انسان ہی مذکورہ بالا خوبیوں اور کمالات کا سرچشمہ ثابت ہوتا ہے۔ قرآن میں کئی جگہوں میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ نبی علیہ السلام بشر ہیں۔ لہذا معلوم ہوا کہ اللہ نے انسان کو وہ صلاحیت بخشی ہے جو صفت رسالت سے اپنے آپ کو متصف کر سکے:

”قل انما انا بشر مثلكم.“ (الکہف: ۱۱۰)

(آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہاری طرح ایک انسان ہوں)

انسان کی اشریت اور اس کی افضلیت کی ایک عمدہ دلیل یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو عقل عطا کی جس کے ذریعہ انسان غیر ذوی العقول سے ممتاز ہوتا ہے اور اس کی بدولت وہ ساری کائنات پر حکمرانی کرتا ہے۔ عقل کی اہمیت کے پیش نظر اسلام نے عقل کی حفاظت پر خصوصی توجہ دی ہے کہ عقائد اور اخلاق و اعمال میں اعتدال عقل سلیم ہی سے قائم رہتا ہے اور انسان کے لئے حقوق و فرائض کی انجام دہی میں آسانی ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں جگہ جگہ عقل کے استعمال اور غور و خوض اور تدبر و تفکر کی دعوت دی گئی ہے، تاکہ انسان دلائل نفس و آفاق میں غور و فکر کر کے نظام الہی اور پیام ربانی کی حقانیت کا اعتراف کرے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کا عہد کرے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ.“ (الذاریات: ۲۱)  
 ”إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِأُولِي  
 الْأَلْبَابِ.“ (آل عمران: ۱۹)

”إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ.“ (الروم: ۲۱)

ان آیتوں کے علاوہ بے شمار آیتوں میں تفکر و تدبر کی دعوت دی گئی ہے جو کہ عقل کے بغیر ممکن نہیں  
 اس لئے یہ بات بلا تردد کہی جاسکتی ہے کہ اللہ نے انسان کو جو فضیلت اور اشریت عطا کی ہے اس کی  
 وجوہات میں ایک نمایاں وجہ عقل ہے۔

انسانی اخوت و محبت اور مساوات:

ایک مثالی معاشرہ کے لئے ضروری ہے کہ اس کے افراد کے درمیان آپسی بھائی چارہ اور اخوت  
 و محبت کا رشتہ ہو اور ان کے درمیان کسی قسم کی کوئی تفریق نہ ہو۔ انسان سب برابر ہوں۔ انسانی اخوت کا  
 تصور سب سے پہلے اسلام نے ہی پیش کیا ہے اور ہر طرح کے تفریق و امتیاز اور اونچ نیچ کو مٹانے کا اعلان  
 کیا۔ اسلام کی تعلیم ہے کہ انسان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، بحیثیت انسان ان میں کوئی فرق و  
 امتیاز نہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

”يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا  
 وَبَنَتْ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا.“ (النساء: ۱)

(اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا ہے اور اس سے

اس کی بیوی پیدا کی اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں پیدا کیں۔)

جب تمام انسان ایک ہی نفس سے پیدا کئے گئے تو اس اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں ہوگا بلکہ  
 سب برابر ہوں گے اور ان کے درمیان مساوات رہے گی۔ نیز کائنات کے تمام وسائل سے استفادہ کا حق  
 ہر ایک کو بلا کسی تفریق کے حاصل ہوگا۔ اسلام کی نظر میں تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، ارشاد نبوی ﷺ ہے:

”الخلق عيال الله فاحب الخلق الى الله من احسن الى عياله.“ ۱۴

(مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، اللہ کے نزدیک مخلوق میں سب سے پسندیدہ وہ شخص ہے جو اللہ کے

کنبہ کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہو۔)

اسلام سے پہلے بنی نوع انسان رنگ و نسل، حسب و نسب، بولی زبان، ملک و وطن، مالک و مملوک اور پیشوں کے اعتبار سے مختلف طبقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ یونان، مصر، روم، ہند و ایران اور دیگر ممالک میں بھی انسان کے بعض طبقوں کو اعلیٰ اور بعض کو کمتر و حقیر سمجھا جاتا تھا۔ اسلام نے ان تمام امتیازات کو یک لخت ختم کر دیا۔ اسلام میں انسانی افراد کے حقوق انسان ہونے کے ناطے یکساں قرار پائے۔ ضعیف و نادار، بے یار و مددگار، جاہل و وحشی، غیر مہذب و غیر متمدن، بد اخلاق و بد کردار اور سیاہ فام و بدو کے حقوق انسانیت کا پاس و لحاظ اتنا ہی ضروری ہے جتنا حاکم و سلطان وقت، رئیس و زمین دار، تاجر و صنعت و کار، تعلیم یافتہ و متمدن اور خوب رو و گورے شخص کے حقوق کی حفاظت ضروری ہے۔ قرآن کریم نے انسانی وحدت و مساوات کے تصور کو ذہنوں میں راسخ کرنے کے لئے جگہ جگہ ”یا ایہا الناس“ اور ”یا بنی آدم“ جیسے الفاظ کے ذریعہ تمام افراد انسانی کو اپنی لازوال پیغام کا مخاطب بنایا ہے اور سب کو یکساں طور پر دنیا و آخرت میں صلاح و فلاح کی دعوت دی ہے۔ جن افراد نے اس کی دعوت پر لبیک کہا ان کو ”یا ایہا الذین آمنوا“ سے خطاب کیا گیا۔ انسانوں میں نسلی یا طبقاتی امتیاز اور فرق کو رو انہیں رکھا گیا ہے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر سرکارِ دو عالم ﷺ نے اپنے تاریخی خطبہ میں جن بنیادی انسانی حقوق سے متعلق وصیت و ہدایت فرمائی ان میں انسانی وحدت و مساوات کا معاملہ خصوصی اہمیت کا حاصل ہے۔

فتح مکہ کے موقع پر اہم ترین خطبہ میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا

لا سود علی احمر الا بالتقویٰ ولا فضل للانساب۔“ ۱۵

(کسی عربی کو کسی غیر عربی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ کسی غیر عربی کو عربی پر، نہ کسی گورے کو کالے پر اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر، مگر پرہیزگاری کی بنیاد پر اور حسب و نسب کی بنیاد پر کوئی فضیلت نہیں۔)

محسن انسانیت ﷺ نے صرف اس کا اعلان ہی نہیں فرمایا بلکہ اس اصول کو انسانی زندگی کا دستور العمل بنادیا، ساری زندگی اس پر عمل کر کے دکھایا اور اپنے پیروکاروں کے سامنے ایسا واضح نمونہ قائم فرمایا کہ وہ بھی اس دستور اور اصول کو فراموش نہ کر سکے اور انسانی اخوت و محبت اور وحدت و مساوات کا تصور ان کے اخلاق و اعمال میں ہمیشہ جلوہ گر نظر آیا۔

اسلام کے احکام و اعمال میں بھی مساوات انسانی کا مکمل لحاظ رکھا گیا ہے۔ نماز میں سب لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور ایک ہی حیثیت سے کھڑے ہوتے ہیں، کسی بادشاہ، امیر یا عالم کے لئے کوئی جگہ مخصوص نہیں۔ ع

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود وایاز  
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز  
بندہ و صاحب محتاج و غنی ایک ہوئے  
تیرے دربار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

رمضان کے روزوں میں بھی سب لوگ یکساں طور پر بھوکے رہتے ہیں، روزہ داروں میں بھی امیر و غریب کا کوئی فرق نہیں ہوتا۔ حج میں سب ایک ہی طرح کا لباس پہنتے ہیں اور حج کے اعمال ایک ساتھ ادا کرتے ہیں۔ خود سرکارِ دو عالم ﷺ نے اپنے لئے کسی طرح کا کوئی امتیاز پسند نہیں فرمایا، مجلس میں صحابہ کرام کے ساتھ اس طرح گھل مل بیٹھتے کہ نووارد اور اجنبی شخص آپ کو پہچان نہ پاتا اور پوچھتا من فیکم محمد (تم میں محمد ﷺ کون ہیں؟)

ایک سفر میں صحابہ کرامؓ نے کھانا پکانے کا ارادہ کیا، سب نے ایک ایک کام اپنے ذمہ لے لیا، سرکارِ دو عالم ﷺ نے لکڑیاں لانا اپنے ذمہ لے لیا، صحابہ نے عرض کیا کہ آپ زحمت نہ فرمائیں۔ یہ کام ہم لوگ کر لیں گے۔ فرمایا: یہ سچ ہے، لیکن مجھے نہیں پسند کہ میں اپنے آپ کو تم سے ممتاز کروں، اللہ تعالیٰ اس بندے کو نہیں پسند کرتا جو اپنے ساتھیوں میں ممتاز بنتا ہے۔ ۱۶

جبلہ بن الاسہم شام کا فرماں روا تھا، مسلمان ہو گیا، ایک دفعہ وہ خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا، اس کی چادر کا کونہ ایک شخص کے پاؤں کے نیچے آ گیا، جبلہ نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا، اس نے بھی برابر کا جواب دیا۔ جبلہ کو بڑا غصہ آیا، حضرت عمرؓ سے شکایت کی، حضرت عمرؓ نے فرمایا: جیسا تم نے کیا اس کی سزا پائی۔ اس نے کہا: ہم اس مرتبہ کے لوگ ہیں، جو ہم سے گستاخی کرتا ہے وہ قتل کا مستحق ہوتا ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا: ہاں جاہلیت میں ایسا ہی تھا، لیکن اسلام نے پست کو بالا کر دیا ہے، جبلہ نے کہا کہ اگر اسلام ایسا ہی مذہب ہے تو میں اسلام سے باز آیا اور چھپ کر بھاگ گیا۔ حضرت عمرؓ نے اس کی ذرا پرواہ نہ کی اور انسانی مساوات کے اصول پر سختی سے عمل پیرا رہے۔ ۱۷



انسانی مساوات کی یہ وہ عمدہ مثالیں ہیں جو ایک مسلم اور مثالی معاشرہ کے لئے جزو لاینفک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب تک بلا تفریق مذہب و ملت مساوات کے اصول پر عمل نہیں ہوگا اس وقت تک کہ وہ مثالی معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا، جس کا تصور اسلام نے پیش کیا ہے۔

عام انسانوں پر رحم و کرم:

اسلام دین رحمت و رافت ہے، بلا تفریق قوم و مذہب تمام انسانوں پر رحم و کرم کے لئے اپنے پیروکاروں کو آمادہ کرنا اور اس کے لئے ماحول سازگار کرنا نیز معاشرہ کی تشکیل کرنا اسی جذبہ رحمت و رافت کی بنیاد پر اسلام کی خصوصیات میں داخل ہے۔ اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب یا تہذیب میں انسانیت نوازی اور انسانوں پر رحم و کرم کا وہ تصور نہیں ملتا جو اسلام نے پیش کیا ہے، محسن انسانیت ﷺ فرماتے ہیں:

”الراحمون یرحمهم الرحمن، ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی

السماء.“ ۱۸

دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا:

”من لم یرحم الناس لایرحمہ اللہ.“ ۱۹

عام انسانوں کے ساتھ ہمدردی، ان کی خدمت، ان کی حاجت روائی، دکھ درد میں ان کی دست گیری اور امداد سے اللہ تعالیٰ بے حد خوش ہوتے ہیں۔ اسلام میں تو انسانوں کی خدمت کو اللہ تعالیٰ کی خدمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس میں مذہب و ملت کی کوئی تخصیص نہیں، مسلم و غیر مسلم سب برابر ہیں۔ حدیث قدسی ہے:

”اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا: اے ابن آدم! میں بیمار ہوا تم نے میری عیادت نہیں

کی، وہ حیرت سے جواب دے گا پروردگار عالم میں کیسے تیری عیادت کرتا؟ تو تو ساری دنیا کا

پالنہ ہار ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تجھے یہ علم نہیں تھا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہے، تو نے اس

کی عیادت اور مزاج پرسی نہیں کی، کیا تمہیں اس کی خبر نہ تھی؟ کہ اگر تم اس کی عیادت کو جاتے

تو مجھے وہاں پاتے۔ اے ابن آدم! میں نے تم سے کھانا مانگا، لیکن تم نے کھانا نہ دیا، بندہ کہے

گا، اے میرے پروردگار! میں آپ کو کھانا کیسے کھلاتا؟ آپ تو سارے جہاں کے پالنہ ہار

ہیں، اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تجھ سے میرے فلاں بندے نے کھانا مانگا، تو نے اسے کھانا نہ

دیا، یہ علم نہ تھا کہ اگر تو میرے اس بندے کو کھانا کھلاتا تو مجھے بھی وہاں پاتا؟ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی طلب کیا، تو نے پانی نہ پلایا۔ بندہ کہے گا میں آپ کو پانی کس طرح پلاتا، جب کہ آپ رب العالمین ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تجھ سے میرے فلاں بندے نے پانی مانگا تو تو نے اسے پانی نہ پلایا، اگر تو نے اس کو پانی پلایا ہوتا تو اس کا بدلہ میرے پاس ضرور پاتا۔ ۲۰

انسانوں پر رحم و کرم کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

”من لا یرحم لا یرحم۔“ ۲۱

(جو رحم نہیں کرے گا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا۔)

ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا:

”عن انس بن مالک عن النبی ﷺ قال ما من مسلم غرس غرسا فاکل منه

انسان او دابة الا كان له به صدقة۔“ ۲۲

(جو مسلمان کوئی درخت لگائے گا، اس سے جو انسان یا جانور کھائے گا اس کا ثواب درخت

لگانے والے کو ملے گا۔)

قرآن کریم نے تمام مخلوق کے ساتھ احسان کرنے کی تاکید کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”أَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ۔“ (القصص: ۸)

(تم دوسروں کے ساتھ احسان اور بھلائی کرو جیسا کہ اللہ تمہارے ساتھ کرتا ہے۔)

ان تمام احادیث و آیات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرہ اور سوسائٹی میں مذہب اور قوم

کے امتیاز کے بغیر ہر ایک شخص کے ساتھ لطف و کرم اور احسان کا معاملہ ہوگا اور یہی وصف اپنی عمدگی کی بنیاد

پر اس معاشرہ کی شناخت اور پہچان بنے گا۔

انسانی جان کی حفاظت:

اسلام سے پہلے انسانی جان کا کوئی احترام نہ تھا، قتل و خوں ریزی عام تھی، ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کا

دشمن تھا، امن و امان ناپید تھا، انسانی رشتوں کا پاس و لحاظ نہیں رہا تھا، اسلام نے تشدد پسندی اور دہشت

گردی کے خلاف اعلان جنگ کیا اور انسانی جان کی عظمت و حفاظت کا حکم دیا، امیر ہوں یا غریب، سلطان

ہوں یا گدا، مرد ہوں یا عورت، متمدن ہوں یا غیر متمدن، تعلیم یافتہ ہوں یا ناخواندہ، بڑے خاندان کے ہوں یا چھوٹے خاندان کے، مسلمان ہوں یا غیر مسلم، تمام لوگوں کی جانوں کی حفاظت کو ضروری قرار دیا گیا اور اس سلسلہ میں کسی امتیاز یا تفریق کو روا نہیں رکھا گیا۔ اسلام نے انسانی جان کو حرمت و عظمت عطا کی، اس کی بے حرمتی کی سختی سے ممانعت کی اور قتل و خون ریزی کا ترغیب و ترہیب کے ذریعہ سد باب کیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ.“ (بنی اسرائیل)

(جس شخص کے قتل کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، اس کو قتل نہ کرو، مگر حق شرعی کے ساتھ۔)

اسلام نے ایک انسان کے ناحق قتل کو پوری انسانیت کے قتل کے مساوی قرار دیا ہے:

”مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا.“ (المائدہ: ۳۲)

(جو شخص کسی ایسی جان کو قتل کرے جس نے کسی کو قتل نہ کیا ہو اور نہ اس نے زمین پر فساد برپا کیا ہو، تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر ڈالا اور جو کسی انسانی زندگی کی بقا کا سبب بنا تو اس نے تمام انسانوں کو زندگی بخشی۔)

کیوں کہ اصل چیز انسان کی حرمت ہے، جب انسانی زندگی کا احترام ہی دل سے اٹھ جائے گا تو ایک شخص کا قتل کیا؟ پوری جماعت کے قتل میں کوئی دریغ محسوس نہیں ہوگا۔ ظلم و تعدی کرنے والوں کے لئے دونوں برابر ہوں گے۔

انسانی جان کے احترام اور ان کی بے حرمتی سے اجتناب کا حکم تمام انسانوں سے متعلق ہے، مسلم اور غیر مسلم و پرانے کا فرق نہیں رکھا گیا ہے۔ کسی بے قصور شخص کا قتل تو برا ہی ہے، جو شخص کسی کو ناحق قتل کرنے کے لئے دوسرے شخص کو استعمال کرتا ہے، اسلام کی نظر میں قتل پر اکسانے والے کا گناہ اصل قاتل سے زیادہ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا:

”جہنم کی آگ ستر حصوں میں بانٹ دی گئی ہے، ان میں سے انہتر حصے اس شخص کے لئے

ہوں گے جو قتل کا حکم دیتا ہے اور ایک حصہ اس شخص کے لئے جو دوسروں کے کہنے پر قتل

کرے۔“ ۲۳

ایک دوسری حدیث میں فرمایا گیا:



اس آیت کریمہ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ جس قاتل کو مقتول کے ولی کی طرف سے معافی مل جائے اور قاتل کے اوپر دیت لازم کی جائے تو ایسی صورت میں مقتول کے ولی دیت کا تقاضہ کرنے میں نیک روش اختیار کریں اور قاتل خوں بہا خوش معاملگی کے ساتھ ادا کر دے۔

قصاص کے مذکورہ بالا حکم پر عمل آوری سے ناحق قتل کی واردات میں حیرت انگیز حد تک کمی آتی ہے۔ چوری کی سزا بھی نافذ کی جاتی ہے اور دیگر حدود شرعیہ کا بھی نفاذ ہوتا ہے، وہاں قتل و غارت گری، لوٹ مار اور چوری کے واقعات شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں، پورے سال چند ہی گنے چنے جرائم پیشہ افراد کا سر قلم ہوتا ہے، یا دیگر سزائیں دی جاتی ہیں۔ لیکن دیگر ممالک بشمول امریکہ، افریقہ اور یورپ میں چند گھنٹوں میں اتنے بے قصور قتل کے گھاٹ اتار دئے جاتے ہیں، جتنے اسلامی قوانین نافذ کرنے والے ممالک میں سال بھر میں قتل نہیں کئے جاتے۔ اسی لئے قرآن کریم میں بجا طور پر فرمایا:

”وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ.“ (البقرہ: ۱۷۹)

(تمہارے لئے قصاص میں بڑی زندگی ہے۔)

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اسلام نے ظالم کے خلاف کارروائی کی اجازت اس حد تک دی ہے کہ اس کے ظلم کے برابر اس سے انتقام لیا جاسکتا ہے۔ نہ تو ظالم کے ظلم سے زیادہ بدلہ لینے کی اجازت ہے اور نہ ہی ظالم کے علاوہ کسی اور پر کسی طرح کی جوابی و انتقامی کارروائی کی۔ اسلام اس کی اجازت بالکل نہیں دیتا ہے کہ کسی اور پر کسی ایک فرد کی ظالمانہ اور تشدد پسندانہ کارروائی کے انتقام کے طور پر اس کے خاندان یا مذہب کے دیگر لوگوں کے ساتھ جبر و تشدد کیا جائے۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے:

”جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا.“ (الشوریٰ: ۴۰)

اسلام کی نظر میں انسانی جانوں کی حفاظت کے حوالے سے مسلمان اور غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں، اسلام میں ایک مسلم کی جان کی حفاظت جتنی ضروری ہے، اتنی ہی ضروری ایک غیر مسلم رعایا کی جانوں کی حفاظت بھی ہے۔ رحمت دو عالم ﷺ کے عہد مبارک میں ایک مسلمان نے ایک ذمی اہل کتاب کو قتل کر دیا تھا، رسول اکرم ﷺ کے سامنے معاملہ پیش ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: مجھ پر ذمی کے عہد کو پورا کرنے کی زیادہ ذمہ داری ہے۔ لہذا آپ ﷺ نے مسلمان کو قصاص میں قتل کر دیا۔ بعض روایتوں میں مسلمان کے ذریعہ ذمی کو قتل کر دینے پر سرکار دو عالم ﷺ کے خون بہا ادا کرنے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ۲۵

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد گرامی ہے:

”مَنْ كَانَ ذِمَّتُهُ مَدْمَةً كَدِمْنَا وَدَيْتُهُ كَدَيْتْنَا.“ ۲۶

(جس (غیر مسلم) کی ذمہ داری ہم پر ہے اس کا خون ہمارے خون کی طرح ہے اور اس کی دیت ہماری دیت کی طرح ہے۔)

اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب اس طرح کے غیر جانب دارانہ طرز عمل اور رعایا کے ساتھ حسن سلوک اور عدل و انصاف کی مثالیں نہیں پیش کر سکتے۔ اسلام یہ بتاتا ہے کہ جب تم اسلامی معاشرہ میں بود و باش اختیار کرتے ہو تو تمہیں بھی وہی حقوق دیئے جائیں گے، جو کہ ایک مسلمان کو دیے جاتے ہیں اور تمہارے خون کی بھی وہی قدر و قیمت ہوگی جو کہ ایک مسلمان کی ہوتی ہے، بشرطیکہ تم تخریب کاری میں ملوث نہ ہو اور شرعی طور پر جو پابندیاں ہیں ان کی رعایت کرتے رہو۔

انسانی جانوں کی حرمت اور ان کی حفاظت اسلام نے اس حد تک کی ہے کہ پیدا ہونے سے پہلے بطن مادر میں رہنے والے بچہ کو ضائع کرنے یا پیدا ہونے کے بعد قتل کرنے کو سختی کے ساتھ روکا گیا ہے۔ اسلام کی ہدایت ہے:

”لَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِفْلَاقٍ.“ (بنی اسرائیل: ۳۱)

(تنگ دستی کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔)

شریعت اسلامیہ نے خودکشی کو بھی سختی سے منع کیا ہے، اس کی اجازت قطعی نہیں ہے کہ کوئی گھناؤنے عمل کے ذریعہ اپنے آپ کو ہلاک کرنے کا اقدام کرے۔ خودکشی کرنے پر سخت وعید آئی ہے اور آخرت میں بھی ایسے شخص کے لئے سخت عذاب مقرر کیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

”وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا. وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ غَدَوَانًا وظُلْمًا

فَسَوْفَ نُصَلِّيهِ نَارًا.“ (النساء: ۲۹-۳۰)

(اور تم اپنے آپ کو قتل مت کرو، بلاشبہ اللہ تم پر مہربان ہے اور جو شخص ظلم و جور سے ایسا کرے گا تو ہم اسے ضرور آگ میں ڈالیں گے۔)

اس آیت میں تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس میں خودکشی بھی داخل ہے۔

ایک دوسری آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

”وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ.“ (البقرہ: ۱۹۵)

(اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں سے ہلاکت میں مت ڈالو۔)

اس آیت کو مفسرین نے عام معنی پر محمول کیا ہے، یعنی وہ تمام اختیاری صورتیں ناجائز ہیں جو تباہی، بربادی اور ہلاکت کی طرف پہنچانے والی ہوں۔ فضول خرچی، ہتھیار کے بغیر میدان جہاد میں کود پڑنا، دریا میں ڈوب کر، آگ لگا کر، زہر کھا کر، چاقو مار کر یا دوسرے طریقوں سے خود کو ہلاک کرنا یعنی خودکشی کرنا، جن علاقوں میں وبائی امراض پھیل رہے ہوں وہاں جانا وغیرہ۔

قرآن کریم میں خود کو ہلاک کرنے کی قطعی طور پر ممانعت ہے، جیسا کہ اوپر ذکر کردہ دونوں آیتوں سے معلوم ہوا۔ احادیث میں بھی خودکشی کی حرمت مذکور ہے۔ جیسا کہ بخاری کی روایت ہے کہ ایک شخص نے جنگ میں بڑی دلیری کا ثبوت پیش کیا، لیکن اس نے زخموں کی شدت سے بے چین ہو کر خود اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو ہلاک کر لیا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کبھی کبھی فاجر شخص کے ذریعہ دین کو تقویت عطا کرتا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا: لا یدخل الجنة الا نفس مسلمة۔ ۱۷

ان تمام تر تفصیلات کا حاصل یہ ہے کہ اسلام میں انسانی جان کی قدر و قیمت ہے، جتنے بھی ذرائع انسانی جان کو نقصان پہنچانے اور ضائع کرنے کے ہو سکتے ہیں وہ سب کے سب ممنوع ہیں، اور کسی بھی شخص کو نہ اپنی جان کو ہلاک کرنے کا حق ہے اور نہ دوسروں کی جان لینے کا حق حاصل ہے۔

**ملکیت و تصرف کا حق اور مال کی حفاظت:**

انسانی زندگی میں مال و دولت، اس کی معاشرتی ضرورت ہے، جس کے بغیر زندگی کی گاڑی رفتار نہیں پکڑ سکتی۔ تاہم اسلام نے اس سلسلے میں اعتدال کی راہ اختیار کرنے کی ہدایت دی تاکہ مال و زر انسان کے معاشرتی ضرورتوں کو پورا کرنے کے بجائے اس کے عیش پسندی اور مقصد حیات سے دوری کا ذریعہ نہ بن جائے۔ مال انسانی زندگی میں سکون وطمینان اور راحت و آرام کا باعث ہوتا ہے اور اس کے بغیر انسان کی دنیاوی زندگی اجیرن بن جاتی ہے۔ قرآن کریم میں مال کو دنیاوی زندگی کی رونق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

”الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا.“ (الکہف: ۴۶)

(مال و دولت اور اولاد دنیاوی زندگی کی رونق ہیں۔)

حضرت مقدم بن معدی کرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اکرم ﷺ سے سنا،

آپؐ فرماتے تھے کہ: لوگوں کے لئے ایک وقت ایسا آئے گا جب روپیہ پیسہ ہی کام آئے گا۔ ۲۸

مال و دولت سے چوں کہ انسان کو بے حد محبت ہوتی ہے، اس لئے اس سلسلہ میں بطور خاص رہ نمائی کی گئی ہے۔ کیوں کہ مال و دولت کی وجہ سے بے اعتدالی کا پیدا ہونا معاشرہ میں بے اعتدالی اور بے اطمینانی کا سبب ہوتا ہے۔ اسلام نے ہر شخص کو مالک ہونے اور اپنی مملوکہ چیزوں میں تصرف کا اختیار دیا ہے۔ یہ حق مردوں کو بھی ہے اور عورتوں کو بھی۔ وہ ملکیت کے صحیح ذرائع استعمال کر کے مال کے مالک ہو سکتے ہیں۔ ان کے تمام مملوکہ اموال کی حفاظت ضروری ہے، چاہے وہ مسلمان ہوں یا کسی اور مذہب کے پیروکار ہوں۔ ارشادِ ربانی ہے:

”لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ.“ (النساء: ۳۲)

(مردوں کے لئے حصہ ہے اس میں جو وہ کمائیں اور عورتوں کے لئے حصہ اس میں جو وہ کمائیں۔)

مال کا مالک ہونے کے بعد اس کو تجارت اور خرید و فروخت کے ذریعہ بڑھانے اور نفع حاصل کرنے کا حق بھی سبھی کو دیا گیا ہے۔ مالی لین دین کے سلسلے میں جو احکام اسلام نے دیئے ہیں، ان کی بنیاد چار اصولوں پر ہے۔ ایک خلقِ خدا کی نفع رسانی، دوسرے عدل، تیسرے سچائی و دیانت داری اور چوتھے فریقین میں ہر ایک کی دوسرے فریق کے ساتھ رعایت۔ ۲۹

اسلام کی نظر میں مال کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ اس نے بطور نائب انسان کو حق ملکیت عطا کیا ہے۔ مال اس کے پاس بطور امانت ہوتا ہے جو اللہ کی مرضی اور اس کے حکم کے مطابق کمانا اور صرف کرنا ضروری ہوتا ہے۔ انسان کو یہ ہدایت ہے کہ وہ اپنے مال میں سے اللہ کو خوش کرنے کے لئے غریبوں اور ناداروں پر بھی خرچ کرے۔ ارشادِ ربانی ہے:

”وَأَتَوْهُمْ مِّن مَّالِ اللَّهِ الَّذِي آتَاكُمْ.“ (النور: ۳۳)

(اللہ نے جو مال تم کو دیا ہے اس میں سے ان کو دو۔)

دوسری آیت کریمہ میں ارشاد ہے:

”وَأَنْفَقُوا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُسْتَخْلِفِينَ فِيهِ.“ (الحديد: ۷)

(اس مال میں سے خرچ کرو جس میں اللہ نے تم کو نائب مقرر کیا ہے۔)

مال دوسروں پر خرچ کرنے کی یہ حکمت بیان کی گئی ہے کہ اس سے مال صرف چند لوگوں تک محدود



نہیں رہتا:

”کٰی لَا یُکُوْنُ دُوْلَةٌ بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ.“ (الحشر: ۷)

(تاکہ تم میں جو مال دار ہیں مال ان کے قبضے میں ہی نہ رہ جائے۔)

ذخیرہ اندوزی کر کے مصنوعی قلت پیدا کرنا اور سامان گراں قیمت پر فروخت کرنے سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔ تمام مالی معاملات میں فریقین کی باہمی رضا مندی کو بڑی اہمیت دی گئی ہے اور ایسے تمام معاملات اور لین دین کی اجازت نہیں دی گئی ہے جو باہمی رضا مندی سے نہ ہوں۔ ملکیت صرف انہیں ذرائع سے حاصل کرنے کا حکم ہے جو جائز ہے۔ جس طرح جان کی حفاظت کی بڑی اہمیت ہے اسی طرح مال کی حفاظت پر بھی زور دیا گیا ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمایا:

”بے شک تمہارا خون، تمہارا مال اور تمہاری عزتیں تم پر ایسی محترم ہیں جس طرح آج کا

یہ دن، یہ مہینہ اور یہ شہر بے حد محترم ہے۔“ ۳۱

مال کی حفاظت کرتے ہوئے اگر کوئی مارا جائے، اسے شہید کا درجہ دیا گیا ہے:

”مَنْ قَتَلَ دُونَ مَالٍ فَهُوَ شَهِید.“ ۳۲

اسلام ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے جہاں جان کی حفاظت کے ساتھ اموال کی بھی حفاظت پر بھی زور دیا گیا ہے۔ اسلامی شریعت میں اس مسئلہ میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ ایک امن پسند غیر مسلم اور ایک مسلم کا درجہ تعزیری قوانین میں یکساں ہے، ایک غیر مسلم کا مال ایک مسلمان چرائے یا اس کے برعکس ہو تو ان دونوں صورتوں میں چور کو قانون اسلام کے مطابق سزا دی جائے گی۔ ۳۲ دارالاسلام میں سکونت پذیر ذمیوں کے مال و متاع اور املاک کی حفاظت بڑے اہتمام کے ساتھ کی جاتی ہے۔ حضرت ابو عبیدہؓ فاتح شام کو لکھا کہ:

”مسلمانوں کو ذمیوں پر ظلم کرنے، ان کو نقصان پہنچانے اور ان کا مال ناجائز طور پر کھانے

سے روکو اور جو شرطیں تم نے ان سے کی ہیں سب کو پورا کرو۔“ ۳۳

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

”ان غیر مسلموں نے اپنے آپ کو ہماری ذمہ داری میں اس لئے دیا ہے تاکہ ان کی جان اور

ان کا مال ہم مسلمانوں کی جان اور مال کے برابر ہو جائے۔“ ۳۴

اسلامی قوانین کی نظر میں ہر امن پسند شہری کے اموال و املاک کی ایک ہی حیثیت ہے جو درجہ ایک مسلمان کے سامان کا ہے، وہی ایک غیر مسلم کے مال و اسباب کا ہے۔ اسلام نے ہر اس کاروائی کو ناجائز قرار دیا ہے جس سے امن و امان کو خطرہ لاحق ہو اور کسی شخص کی جان یا مال کو نقصان پہنچے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ.“ (البقرہ: ۱۸۸)

(نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا ناحق اور نہ پہنچاؤ ان کو حاکموں کے پاس کہ کھا جاؤ کوئی حصہ لوگوں کے مال میں سے ظلم کر کے۔)

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا. وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ غَدَوَانًا وظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيهِ نَارًا.“ (النساء: ۲۹-۳۰)

(نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا ناحق مگر یہ تجارت ہو باہمی رضا مندی سے اور نہ خون کرو آپس میں، بے شک اللہ تعالیٰ بڑا مہربان ہے اور جو کوئی یہ کام کرے زیادتی اور ظلم سے تو ہم اس کو ڈالیں جہنم کی آگ میں۔)

یہی وجہ ہے کہ کاروبار میں امانت و دیانت اور سچائی کی تاکید کی گئی ہے اور دھوکہ دہی سے منع کیا

گیا ہے۔ ارشاد نبوی ہے: ”من غش فليس منا.“ ۳۵

غیر سودی کاروبار کرنے کی بھی ممانعت کی گئی ہے، کیوں کہ اس میں ایک شخص کو مجبوراً اپنی مرضی کے خلاف زیادہ رقم کی ادائیگی کرنی پڑتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

”واحل الله البيع وحرم الربوا.“ (البقرہ: ۲۷۵)

جس طرح روزگار کے وہ سب طریقے ممنوع ہیں جو دوسروں کو مالی طور پر نقصان پہنچاتے ہوں، اسی طرح وہ ذرائع بھی ممنوع ہیں جن سے لوگوں کو دینی یا اخلاقی نقصان پہنچتا ہو۔ نشلی چیزوں کو، تصویروں کو، رقص و سرور کو اور اسی طرح کی دوسری مخرّب اخلاق چیزوں کو مال کمانے کا ذریعہ نہیں بنایا جاسکتا۔ لیکن دین کا کوئی ایسا معاملہ جو دھوکے کی نوعیت کا ہو اور اس وجہ سے فریقین کے درمیان اختلاف کھڑا ہو سکتا ہو،

درست نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”ان النبی ﷺ نہی عن بیع الغرر۔“ ۳۶

مال کمانے کی آزادی اگرچہ تمام افراد کو یکساں طور پر حاصل ہے، تاہم جسمانی طور پر تمام افراد یکساں نہیں ہوتے۔ اس لئے معاشی جدوجہد کے نتائج بھی برابر نہیں ہوتے۔ چنانچہ یہ بات مشاہدہ میں نظر آتی ہے کہ معاشرہ میں کچھ افراد کروڑ پتی ہیں تو کچھ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جن کو دو وقت کی روٹی بڑی مشکل سے میسر ہوتی ہے۔ اس لئے اسلام پورا زور دے کر کہتا ہے کہ معاشی جدوجہد میں ناکام رہنے والے افراد کی ضرورتیں وہ لوگ پوری کریں جو اس جدوجہد میں کامیاب ہیں۔ قرآن کریم میں اہل ایمان کی صفات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے:

”وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ۔“ (الذاریات: ۱۹)

جس پر کسی کا حق ہے وہ اس کو ادا کرنے کی کوشش کرے اور جس کا کسی دوسرے پر حق ہے وہ اس کے وصول کرنے میں فراخ دلی، نرمی اور فیاضی سے کام لے اور سخت رویہ اختیار نہ کرے۔ اللہ ارشاد فرماتا ہے:

”وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ

تَعْلَمُونَ۔“ (البقرہ: ۲۸۰)

(اور اگر قرض دار تنگی والا ہے تو اسے مہلت دو آسانی تک اور قرض اس پر بالکل چھوڑ دینا تمہارے لئے اور بھلا ہے اگر جانو)

الغرض اسلام نے ہر شخص کو انفرادی و شخصی ملکیت اور اپنے املاک میں تصرف کرنے کا پورا پورا حق دیا ہے اور ہر شخص کے مال کی حفاظت کے لئے واضح اصول بیان فرمائے ہیں جو قرآن و حدیث اور فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔

انسانی عزت و ناموس کا تحفظ:

انسان کی عزت و آبرو کی حفاظت کو اسلام نے بڑی اہمیت دی ہے اور اسے بنیادی انسانی حقوق میں شامل کیا ہے اور معاشرہ میں صلح و امن کے لئے اس کی حفاظت کو لازم قرار دیا ہے۔ ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے عزت نفس اور خودداری عطا کی ہے خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، گورا ہو یا کالا، عربی ہو یا عجمی، یا کسی بھی

رنگ و نسل، ملک و وطن اور برادری سے تعلق رکھتا ہو، جب اس کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچتی ہے تو انسان سخت اذیت محسوس کرتا ہے۔ انسانی عزت و ناموس کی حفاظت کی خاطر ہی اسلام نے انسانی مساوات کی تعلیم دی ہے۔ انسانوں میں ان کی خصوصیات یا کمالات اور تدین و تقویٰ کے اعتبار سے تو فرق مراتب ہو سکتا ہے، لیکن بحیثیت انسان تمام افراد بشر میں وحدت مساوات ہے، اسلام سے پہلے مختلف تہذیبوں میں نہ انسانوں میں مساوات تھی اور نہ ہی ان کی عزت و آبرو محفوظ تھی۔ ہندوستانی معاشرہ بھی درج ذیل طبقوں میں بٹا ہوا تھا:

(۱) مذہبی نمائندے اور اعلیٰ مذاہب کے لوگ یعنی 'برہمن'

(۲) فوجی اور سپاہی یعنی 'چھتری'

(۳) تجارت اور زراعت کرنے والے یعنی 'ویش'

(۴) خدمت گار یعنی 'شودر'

منوسمرتی قوانین میں برہمن کو مرکزی مقام حاصل تھا۔ وہ بہر حال نجات یافتہ سمجھا جاتا تھا چاہے گناہوں کے دل دل میں پھنسا ہوا ہو۔ شودر سب سے زیادہ قابل رحم تھے۔ ان کا کام صرف برہمن، چھتریوں اور ویشوں کی خدمت کرنا ہوتا تھا، حکم تھا کہ دس برس کا برہمن اور سو برس کا چھتری دونوں آپس میں باپ بیٹے کی طرح ہیں، برہمن لڑکا باپ اور چھتری بیٹے کی طرح رہیں اور اگر چھتری ویش اور شودر میں کوئی غصہ کر کے ایک تنکے سے بھی برہمن کو مارے تو اکیس جنم تک پاپی یعنی کتا، گدھا وغیرہ کے جسم میں پیدا ہوگا۔ ۳۷

ایران کے سلاطین اس بات کے مدعی تھے کہ ان کی رگوں میں خدائی خون ہے۔ اہل ایران بھی انہیں اسی نظر سے دیکھتے تھے کہ گویا وہ خدا ہیں۔ اونچ نیچ کا فرق، طبقوں کا تفاوت اور پیشوں کی تقسیم، ایرانی سوسائٹی اور نظام زندگی کا اٹل قانون تھا جس میں رد و بدل ممکن نہ تھا۔ ۳۸

اسپین میں کسی طرح کے سیاسی حقوق یا ایسے حقوق جو ایک آزاد شخص کو کسی حکومت میں حاصل ہوتے ہیں، ان سے اسپین کی رعایا محروم تھی۔ ۳۹

ان حالات میں اسلام نے جو تعلیمات پیش کی ہیں ان میں انسانوں کو وہ تمام حقوق دیئے گئے ہیں جو بنیادی انسانی حقوق ہیں، جن میں انسانی مساوات اور انسان کی عزت و ناموس کی حفاظت کا بھی حق

ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر ایام تشریق کے وسط میں جو تاریخی خطبہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا اس میں انسانی عزت و آبرو کی حفاظت و حرمت کی تاکید کی گئی ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”تمہارا خون اور تمہاری عزت اسی طرح قیامت تک حرام ہیں جس طرح یہ دن، یہ مہینہ (ذی الحجہ) یہ شہر (مکہ مکرمہ)۔“

اسلام نے ان تمام باتوں سے شدت سے منع کیا جن سے کسی انسان کی عزت نفس متاثر ہو اور اس کی تذلیل یا تحقیر ہو، چنانچہ کسی پر الزام تراشی، غیبت، دبدگوئی، چغل خوری، عیب جوئی، کبر و غرور اور بغض و حسد سے باز رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ قرآن میں ہے:

”وَمَنْ يَكْسِبْ خَطِيئَةً أَوْ إِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهِ بَرِيئًا فَقَدْ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا“ (النساء: ۱۱۲)

(جو کوئی خطا یا گناہ کرے پھر وہ اس کی تہمت کسی بے گناہ پر دھرے، اس نے کھلا گناہ اور بہتان اپنے سر لادا۔)

ایک دوسری جگہ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّنْ نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ بِئْسَ الْأَسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ وَمَن لَّمْ يَتُبْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ. يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبِ بَعْضُكُم بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ.“ (الحجرات: ۱۱-۱۲)

(مسلمانو! مرد مردوں پر نہ ہنسیں، عجب نہیں کہ جن پر ہنستے ہیں وہ (خدا کے نزدیک) ان سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں عورتوں پر ہنسیں، عجب نہیں کہ جن پر ہنستی ہیں وہ ان سے بہتر ہوں، آپس میں ایک دوسرے کو طعن نہ دو اور نہ ایک دوسرے کو برے لقب سے یاد کرو، ایمان لانے کے بعد بد تہذیبی کا نام ہی برا ہے اور جو ان حرکات سے باز نہ آئیں وہ خدا کے نزدیک ظالم ہیں۔ مسلمانو! لوگوں کی نسبت بہت شک کرنے سے بچتے رہو، کیوں کہ بعض شک داخل گناہ ہیں اور ایک دوسرے کے ٹول میں نہ رہا کرو اور نہ تم میں سے کوئی کسی کی پیٹھ پیچھے برائی کرے۔ بھلا تم میں سے کوئی اس بات کو گوارا کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت

کھائے۔ تم اس کو ناپسند کرتے ہو اور اللہ سے ڈرتے رہو، بلاشبہ اللہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔)

یہ تعلیمات تمام بنی نوع انسان کے لئے ہیں۔ جس طرح ایک مسلمان کو تکلیف دینا اور اس کی برائی کرنا حرام ہے، اسی طرح دیگر اقوام کے افراد کو بھی زبان، ہاتھ اور پاؤں سے تکلیف پہنچانا درست نہیں ہے اور اسی طرح اس کی برائی کرنا اور اسے گالی دینا جائز نہیں ہے۔

اسلام میں کسی کی عزت و حرمت پامال کرنے والے اور زنا کی تہمت لگانے والے اور بے قصور لوگوں پر الزام تراشی کرنے والے پر اسی کوڑے کی سزا مقرر کی گئی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

”وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا.“ (النور: ۴)

(اور جو پاک باز عورتوں پر الزام لگائیں اور چار گواہ نہ پیش کر سکیں تو ان کو اسی کوڑے مارو اور پھر کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو۔)

اگر کسی پر خود اس کے اقربا یا چار مطلوبہ گواہوں کی شرعی گواہی سے زنا کا جرم ثابت ہو جائے تو پھر اسلام نے اس کے خلاف سخت ترین سزا کا حکم اسی لئے دیا تا کہ معاشرہ میں خواتین کی عزت و حرمت محفوظ رہے۔ ارشاد ربانی ہے:

”الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِئَةً جَلْدَةٍ.“ (النور: ۲)

زنا سے عفت و عصمت پامال ہوتی ہے تو شرم و حیا کا جنازہ نکل جاتا ہے۔ اسی طرح شراب خوری کی بھی سخت سزا مقرر کی گئی ہے کہ شراب پینے کے نتیجے میں عقل ماؤف ہو جاتی ہے، اچھے بُرے کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔ شرابی نہ اپنی عزت و ناموس کا خیال رکھتا ہے اور نہ دوسروں کی عزت و آبرو پر حملہ کرنے سے گریز کرتا ہے۔

سرکارِ دو عالم ﷺ نے عزت نفس کا اتنا لحاظ رکھا کہ ۶ ہجری میں مختلف سلاطین کو جو خطوط آپ نے ارسال فرمائے ہیں ان میں مکتوب الیہ کے مقام و مرتبہ اور عزت نفس کی پوری رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ شاہ روم ہرقل کو آپ ﷺ نے عظیم الروم (روم کا رئیس اعظم) کے لقب سے یاد فرمایا۔ ۱۲

سرکارِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں جو مختلف و فود مختلف قبائل کے آتے تھے، آپ ان کے حسب

د مرتبہ کا لحاظ کرتے ہوئے ان کے ساتھ اکرام کا معاملہ کرتے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں چوں کہ تمام افراد بحیثیت انسان برابر ہیں، اس لئے ہر ایک شخص کا جو اس معاشرہ کا ایک حصہ ہو، خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو، اس کی عزت نفس کا خیال رکھا جائے گا اور اس کی تحقیر و تذلیل نہیں کی جائے گی۔

### شخصی آزادی کا تحفظ:

اسلام نے انسانی معاشرہ کے ہر فرد کو شخصی آزادی اور خود مختاری سے سرفراز کیا ہے، کائنات کی دیگر اشیاء حقیقی طور پر اللہ تعالیٰ کی ملک ہوتی ہیں۔ لیکن بطور نیابت انسان بھی ان کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ اصلاً اپنے ارادے اور اختیار میں آزاد ہے۔ انسان کی یہی آزادی تمام ترقیات انسانی کا ذریعہ اور تمام شرف انسانیت کا باعث ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اچھے اور برے کاموں کا شعور دیا ہے۔ انسان اپنے ارادے اور اختیار سے اچھا کام کرتا ہے، انسان کا ہر فرد اپنے رہن سہن، زبان و عقیدہ، کاروبار و تجارت اور دیگر ضروریات کی تکمیل اور طبعی خواہشات کی انجام دہی میں آزاد ہے اور وہ اپنی پسند سے تصرف کر سکتا ہے۔

انسان کو خالق کائنات کی طرف سے تین قسم کی حریت عطا کی گئی ہے:

- (۱) حریت ذات: کہ ہر انسان اصل خلقت سے آزاد پیدا کیا گیا ہے۔
- (۲) حریت صفات: کہ انسان اپنی صفات و اخلاق کے اعتبار سے رزائل انسانی سے پاک و صاف اور آزاد ہو۔

(۳) حریت معاملات: کہ مالکانہ تصرف کا حق جو اللہ نے انسان کو عطا کیا ہے وہ اس کو حاصل رہے۔ یہ تینوں طرح کی آزادی انسان کو اللہ نے عطا کی ہے۔ لیکن باوجود ذات و صفات اور معاملات میں مذکورہ حاصل شدہ آزادی کے اس کے لئے کچھ حدود مقرر ہیں، کیوں کہ مطلقاً آزادی سے انسان میں فکری اور عملی انحراف، بے راہ روی، جبر و تشدد، ظلم و تعدی اور دوسروں کی حق تلفی کا جذبہ ابھرتا ہے۔

انسان کی شخصی آزادی کے لئے اسلام نے انسان کی نجی زندگی میں مداخلت سے دوسروں کو روکا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص راز کی بات کسی سے کہتا ہے تو حکم ہے کہ اس کے راز کو راز ہی رکھا جائے۔ فرمان خداوندی ہے کہ دوسروں کے گھروں میں اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک کہ اجازت نہ لے لو اور

اہل خانہ کو سلام نہ کرلو:

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْذِنُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهَا.“ (النور: ۲۷)

مذہبی آزادی کا تحفظ:

اسلام کے خلاف یہ پروپیگنڈا بڑی شد و مد کے ساتھ کیا جاتا رہا ہے کہ اسلام تلوار کے ذریعہ پھیلا ہے اور اسلام نے انسانوں کی مذہبی آزادی کا لحاظ نہیں کیا ہے۔ بلکہ لوگوں کو دین اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے بنی نوع انسانی کی مذہبی آزادی کا جتنا تحفظ کیا ہے، اس کی مثال کسی اور مذہب میں نہیں ملتی۔ اسلام سے پہلے مذہب کے سلسلے میں بے رحمی اور تشدد اتنا زیادہ تھا کہ جو لوگ انکار کرتے وہ بھڑکتی آگ میں جھونک دیئے جاتے تھے۔ پھاڑ کھانے والے درندوں کے سامنے ڈال دیئے جاتے تھے یا ان کی دونوں ٹانگیں دو گھوڑوں کے پاؤں میں باندھ کر انکو مختلف سمتوں میں چھوڑ دیتے تھے۔ تانبہ پگھلا کر ان پر ڈال دیتے تھے یا ان کو مدہم آگ پر کئی روز تک لٹکائے رہتے تھے اور ان کے شور و فغاں کی بالکل پرواہ نہیں کرتے تھے۔ ۴۲

اسلام ساری انسانیت کے لئے پیام رحمت بن کر آیا، اس نے دین و مذہب کے سلسلے میں بڑی وسعت ظرفی اور حوصلہ کا مظاہرہ کیا اور اعلان کیا کہ ہر شخص کو مذہب کے سلسلے میں مکمل آزادی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ“ (البقرہ: ۲۵۶)

(دین کے سلسلے میں کوئی زور و بردستی نہیں، ہدایت گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے۔)

ایک انصاری صحابی کے دولڑکے عیسائی تھے، انہوں نے سرکارِ دو عالم ﷺ سے پوچھا کہ میں اپنے دونوں لڑکوں کو اسلام لانے کے لئے مجبور کرنا چاہتا ہوں۔ اس موقع پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی کہ دین میں زور و بردستی نہیں۔ تو صحابی اپنے ارادے سے باز آ گئے۔ ۴۳

قرآن کریم میں نبی کریم ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا:

”فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ. لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيِّرٍ،“ (الغاسیہ ۲۱-۲۲)

(آپ نصیحت کیجئے، آپ صرف نصیحت کرنے والے ہیں اور آپ ان پر داروغہ نہیں ہیں۔)



ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ.“ (یونس: ۹۹)

(تو نہیں ہے ان پر زور کرنے والا سو تو سمجھا قرآن سے اس کو جو ڈرے میرے ڈرانے سے۔)

ان آیات کریمہ سے واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ اسلام میں انسان کو مکمل طور پر مذہبی آزادی حاصل ہے، کیوں کہ دین کا کام زور زبردستی، طاقت و قوت اور جبر و اکراہ اور حکومت و اقتدار کا استعمال کر کے ناممکن و محال ہے۔

اسلامی شریعت میں مذہبی آزادی اور رواداری کی حسب ذیل اہم بنیادیں ہیں، جو قرآن کریم کے نصوص سے ماخوذ ہیں:

(۱) تمام سماوی مذاہب و ادیان کا سرچشمہ ایک ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

”شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ

إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ.“ (الشوریٰ: ۱۳)

(اللہ نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا جس کا حکم نوح کو دیا گیا اور جس کا حکم آپ کو بھی دیا

گیا اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو بھی دیا کہ قائم کرو دین کو اور

اس میں اختلاف نہ کرو۔)

(۲) تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی نبوت پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ان میں تفریق درست

نہیں:

”لَا تَفَرِّقْ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ.“ (البقرہ: ۱۳۶)

(۳) تمام ادیان کی عبادت گاہیں اور مذہبی مقامات قابل احترام ہیں۔

”وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفُتَّتْ صَوَامِعُ وَبِيعَ صَلَوَاتُ وَمَسَاجِدُ

يُذَكَّرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا.“ (الحج: ۴۰)

(۴) دیگر مذاہب کے معبودوں کو برا بھلا نہ کہا جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ.“ (الانعام: ۱۰۹)

(۵) مذہبی اختلاف کی بنیاد پر ایک دوسرے کو قتل کرنے یا ایک دوسرے پر تعدی کرنے سے

منع کیا گیا ہے اور نیکی کے کاموں کو فروغ دینے اور برائی کو مٹانے میں باہمی تعاون پر زور دیا گیا ہے۔

ارشاد خداوندی ہے:

”وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا وَتَعَاوَنُوْا

عَلٰى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلٰى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ“ (المائدہ: ۲)

(۶) دنیاوی زندگی میں لوگوں کو ایک دوسرے پر فضیلت دیئے جانے کا معیار اور خود اللہ کے

نزدیک معیار فضیلت پاکبازی، تقویٰ شعاری، نیکی اور بھلائی کے کاموں میں سبقت ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

”اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ“ (الحجرات: ۱۳)

(۷) دنیوی مذہبی اختلاف، نیکی صلہ رحمی اور ضیافت و دل داری میں حائل نہ ہونا چاہیے۔

قرآن میں ہے:

”وَطَعَامُ الذِّیْنِ اَوْتُوْا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ“ (المائدہ: ۵)

(۸) ایک دوسرے کے مذاہب سے متعلق مذاکرات اور بحث و مباحثہ اچھے اسلوب میں

احترام کی حدود میں رہ کر کیا جانا چاہیے۔ ارشاد باری ہے:

”وَلَا تُجَادِلُوْا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ“ (العنکبوت: ۴۶)

مذکورہ بالا اصول کی روشنی میں نبی رحمت ﷺ نے دیگر مذاہب والوں کو مکمل مذہبی آزادی

عطا فرمائی اور ان کے مذہبی امور میں مداخلت سے اجتناب کی تاکید فرمائی۔ اسلامی تاریخ سے ایک دو نہیں

سیکٹروں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اسلام میں مذہبی آزادی کے ثبوت کے لئے انتہائی کافی ہے کہ

اشاعت اسلام کے لئے کوئی کمیٹی یا کوئی ادارہ قائم نہیں کیا گیا اور اسلامی سلطنت نے کبھی اس کی طرف توجہ

نہیں کی۔

بہر حال اسلام نے مذہبی آزادی کے وہ فراخ دل اصول و ضابطے تیار کئے تھے، جنکی وجہ سے

سلطنت اسلامیہ کے شباب کے زمانہ میں یہود و عیسائی اور دیگر مذاہب کے لوگ پوری حریت اور آزادی

کے ساتھ اپنے مذہبی ارکان پر عمل پیرا رہتے تھے۔ یہ بھی اسلامی معاشرہ کا ایک امتیاز ہے کہ جہاں لوگوں کی

شخصی آزادی برقرار رہے وہیں ان کی مذہبی آزادی کا بھی پورا خیال رکھا جائے اور ان کے مذہبی امور میں

مداخلت نہ کی جائے۔

## اظہار رائے کی آزادی کی حفاظت:

انسان کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ اس کو اپنی رائے اور نقطہ نظر پیش کرنے کا حق ہو۔ اس کی رائے کا پاس و لحاظ کیا جائے۔ اسلام نے اس فطری خواہش کا مکمل لحاظ رکھا ہے۔ حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانی فرماتے ہیں:

”حریت طبعی جرائت اخلاق کے معنی شرع میں یہ ہیں کہ آدمی حق طلب کرنے، مسائل کے دریافت کرنے اور امر حق کے اظہار میں حیا نہ کرے۔ کسی کا رعب و خوف مانع نہ آئے، اگر صاحب حق کو حق طلب کرنے سے روک دیا جائے، کسی اظہار حق سے منع کر دیا جائے، یا ایسا معاملہ کیا جائے جس سے لوگ خود رک جائیں، مطلقاً حرام ہے اور صریح ظلم ہے۔ اگر خود تقصیر کرے تو اس کا ذمہ دار و جواب دہ خود ہے۔ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: واللہ لا یتستحیی من الحق (الاحزاب: ۵۳) (خداوند عالم حق سے نہیں شرماتا) اس کا حاصل یہ ہے کہ افہام و تفہیم میں جس امر کی ضرورت ہو اس کا استعمال کرنا چاہیے۔ ملامت کرنے والے کی ملامت یا لعن و طعن کی پرواہ نہ کرنی چاہیے۔ ارشاد خداوندی ہے: وَأُمِرُ بِالْمَعْرُوفِ وَأَنَّهُ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأَصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ (لقمان: ۱۷) بھلی باتوں کا حکم کرو، بری باتوں سے روکو اور تجھ کو مصیبت پہنچے تو اس پر صبر کرو۔“

مولانا عثمانی مزید یہ بھی فرماتے ہیں:

”ہاں اظہار مافی الضمیر اور اظہار رائے کی ایسی آزادی ہو کہ کسی کے لعن و طعن کی پرواہ نہ کرے، کسی کا خوف و اندیشہ مانع نہ آئے، جو کام کرنا چاہے سلطنت کے حقوق کی رعایت نہ کر کے بلا دھڑک کر گذرے، ایسے شخص کو سراہا جاتا ہے۔ اس کی حریت و آزادی کی تعریف کی جاتی ہے۔ حالاں کہ ایسی مطلق آزادی ہرگز مفید نہیں۔ بسا اوقات مضر اور سخت مضر ہوتی ہے۔ اس زمانے کی مسموم فضا نے حریت کا ایسا مفہوم دماغوں میں بھر دیا ہے کہ جس سے بیٹے کے دل میں نہ باپ کا احترام باقی، نہ شاگرد کے دل میں استاذ کا ادب ہے، نہ رعایا کے دل میں حکام کی عظمت، نہ قانون کی قدر و منزلت، نہ حقوق کی نگہداشت، نہ اہل حقوق کی حق شناسی، ایک عام طوفان حریت کا ہے، جس نے انسان کو بہیمیت کے درجہ تک پہنچا دیا ہے۔ حقیقی آزادی اظہار رائے وہ ہے جو افراط و تفریط سے خالی ہو، جس سے افراد انسانی میں کسی کی دل

لے کر اس کو لے کر آئے۔ آج کے دن اس کی ہمت اور شجاعت کی مثال نہیں ملے گی۔ (۵-۱۰۱)

اور اس کے بعد اس کی ہمت اور شجاعت کی مثال نہیں ملے گی۔ (۵-۱۰۱)

آج کے دن اس کی ہمت اور شجاعت کی مثال نہیں ملے گی۔

اور اس کے بعد اس کی ہمت اور شجاعت کی مثال نہیں ملے گی۔ (۵-۱۰۱)

آج کے دن اس کی ہمت اور شجاعت کی مثال نہیں ملے گی۔

اور اس کے بعد اس کی ہمت اور شجاعت کی مثال نہیں ملے گی۔ (۵-۱۰۱)

آج کے دن اس کی ہمت اور شجاعت کی مثال نہیں ملے گی۔

اور اس کے بعد اس کی ہمت اور شجاعت کی مثال نہیں ملے گی۔ (۵-۱۰۱)

کے لئے متوجہ کیا، مکہ میں دار ارقم اس کے لئے استعمال ہوتا تھا اور مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کا ایک حصہ تعلیمی ضروریات کی تکمیل کے لئے خاص کیا گیا تھا۔ جنگ بدر میں گرفتار کئے گئے قیدیوں سے زرفدیہ لینا طے ہوا، قیدیوں میں سے کچھ لوگ زرفدیہ ادا کرنے پر قادر نہ تھے، ایسے لوگوں سے کہا گیا کہ وہ مسلمانوں کو تعلیم دیں اور انہیں پڑھائیں۔ ۴۶

اس بات سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام میں تعلیم کی کتنی اہمیت ہے۔ حتیٰ کہ دشمنوں سے بھی علم حاصل کرنے کے دروازے کھولے جارہے ہیں۔ یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے کہ بچوں کے حقوق تفصیل سے بیان کئے جن میں تعلیم و تربیت کا حق شامل ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

”عن جابر بن سمرہ قال قال رسول الله ﷺ لان يودب الرجل ولده خير له

من ان يتصدق بصاع.“ ۴۷

(کوئی شخص اپنی اولاد کو ادب سکھائے (تعلیم دے) یہ اس بات سے بہتر ہے کہ وہ ایک صاع صدقہ و خیرات کرے۔)

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ والد اچھی تعلیم و تربیت سے بہتر کوئی تحفہ اپنی اولاد کو نہیں دے سکتا:

”ما نحل والد ولد من نحل افضل من ادب حسن.“ ۴۸

علم کی اہمیت اس حدیث سے بھی واضح ہوتی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول الله ﷺ الكلمة الحکمة ضالة المؤمن فحيث

وجدها فهو احق بها.“ ۴۹

(حکمت مومن کی متاع گم شدہ ہے، مومن اس کا زیادہ حقدار ہے کہ اس کو جہاں بھی پائے

لے لے۔)

سرکارِ دو عالم ﷺ نے علم حاصل کرنے والوں کے بارے میں ہدایت فرمائی ہے:

”عن ابی ہریرۃ قال کنا ناتی ابا سعید فیقول مرحبا بوصیۃ رسول الله ﷺ ان

النبي ﷺ قال ان الناس لکم تبع وان رجالا یاتونکم من اقطار الارض

یتفقہون فی الدین واذا اتوکم فاستوصوا بہم خیرا.“ ۵۰

(جب علم حاصل کرنے والے مختلف علاقوں سے تمہارے پاس آئیں تو ان کے ساتھ حسن

سلوک کرنے کے سلسلے میں میری وصیت پر عمل کرو۔)

علماء کرام نے صراحت کی ہے کہ دین اسلام کی بنیادی معلومات جاننا ہر مسلمان پر فرض ہے، لیکن دین کا مکمل عالم بننا یہ فرض کفایہ ہے، سب کے لئے لازم نہیں ہے۔ اسی طرح دنیاوی زندگی میں ترقی اور عزت و احترام کا مقام حاصل کرنے کے لئے عصری تعلیم حاصل کرنا ایک سماجی ضرورت ہے۔ تقاضوں کو پورا کرنا، یہ والدین کی بھی ذمہ داری ہے، سماج کے سرکردہ حضرات کی بھی اور دانش ور و ارباب حکومت کی بھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ علم کے ذریعہ معاشرہ اور اس کے افراد مہذب و متمدن بنتے ہیں، ان کا فکری شعور پروان چڑھتا ہے اور اچھے برے کی ان میں تمیز پیدا ہوتی ہے، اس لئے اسلام نے تعلیم پر خاص زور دیا ہے اور اس کے حصول کو فرض قرار دیا ہے اور تعلیم و تعلم کو اسلامی معاشرہ کا بنیادی عنصر قرار دیا، کیوں کہ علم کے ذریعہ ہی خدا اور اس کے رسول کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

### ظلم و زیادتی کے خلاف احتجاج:

اسلامی معاشرہ میں ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی فرد، جماعت یا حکومت کی طرف سے اگر اس پر زیادتی اور ظلم ہو رہا ہے، اس کے حقوق تلف کئے جا رہے ہیں، اس کی جان و مال یا عزت و آبرو پر حملہ کیا جا رہا ہے تو اس کے خلاف آواز اٹھائے، شکایت کرے، عدالتی کارروائی کرے اور اپنے ساتھ انصاف کئے جانے کا مطالبہ کرے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

”لَا يُحِبُّ اللَّهُ الْجَهْرَ بِالسُّوءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظَلِمَ وَكَانَ اللَّهُ سَمِيعًا

عَلِيمًا۔“ (النساء: ۱۴۸)

(اللہ کو پسند نہیں کسی کی بری بات کا ظاہر کرنا مگر جس پر ظلم ہوا ہو اور اللہ خوب سننے والا اور

جاننے والا ہے۔)

اگر کوئی شخص پیٹھ پیچھے کسی دوسرے کی برائی کرتا ہے تو اللہ اسے پسند نہیں کرتا، لیکن اگر وہ مظلوم ہے تو اس کو یہ اجازت ہے کہ وہ اپنے اوپر ہونے والے ظلم کے خلاف آواز بلند کرے اور ظالم کی شکایت کرے۔

حضور اکرم ﷺ مدینہ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی خصومات کا فیصلہ فرماتے تھے جو وحی الہی کی بنیاد پر ہوتے تھے۔ آپ ﷺ ظالم اور مظلوم، مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو اپنا موقف پیش کرنے کی

اجازت دیتے، دونوں کی بات توجہ سے سنتے اور انصاف کے تقاضوں کی مکمل رعایت کے ساتھ فیصلہ صادر فرماتے تھے۔ آپ ﷺ ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کو نہ صرف یہ کہ پسند فرماتے تھے، بلکہ اس کی ہمت افزائی بھی فرماتے تھے۔ ارشاد نبوی ہے:

”عن ابی سعید الخدری ان النبی ﷺ قال من اعظم الجہاد کلمۃ عدل عند سلطان جائر۔“ ۵۱

(ظالم حکمران کے سامنے حق بات کہنا افضل ترین جہاد ہے۔)

اپنے حقوق کے مطالبہ کے سلسلے میں اگر کسی کے کلام میں ترشی اور تلخی پیدا ہو جائے تو اس کو برداشت کرنے کی تعلیم آپؐ نے امت کو دی ہے اور فرمایا کہ صاحب حق کو اپنی بات کہنے کا حق ہے:

”عن ابن عباس قال جاء رجل يطلب نبی اللہ بدین او بحق فتکلم ببعض الکلام فہم صحابۃ رسول اللہ ﷺ فقال رسول اللہ ﷺ ما صاحب الدین لہ سلطان علی صاحبہ حتی یقضیہ۔“ ۵۲

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی نظام اور معاشرہ میں حاکم اور محکوم برابر ہیں بایں معنی کہ اگر کسی پر ظلم و زیادتی ہو تو اس کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ حاکم وقت سے انصاف طلب کرے چہ جائے کہ ظالم خود حاکم کیوں نہ ہو، مظلوم کی پوری بات سنی جائے گی، اس کی فریاد رسی کی جائے گی اور ظالم کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے گا۔

شہری حقوق کا تحفظ:

اسلام سے پہلے دور جاہلیت میں عربی قبیلوں کا نظام رائج تھا، قبیلے کا شیخ ان کا حاکم ہوتا، جو قبیلے کے افراد میں نسب اور خون کے رشتے کی بنا پر اتحاد قائم رکھتا تھا اور افراد کی مدد سے قبیلے کی فلاح و بہبود میں کوشاں رہتا تھا۔ اسلام نے عربوں کے مختلف طبقوں اور الگ الگ فرقوں کے افراد میں اتحاد و یکجہتی پیدا کی، آقا و غلام، امیر و غریب اور شریف و رزیل کے امتیازات کو مٹا کر شہری نظام کی بنیاد رکھی، مدینہ منورہ میں باقاعدہ نظام حکومت قائم کیا۔ قرآن پاک نے اس بارے میں ہدایات دیں:

(۱) ”إِنَّ الْحَكَمَ إِلَّا لِلَّهِ۔“ (یوسف: ۴۰)

(حکومت نہیں کسی کی سوائے اللہ کے۔)

- (۲) وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ. (شوری: ۳۸)  
(اور کام کرتے ہیں مشورہ سے آپس میں۔)
- (۳) إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ. (النحل: ۹۰)  
(اللہ حکم کرتا ہے انصاف کرنے کا۔)
- (۴) أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ (النساء: ۵۹)  
(حکم مانو اللہ کا حکم مانو رسول کا اور حاکموں کا جو تم میں سے ہوں۔)
- (۵) وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (شوری: ۱۰)  
(اور جس بات میں جھگڑا کرتے ہو تم لوگ کوئی چیز ہو اس کا فیصلہ ہے اللہ کے حوالے۔)
- (۶) وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا (بنی اسرائیل: ۳۴)  
(اور پورا کرو عہد کو بے شک عہد کی پوچھ ہوگی۔)
- (۷) لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب: ۲۱)  
(تمہارے لئے بھلی تھی سیکھنی رسول اللہ کی چال۔)
- (۸) وَمَنْ لَمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (المائدہ: ۴۷)  
(جو کوئی حکم نہ کرے موافق اس کے جو کہ اتارا اللہ نے سو وہی لوگ ہیں نافرمان۔)
- (۹) وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ (آل عمران: ۱۴۰)  
(اور اللہ محبت نہیں کرتا ظلم کرنے والوں سے۔)

مذکورہ بالا آیات شریفہ میں جو احکام ہیں وہ اسلامی ریاست اور شہری نظام کی بنیاد ہیں۔ اسلامی نظام حکومت میں ہر شخص کو وہ تمام حقوق حاصل ہوتے ہیں جو کسی بھی شہری کو ملنے چاہئیں۔ ہر باشندے کی جان و مال کی حفاظت کی جاتی ہے، اس کو عدل و انصاف میں مساوی حقوق ملتے ہیں اور ہر طرح کے ظلم و جبر سے اس کی حفاظت کی جاتی ہے۔

اسلام کے تمام قوانین اصول رحمت و شفقت پر مبنی ہوتے ہیں اور ہر حاکم و راعی کو تمام رعایا کی پوری رعایت، خبرگیری اور خیر خواہی کا خیال کرنا ہوتا ہے اور وہ سب کا ہر طرف سے پرسان حال ہوگا۔

الاکلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ۔ ۵۳



شہری حقوق کے ضمن میں پیشہ اختیار کرنے کا حق، ملازمت کا حق، اسلام نے ان حقوق کی پاس داری کی ہے۔ ارشاد ربانی ہے: فامشوا فی مناكبها وکلوا من رزقه۔ (الملک: ۱۵) اس زمین کے اوپر چلو اور اس کی روزی میں سے کھاؤ۔

ارشاد نبوی ﷺ ہے:

”عن المقدم عن النبي ﷺ قال ما اكل احد طعاما قط خيرا من ان ياكل من

عمل يده۔“ ۵۴

(اپنے ہاتھ کی کمائی کے کھانے سے بہتر اور کوئی کھانا نہ کھایا ہوگا۔)

قرآن کریم میں ارشاد الہی ہے:

”وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ“ (التوبہ: ۱۰۵)

(کہہ دیجئے کام کاج کرو! اللہ، اس کا رسول اور مومنین تمہارے کام کو دیکھیں گے۔)

حکومت و اقتدار میں شرکت کے حق کے سلسلے میں ارشاد الہی ہے:

”وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَّبِعُوا مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ“ (يوسف: ۵۶)

(اسی طرح ہم نے یوسف کو زمین میں اقتدار عطا کیا وہ جہاں چاہتے تھے ٹھہرا کرتے تھے۔)

دوسری آیت میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا مقولہ نقل کیا گیا ہے:

”رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ۔“ (يوسف: ۱۰۱)

(پروردگار آپ نے مجھے حکومت عطا فرمائی۔)

معلوم ہوا کہ حکومت میں شرکت کا حق بھی اللہ کا ایک احسان ہے اور انسانی حقوق کے ضمن میں آتا ہے اور بحیثیت معاشرہ کے ایک فرد ہونے کے اس کے شہری حقوق میں سے ایک حق یہ بھی ہے کہ انسان اپنی لیاقت و صلاحیت کی بنیاد پر حکومت میں شرکت کرے، یہ اس کا شہری حق ہے جو کہ اسے اسلامی سماج اور اسلامی نظام عطا کرتا ہے۔

معاشرتی عدل و انصاف:

اسلام میں عدل و انصاف کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ اگر معاشرے میں عدل و انصاف کی بنیادیں

مستحکم ہوں، اس کے تقاضوں کو پورا کیا جاتا ہو تو معاشرہ امن و سلامتی اور سکون و عافیت کا گہوارہ بن جاتا



ہے۔ اس کا ہر فرد ایسے معاشرے میں اپنے آپ کو مکمل طور پر محفوظ اور پرسکون محسوس کرتا ہے، ورنہ معاشرہ درہم برہم ہو جاتا ہے۔ سکون و اطمینان غارت ہو جاتا ہے۔ اسلام نے جس تفصیل کے ساتھ عدل و انصاف کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے، اس کی مثال دوسرے مذاہب میں نہیں ملتی۔ اللہ رب العزت ارشاد فرماتا ہے:

”إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ.“ (النحل: ۹۰)

(بے شک اللہ تعالیٰ تم کو انصاف کرنے، بھلائی کرنے اور قربت داروں کو دینے کا حکم کرتا ہے اور بے حیائی اور نامعقول کام و سرکشی سے منع کرتا ہے۔ (اللہ تعالیٰ) تم کو نصیحت فرماتے ہیں تاکہ تم نصیحت قبول کرو۔)

اس آیت کے ضمن علامہ شبیر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”انسان میں تین قوتیں ہیں جن کے بے موقع اور غلط استعمال سے ساری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ قوت بہیمیہ شہوانیہ، قوت وہمیہ شیطانیہ اور قوت غصبیہ سبعیہ۔ غالباً فحشاء سے وہ بے حیائی کی باتیں مراد ہیں جن کا منشا شہوت و بہمیت کی افراط ہو، منکر یعنی نامعقول کام جن پر فطرت سلیمہ اور عقل صحیح انکار کرے۔ تیسری چیز بغی ہے۔ یعنی سرکشی کر کے حد سے نکل جانا، ظلم و تعدی پر کمر بستہ ہو جانا، درندوں کی طرح کھانے پھاڑنے اور دوسروں کی جان و مال یا آبرو وغیرہ لینے کے واسطے ناحق دست درازی کرنا، اس قسم کی تمام حرکات قوت سبعیہ غصبیہ کے بے جا استعمال سے پیدا ہوتی ہیں۔ یعنی جب تک انسان ان تینوں قوتوں کو قابو میں نہ رکھے اور قوت عقلیہ ملکیہ کو ان سب پر حاکم نہ بنائے مہذب اور پاک نہیں ہو سکتا اور اس کے بغیر ذہنی و فکری اعتدال پیدا نہیں ہوگا جو معاشرے میں عدل و انصاف کے قیام کے لئے ضروری ہے۔“ ۵۵

قرآن کریم میں متعدد جگہوں پر عدل و انصاف کے قیام پر زور دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ.“ (النساء: ۵۸)

(جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔)

اسلام نے بغیر کسی تخصیص کے سب کے ساتھ انصاف برتنے کا حکم دیا ہے۔ اسلام کا فرمان ہے

کہ حالات چاہے کیسے ہی ہوں، تم سے دوسرے لوگ خواہ کتنی دشمنی کریں، مگر کسی بھی حال میں عدل و انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ ارشاد خداوندی ہے:

”وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ اَلَّا تَعْدِلُوْا۔“ (المائدہ: ۸)

(کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو۔)

دوسری آیت میں ارشاد ہے:

”وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا۔“ (المائدہ: ۲)

(کسی ایسی قوم کی دشمنی اور عداوت جس نے تم کو مسجد حرام سے روک دیا تھا، اس باعث نہ بن

جائے کہ تم زیادتی کرنے لگو۔)

کفار مکہ نے صحابہ کرام کو صلح حدیبیہ کے سال عمرہ کرنے سے روک دیا تھا۔ مسلمانوں کو ان سے بے حد عداوت تھی، لیکن اللہ نے مسلمانوں کو ایسے جابر و ظالم دشمنوں کے سلسلے میں بھی اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کو اس لئے فرمایا کہ سخت سے سخت دشمنی بھی اس کا باعث نہ ہو کہ تم عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دو۔ عدل کا مطلب ہے کسی شخص کے ساتھ بدون افراط و تفریط کے وہ معاملہ کرنا جس کا وہ واقعی مستحق ہے، عدل و انصاف کی ترازو ایسی صحیح اور برابر ہونی چاہیے کہ عمیق سے عمیق اختلاف اور شدید سے شدید اختلاف بھی اس کے دونوں پلوں میں سے کسی پلے کو جھکا نہ سکے۔ ۵۶

خلاصہ یہ ہے کہ معاشرہ میں امن و سکون کے قیام کے لئے اسلام عدل و انصاف کا نظام نافذ کرنے پر زور دیتا ہے اور اس کے قیام کے لئے مذہبی اور کسی بھی قسم کی تفریق کو جائز نہیں سمجھتا جیسا کہ مذکورہ بالا آیات سے یہ ثابت ہوا۔

اسلامی معاشرہ میں عورتوں کے حقوق:

اسلامی نظام اور معاشرہ میں عورتوں کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے اور ان کے بغیر معاشرہ کی تکمیل کا تصور ممکن نہیں۔ لہذا جس طرح اسلام میں مردوں کو حقوق عطا کئے ہیں اسی طرح عورتوں کو حقوق دیئے گئے ہیں اور ان حقوق کی ادائیگی کے سلسلے میں اسلامی تعلیمات میں کافی ہدایات موجود ہیں جو عورت کی حیثیت، اس کے مرتبہ، قدر و منزلت اور اس کے مقام کو معاشرہ میں متعین کرتی ہیں۔ اسلام سے پہلے

عورتوں کی حالت بڑی ناگفتہ بہ تھی۔ معاشرہ میں اس کی کوئی بھی حیثیت نہ تھی، وہ گھریلو ساز و سامان کی طرح خریدی اور بیچی جاتی تھی، اس کو اپنے املاک پر بھی تصرف کرنے کا کوئی حق حاصل نہ تھا۔ مختلف مذاہب اور معاشروں میں عورت گناہ اور غلطیوں کا سرچشمہ، انسانی روح سے عاری، شرفساد کی بیٹی اور امن و سلامتی کی دشمن تصور کی جاتی تھی۔ مذہب اسلام نے اس سسکتی بلکتی اور دم توڑتی عورت کی فریادری کی، اس پر کئے جانے والے مظالم کے خلاف اعلان جنگ کیا، تاریخ میں پہلی بار اسے انسانی تہذیب اور تمدنی حقوق عطا کئے اور مرد و عورت دونوں کو انسانی معاشرہ کا معزز رکن قرار دیا۔ قرآن کریم نے اعلان کیا:

”يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا.“ (النساء: ۱)

(خدا سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور پیدا کیا اسی سے اس کی بیوی کو اور پھیلائیں ان دونوں سے بہت سارے مرد اور بہت ساری عورتیں۔)

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

”وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ.“ (البقرہ: ۲۲۸)

(عورتوں کو بھی اسی طرح کے حقوق حاصل ہیں جس طرح مردوں کو حقوق حاصل ہیں اور مردوں کو عورتوں پر ایک گونہ برتری حاصل ہے۔)

اللہ نے خواتین کے مقام کو کتنا بلند کیا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم کی ایک سورت کا نام سورہ نساء رکھا۔ پھر ایک دوسری سورۃ حضرت مریمؑ کے نام سے موسوم کیا۔ سورہ نور میں خاص طور پر خواتین کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔ سرکارِ دو عالم ﷺ نے عورتوں کے بارے میں ارشاد فرمایا:

”النساء شقائق الرجال.“ ۷۵

(خواتین مردوں کے مانند ہیں۔)

ایک مرتبہ ایک صحابی سفر میں اونٹوں کو تیز ہانکنے لگے تو آپ ﷺ نے انہیں ہدایت فرمائی:

”رویدک یا انجسہ سوقک بالقواریر.“ ۷۸

(آبگینوں کے ساتھ نرم روی اختیار کرو۔)

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”عن عبد الله بن عمرو بن العاص عن رسول الله ﷺ قال ان الدنيا كلها متاع وخير متاع الدنيا المرأة الصالحة.“ ۵۹

(آپ ﷺ نے فرمایا دنیا برتنے اور لطف اٹھانے کا سامان ہے اور بہترین سرمایہ نیک عورت ہے۔)

اسلام نے عورت کو ماں، بیوی اور بیٹی کے روپ میں وہ تقدس و عظمت، عفت و عصمت اور عزت و احترام عطا کیا ہے، جس کی نظیر دوسرے مذاہب میں نہیں ملتی۔ اس نے ماں کے قدموں تلے جنت بتائی ہے۔ حدیث میں ہے:

”عن معاوية بن جاهمة السلمي ان جاهمة جاء الى النبي ﷺ فقال يا رسول الله اردت ان اغزو وقد جئت استشيرك فقال هل لك من ام قال نعم قال فالزمها فان الجنة تحت رجلها.“ ۶۰

اسلام نے ماں باپ کے ادب و احترام، خدمت و راحت رسانی کی سختی سے تاکید کی، ماں باپ کے سامنے اولاد کو انہیں اف تک کہنے سے منع فرمایا اور حکم دیا کہ ان کے خلاف دل میں ناراضگی اور بیزاری کا ادنیٰ شائبہ بھی نہ رکھا جائے اور ان سے نرم خوئی و مشائستگی سے پیش آیا جائے۔ قرآن کریم میں ہے:

”وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَبُلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا“ (بنی اسرائیل: ۲۳)

اسلام نے نوزائندہ بچیوں کو زندہ دفن کرنے کی لعنت کا خاتمہ کیا۔ بیٹوں اور بہنوں کی تعلیم و تربیت پر جنت کی بشارت دی۔ بیوی کی حیثیت سے عورت کے بلند مقام کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بیوی سے حسن سلوک کرنے والے کو نبی آخر الزماں ﷺ نے تمام لوگوں میں سب سے بہتر قرار دیا۔ آپ نے فرمایا:

”خيركم خيركم لاهله وانا خيركم لاهلي.“ ۶۱

نبی اکرم ﷺ اہم معاملات میں ازواج مطہرات سے بھی مشورہ کرتے تھے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر سرکارِ دو عالم ﷺ نے حضرت ام سلمہ کے مشورہ پر عمل فرمایا، جس سے نہایت اہم اور نازک صورت حال کو

منٹنے میں بڑی مدد ملی۔ ۶۲۔

اسلامی معاشرہ میں عورت کو عزت کا مقام دیا گیا ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ کسی بھی اجتماعی نظام کے لئے اس کا کوئی امیر یا سربراہ ہو۔ اسی طرح عائلی نظام کے قیام کے لئے مرد و عورت میں کسی کو بالادستی دینی چاہیے تھی۔ مرد چوں کہ جسمانی ساخت کے اعتبار سے فائق اور ممتاز ہے، اسی لئے اس کو معاشرتی نظام میں عورت پر سربراہ بنایا گیا۔ قرآن میں ہے:

”الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ.“ (النساء: ۳۴)

(مرد عورتوں پر نگہبان ہیں۔)

اسلام نے عورت کو مذہبی، سماجی اور تعلیمی حقوق اس پس منظر میں دیئے ہیں کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر مثالی خاتون خانہ بن سکے اور اپنے تئیں بنیادی اوصاف، شرم و حیا، شفقت و محبت اور زینت و لطافت کے مکمل تحفظ کے ساتھ معاشرے کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کر سکے۔ اسی لئے عورتوں کی کفالت مردوں کو سونپی گئی ہے۔ عورتوں اور مردوں کے درمیان مکمل مساوات کا نعرہ لگانے والوں نے غیر شعوری طور پر یا جان بوجھ کر عورتوں پر ظلم کیا ہے۔ عورتوں کو ہوٹلوں، ریسٹورانٹوں، استقبالیہ کاؤنٹروں، تجارت گاہوں کی زینت بنادیا گیا اور برسر عام اس کی حیا و غیرت اور عصمت و عفت کو نیلام کر دیا گیا۔ اس کا سب سے بڑا نقصان خود یورپ کو بھگتنا پڑا جس نے یہ آواز بڑی شد و مد کے ساتھ اٹھائی تھی، وہاں خاندانی نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ اس کے علاوہ اسلام نے زوجین کے درمیان آپسی محبت و تعلق کا ایک جامع تصور پیش کیا اور کہا کہ اگر ان دونوں کے درمیان نباہ کی شکل نہ نکلے تو طلاق یا خلع کے ذریعہ دونوں کے درمیان علیحدگی ہوگی۔ اسلام نے حتی الامکان یہ کوشش کی کہ زوجین کا رشتہ اگر وقتی غصہ اور شیطانی وسوسے کی وجہ سے خطرہ میں پڑ جائے تو علیحدگی اس طور پر ہو کہ بعد میں ندامت اور پشیمانی ہونے پر واپسی کی گنجائش برقرار رہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”الطَّلَاقُ مَرَّتَانٍ فَإِمْسَاكَ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ“ (البقرہ: ۲۲۹)

اسلام سے پہلے عورتوں کو میراث نہیں دی جاتی تھی، اسلام نے عورت کو میراث دیئے جانے کا حکم دیا، لڑکی، بہن، ماں، بیوی، وغیرہ کی حیثیت سے میراث میں عورت کا کیا حصہ ہے، اس کی پوری تفصیل اور احکامات سورہ نساء میں بیان کئے گئے ہیں:

”يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثِيَيْنِ فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ“ (النساء: ۱۱)

عورتوں کی عزت نفس اور شرم و حیا کے تحفظ اور ان کے سماجی حقوق کی رعایت کے لئے اسلام نے جو ہدایات دی ہیں دیگر مذاہب میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

عورت کی عزت و آبرو ہر حال میں واجب الاحترام ہے۔ کوئی بھی عورت ہو اپنی ہو یا غیر کی، مسلمان ہو یا غیر مسلم عورت، عورت کا ناموس، قابل احترام و عزت ہے، ان پر ہاتھ ڈالنا اسلام کے لئے برداشت نہیں۔ عام شہری زندگی کی بات تو الگ رہی، اسلام تو میدان جنگ میں بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ دشمنوں کی عورتوں اور معصوم بچوں کو قتل کیا جائے اور انہیں تکلیف پہنچائی جائے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

”عن انس بن مالک ان رسول الله ﷺ قال انطلقوا بسم الله وبا لله وعلى

ملة رسول الله لا تقتلوا شيخا فانيا ولا طفلا ولا صغيرا ولا امرأة.“ ۶۳

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی نظام و معاشرہ میں عورتوں کو ہر طرح کے حقوق حاصل ہیں اور ان کی عزت و ناموس کی حفاظت پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے اور اس میں کسی طرح کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ اس لئے یہ بات کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ اسلام نے عملی طور پر عورتوں کو بلند مقام اور رتبہ عطا کیا ہے۔

اسلامی معاشرہ میں بچوں کے حقوق:

زمانہ جاہلیت میں بچوں کی بھی حق تلفی ہوتی تھی۔ اسلام نے والدین پر یہ ذمہ داری عائد کی کہ اپنی اولاد کے حقوق ادا کرنے پر خصوصی توجہ دیں۔ اولاد کا پہلا حق یہ ہے کہ بطن مادر میں رہنے کے زمانہ میں اس کو تحفظ فراہم کیا جائے۔ اسقاط حمل کے ذریعہ بچہ ضائع نہ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

”وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْءًا كَبِيرًا“ (بنی اسرائیل: ۳۱)

(اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے خوف سے نہ مار ڈالو، ان کو اور تم کو ہم روزی دیتے ہیں، یقیناً ان کا مار ڈالنا بڑا گناہ ہے۔)

عربوں میں دختر کشی کی جاہلانہ رسم جاری تھی۔ انہیں بڑی بے دردی سے زندہ دفن کر دیا جاتا تھا اور

انہیں اپنے لئے باعث ننگ و عار سمجھا جاتا تھا۔ جب کسی کے یہاں لڑکی پیدائش ہوتی وہ سماج سے چہرہ چھپائے پھرتا۔ قرآن کہتا ہے:

”وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنْثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ“ (النحل: ۵۶)

(اور جب ان میں سے کسی کی بیٹی ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو دن بھر اس کا منہ کالا رہتا اور وہ غصہ کھاتا ہے۔)

اگلی آیت میں اسی حقیقت کو مزید اس طرح واضح کیا گیا ہے:

”يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ“ (النحل: ۵۷)

(لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے اس بشارت کی برائی کے سبب، کیا اسے ذلت کے ساتھ رکھے گا یا اسے مٹی میں دبا دے گا، ارے بہت ہی برا حکم لگاتے ہیں۔)

اسلام نے عرب کے اس طرز عمل کی سختی سے تردید کی اور کہا کہ قیامت کے دن اس کے بارے میں ضرور سوال ہوگا کہ آخر کیا گناہ تھا جس کی پاداش میں اسے زندہ دفن کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ“ (التکویر: ۸-۹)

(اور جب زندہ دبائی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے، کس خطا پر ماری گئی۔)

اسلام نے جہاں بچوں اور بچیوں کے جینے کا حکم دیا ہے، وہیں دوسری طرف ان کی تعلیم و تربیت پر بھی ان کے والدین کو آمادہ کیا۔ کیوں کہ اسلام کی نظر میں بچے معاشرہ کا ایسا جز اور حصہ ہیں جن کے کاندھوں پر پورے معاشرہ کی اصلاح و فلاح کی ذمہ داری ہوگی، اس لئے ان کا تعلیم کی دولت سے آراستہ ہونا ایک نیک اور بہترین معاشرہ کے لئے ضروری ہے۔ حدیث میں بچوں کی تعلیم و تربیت پر اس قدر زور دیا گیا کہ ان کی تعلیم و تربیت کو صدقہ کرنے سے بھی بہتر قرار دیا گیا۔ چنانچہ ارشاد نبوی ہے:

”قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَانَ يُوَدَّبُ الرَّجُلُ وَلَدَهُ خَيْرَ لَهُ مِنْ أَنْ يَتَصَدَّقَ

بصاع.“ ۶۴

والدین کے حقوق:

والدین کا مقام اللہ تعالیٰ کے بعد انسانی رشتوں میں سب سے بڑا ہے۔ دنیا میں انسان کے سب



سے بڑے محسن اس کے والدین ہوتے ہیں۔ وہ اپنی اولاد سے بے غرض اور بے لوث محبت رکھتے ہیں، ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے سلسلے میں وہ بے حد تکلیفیں اور مشقتیں برداشت کرتے ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ ان کی اطاعت کی تاکید کی گئی ہے اور ان کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی ہر طرح کی خدمت پر زور دیا گیا ہے۔ ارشادِ بانی ہے:

”وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمَلُهُ وَفَصَالَتُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا“ (الاحقاف: ۱۵)

(ہم نے انسان کو ماں باپ کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک کی تاکید کی ہے، اس کی ماں نے اس کو تکلیف اٹھا کر پیٹ میں رکھا اور تکلیف اٹھا کر جنا اور حمل میں رکھنے اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس مہینے ہیں۔)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

”وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أَفٍّ وَلَا تَنْهَرُهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا. وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا.“ (بنی اسرائیل: ۲۳-۲۴)

(اور تمہارے رب نے قطعی حکم دے دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو اور والدین کے ساتھ نیکی سے پیش آؤ، اگر ان میں ایک یا دونوں تمہارے سامنے ضعیفی کی عمر کو پہنچیں تو ان کے آگے اف بھی نہ کرو، نہ ان کو جھڑکو، اگر ان سے کچھ کہنا ہو تو ادب کے ساتھ کہو اور محبت سے عاجزی کا پہلو ان کے ساتھ جھکا دو اور ان کے حق میں دعاء کرو کہ اے پروردگار تو ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے مجھ کو بچپن میں پالا۔)

قرآن کریم کی مختلف آیات اور احادیث میں والدین کے حقوق بیان کئے گئے ہیں۔ اگر والدین غیر مسلم ہوں تو بھی ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم ہے۔ البتہ اگر وہ شرک وغیرہ کا حکم کریں تو اس پر عمل نہ کرنا چاہیے۔ حدیث میں ہے:

”عن ابی امامة ان رجلا قال یا رسول اللہ ما حق الوالدین علی ولدھما قال

ھما جنتک او نارک.“ ۶۵

(ماں باپ اولاد کی جنت ہیں یا دوزخ۔)

دوسری حدیث میں فرمایا گیا ہے:

”عن عبد اللہ بن عمر عن النبی ﷺ قال رضا الرب فی رضا الوالد وسخط

الرب فی سخط الوالد.“ ۶۶

(اللہ کی رضا والد کی رضا کے ساتھ وابستہ ہے اور اللہ کی ناراضگی والد کی ناراضگی سے وابستہ ہے۔)

ایک اور حدیث میں ہے:

”عن ابی ہریرۃ قال جاء رجل الی رسول اللہ ﷺ فقال یا رسول اللہ من احق

بحسن صحبتی قال امک قال ثم من قال امک قال ثم من قال ثم امک قال

ثم ابوک.“ ۶۷

(ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا کہ میرے حسن صحبت کا زیادہ حقدار کون ہے، آپ نے

ارشاد فرمایا تمہاری ماں، اس نے کہا پھر کون؟ آپ نے کہا: تمہاری ماں، اس نے کہا پھر کون؟

آپ نے کہا: تمہاری ماں، اس نے کہا: پھر کون؟ آپ نے جواب دیا پھر تمہارے والد۔)

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ اگر کسی کے والدین زندہ ہوں اور وہ ان کو بڑھاپے کی عمر میں پائے یا

ان میں کوئی زندہ ہو اور پھر وہ جنت میں داخل نہ ہو سکے یعنی خدمت کر کے اور ان کی دعائیں لے کر وہ

اپنے آپ کو جنت کا مستحق نہ بنا سکے تو ایسے شخص کے لئے آپ ﷺ نے سخت ناراضگی ظاہر فرمائی ہے اور بڑا

سخت جملہ استعمال کیا کہ وہ ہلاک ہو جائے گا:

”عن ابی ہریرۃ عن النبی ﷺ قال رغب انف ثم رغب انف ثم رغب انف من

ادرک ابویہ عند الکبر احدہما او کلیہما فلم یدخل الجنة.“ ۶۸

ماں کی خدمت بڑے سے بڑے گناہ کی معافی کا ذریعہ ہے۔ جیسا کہ ترمذی میں ابن عمر سے یہ

روایت منقول ہے:

”عن ابن عمر ان رجلا اتی النبی ﷺ فقال یا رسول اللہ انی اصبحت ذنباً

عظیماً فهل لی من توبۃ قال هل لک من ام قال لا قال هل لک من خالۃ قال

نعم قال فبرھا.“ ۶۹

جس طرح مسلم والدین کے بارے میں اسلامی تعلیمات ان کے ساتھ حسن سلوک اور اطاعت و خدمت پر آمادہ کرتی ہیں، اسی طرح بغیر کسی تفریق کے یہی حکم غیر مسلم والدین کے لئے بھی ہے کہ ان کی اطاعت و فرماں برداری کی جائے اور ان کی خدمت کی جائے گی۔ ارشاد نبوی ہے کہ خدمت اور حسن سلوک، کافر و مشرک ماں باپ کا بھی حق ہے:

عن هشام بن عروة اخبرني ابي قال اخبرتنى اسماء بنت ابي بكر قالت اتتنى امي راغبة فى عهد النبى ﷺ فسالت النبى ﷺ اصلها قال نعم ابن عيينة فانزل الله فيها لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم فى الدين. "۱۷

والدین کے ساتھ حسن سلوک صرف ان کی زندگی تک محدود نہیں ہے، بلکہ ان کی موت کے بعد استغفار کرنا اور ان کے کیے وعدوں کو پورا کرنا یہ اولاد کی ذمہ داری ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"عن ابى اسيد مالك بن ربيعة قال بينما نحن عند النبى ﷺ اذ جاءه رجل من بنى سلمة فقال يا رسول الله ابقى من بر ابوى شى ابرهما به من بعد موتها قال نعم الصلوة عليهما والاستغفار لهما وايفاء بعهدو دهما من بعد موتهما اكرام صديقهما وصلة الرحم التى لا توصل الا بهما. "۱۸

(اولاد کی یہ ذمہ داری ہے کہ نہ صرف یہ کہ وہ اپنے والدین کی نماز جنازہ پڑھے گا بلکہ ان کے لئے دعائے مغفرت، ایفاء عہد، ان کے دوستوں کے ساتھ اکرام اور ان لوگوں کے ساتھ تعلق قائم کرے گا جن کے ساتھ ان کے والدین کے تعلقات تھے۔)

جس طرح اپنے والدین کا ادب و احترام اور ان کے ساتھ حسن سلوک ضروری ہے، اسی طرح دوسروں کے ماں باپ کا بھی ادب و احترام ضروری ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

"عن عبد الله بن عمر و قال قال رسول الله ﷺ ان من اكبر الكبائر ان يلعن الرجل والديه قيل يا رسول الله وكيف يلعن الرجل والديه قال يسب ابا الرجل فيسب اياه ويسب امه فيسب امه. "۱۹

(آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ گناہ کبیرہ میں داخل ہے کہ کوئی شخص اپنے والدین کو برا بھلا کہے، دریافت کیا گیا کہ یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے باپ کو بھی برا بھلا کہے، فرمایا کہ وہ شخص کسی دوسرے کے باپ کو برا کہے، پھر وہ اس کے باپ کو برا کہے، اسی طرح دونوں ایک

دوسرے کی ماں کو برا کہیں)

ان تمام آیات و احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں والدین کے حقوق اور دنیاوی رشتوں میں ان کا مرتبہ سب سے زیادہ ہے نہ صرف یہ کہ انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا گیا بلکہ ان کے دوست و احباب کے ساتھ بھی بہتر رویہ اختیار کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

اسلام میں غلاموں کے حقوق:

یونان کے فلاسفہ نے نوع انسانی کو دو قسموں میں تقسیم کیا تھا: پیدائشی آزاد، پیدائشی غلام۔ ان کے خیال میں دوسری قسم پہلی جنس کی خدمات کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ ارسطو نے غلام کا رواج سوسائٹی کے لیے ضروری قرار دیا تھا، اہل روم ان کو غلام بنا لیتے تھے جو جنگ میں قید کر لئے جاتے تھے، یا ان کے والدین غلام ہوں یا جو لوگ اپنا قرض نہ ادا کر سکتے ہوں یا لشکر سے بھاگ گئے ہوں، یہودیوں اور ہندوستانیوں میں بھی غلام کا رواج تھا۔

غلاموں کی حیثیت جانوروں سے بدتر تھی، آقا ان کی جان کا بھی مالک ہوتا تھا غلاموں کے قتل کی کوئی سزا نہ تھی، ان سے طرح طرح کی مشقت کے کام لئے جاتے تھے، ان کی ساری املاک کا مالک آقا ہوتا تھا۔ ان کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کیا جاتا تھا، اسلام نے غلاموں پر رحم و کرم اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا سبق دیا، ان کو انسانی حقوق عطا کئے، اس زمانے میں غلام اور باندی ناگزیر ضرورت تھی، اس لئے غلامی کو ختم نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لیکن اسلام نے غلاموں کو اتنے حقوق دیئے اور آقا پر اتنی ذمہ داریاں عائد کر دیں کہ غلامی کی شکل ہی بدل گئی۔ اسلام نے غلاموں کی سطح زندگی بلند کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور ان کو آزادی کے راستے پر لاکھڑا کیا۔ آں حضرت ﷺ نے غلاموں کے ساتھ حسن معاشرت کی تاکید فرمائی اور بدسلوکی سے سختی سے منع فرمایا۔ اسلام نے غلاموں کی آزادی کو یقینی بنانے کے لئے مختلف گناہوں اور جرائم میں کفارے کے طور پر غلام آزاد کرنے کی تاکید فرمائی اور ان کی آزادی پر بڑے ثواب کا اعلان کیا۔ ۳

مظلوموں، کمزور طبقوں اور حاجت مندوں کے حقوق:

اسلام نے معاشرے کے کمزور طبقوں، ضرورت مندوں، معذوروں، یتیموں، بیواؤں اور بے کسوں کو بھی انکے حقوق عطا کئے ہیں اور ان کی خدمت، خبر گیری، ہمدردی اور معاونت کی تلقین فرمائی ہے۔

اسلام سے پہلے یتیموں پر بڑا ظلم ہوتا تھا، ان کی حق تلفی کی جاتی تھی اور ان کو ہر طرح سے دبانے کی کوشش ہوتی تھی۔ لیکن سرکارِ دو عالم ﷺ نے ان کی پرورش کی اور ان کی دیکھ رکھ کے سلسلے میں جو تعلیمات دیں، ان سے عربوں کی فطرت ہی بدل گئی۔ وہی دل جو بے کسوں اور یتیموں کے لئے پتھر سے زیادہ سخت تھے، وہ موم سے زیادہ نرم ہو گئے۔ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”عن ابی ہریرۃ عن النبی ﷺ قال خیر بیت فی المسلمین بیت فیہ یتیم

یحسن الیہ وشر بیت فی المسلمین فیہ یتیم یساء الیہ۔“ ۷۴

(مسلمانوں کے گھرانوں میں سب سے بہترین گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا ہو اور مسلمانوں کے گھرانوں میں سب سے بدترین گھر وہ ہے جہاں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا ہو۔)

ایک دوسری روایت میں آپ نے ارشاد فرمایا:

”عن مالک بن صفوان بن سلیم یرفعہ الی النبی ﷺ قال الساعی علی

الارملة والمسکین کمجاہد فی سبیل اللہ۔“ ۷۵

(بیوہ اور مسکین کے لئے دوڑ دھوپ کرنے والا ایسا ہے جیسا خدا کی راہ میں تگ و دو کرنے والا۔)

اسلام نے بیماروں کے حقوق ادا کرنے کی بھی تاکید کی ہے، ان کی عیادت اور مزاج پرسی کا حکم دیا ہے اور ان کی ہر طرح کی مدد کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں ہے جس کا مفہوم ہے کہ اللہ ایک بندے سے کہتا ہے کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا، اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے وہاں پاتا۔ ۷۶

بیماروں کی بیماری کا لحاظ کرتے ہوئے ان کے سلسلے میں احکام میں تخفیف کا بھی حکم ہے، بیماروں کی خبر گیری اور ان کے حقوق کی ادائیگی اسلامی فریضہ بھی ہے اور انسانی بھی۔ واقعہ یہ ہے کہ معاشرہ کے ہر طبقے کے حقوق کا خیال رکھنا اور ان کی ادائیگی پر لوگوں کو ابھارنا معاشرہ میں افراد کو ایک دوسرے سے قریب کرتا ہے اور پھر اس قربت کے نتیجے میں ایک دوسرے کے دکھ اور تکلیف کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، نیز باہمی تعاون کا جذبہ فروغ پاتا ہے۔

## اسلام میں دیگر اقوام اور اہل مذاہب کے حقوق:

یہ وپریگنڈہ بڑے زور و شور سے کیا جا رہا ہے کہ اسلام اور اس کے ماننے والے دوسرے مذہب والوں کو برداشت کرنے کے روادار نہیں، یہ ایک گمراہ کن پروپیگنڈہ ہے، اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کی عالمی سازش ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام دین رحمت ہے، اس کا دامن محبت و رحمت ساری انسانیت پر محیط ہے۔ اسلام نے اپنے تمام پیروکاروں کو سخت تاکید کی ہے کہ وہ دیگر اقوام اور اہل مذاہب کے ساتھ مساوات، ہمدردی، غم خواری اور رواداری کا معاملہ کریں اور اسلامی معاشرہ و نظام حکومت میں کسی طرح کی زیادتی، بھید بھاؤ اور امتیاز ان کے ساتھ نہ کیا جائے، ان کی جان و مال، عزت و آبرو، اموال و جائداد اور دیگر حقوق انسانی کی حفاظت کی جائے۔ ارشاد بانی ہے:

”لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ.“ (الممتحنہ: ۸)

(اللہ تم کو منع نہیں کرتا ان لوگوں سے جوڑے نہیں دین کے سلسلے میں اور نہیں نکال تم کو تمہارے گھروں سے کہ ان کے ساتھ بھلائی کرو اور انصاف کا سلوک بے شک اللہ چاہتا ہے انصاف والوں کو۔)

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں حضرت علامہ شبیر عثمانی تحریر فرماتے ہیں:

”مکہ میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو آپ پر اسلام نہیں لائے اور مسلمان ہونے والوں سے کوئی ضد یا پر خاش بھی نہیں رکھی، نہ دین کے معاملہ میں مسلمانوں سے لڑائی کی، نہ ان کو ستایا اور نہ ہی ان لوگوں کی مدد کی جنہوں نے مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھائے۔ اس طرح کے غیر مسلموں کے ساتھ بھلائی اور حسن خلقی سے پیش آنے کو اسلام نہیں روکتا، جب وہ تمہارے ساتھ نرمی اور رواداری سے پیش آتے ہیں تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ تم بھی ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور دنیا کو دکھلا دو کہ اسلامی اخلاق کا معیار کس قدر بلند ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ اگر غیر مسلموں کی ایک قوم مسلمانوں سے برسر پیکار ہے تو تمام غیر مسلموں کو بلا تمیز ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا شروع کر دیں، ایسا کرنا حکمت و انصاف کے خلاف ہوگا۔“

دیگر مذاہب والوں کے ساتھ تعاون اور عدم تعاون کا اسلامی اصول یہی ہے کہ ان کے ساتھ

مشترک سماجی و ملکی مسائل میں جن میں شرعی نقطہ نظر سے اشتراک کو تعاون کرنے میں کوئی ممانعت نہ ہو ان میں ساتھ دینا چاہیے۔

دیگر مذاہب یا اقوام کے لوگ اگر مسلمان سے سخت عداوت اور دشمنی بھی رکھتے ہوں تب بھی اسلام نے ان کے ساتھ رواداری کی تعلیم دی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

”وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ“ (ہم سجدہ: ۳۴)

(بدکاری کا بدلہ نیکی سے دوپھر جس شخص کے ساتھ تمہاری عداوت ہے وہ تمہارا گرم جوش حامی بن جائے گا۔)

حقیقت یہ ہے کہ اگر اسلامی اصول و ضوابط کی بنیاد پر معاشرہ کی تشکیل ہو اور اس کے افراد ان اصولوں کی پاسداری و لحاظ کریں تو نہ صرف مسلمانوں کے لئے یہ معاشرہ بہترین پناہ گاہ ہوتا ہے بلکہ غیر اقوام بھی اسی معاشرہ کے دامن میں اپنے لئے امن و سکون اور عافیت ڈھونڈتے ہیں۔

کفار کے ساتھ حسن سلوک:

کفار و مشرکین نے مکہ مکرمہ میں وہ کون سا ظلم تھا جو سرکارِ دو عالم ﷺ کے ساتھ روا نہ رکھا۔ آپ ﷺ کو جادوگر، شاعر اور کاہن کہا گیا، آپ کو جسمانی اور ذہنی اذیتیں دی گئیں، آپ پر پتھروں اور سنگریزوں کی بارش کی گئی، آپ ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، آپ کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی گئی۔ نماز کی حالت میں آپ پر اونٹ کی اوجھڑی رکھ دی گئی، آپ ﷺ کے قتل کے منصوبے تیار کئے گئے، تین سال تک شعب ابی طالب میں آپ کو محصور رکھا گیا، جس میں ببول کے پتے کھا کر گزارہ کرنے کی نوبت آئی، لوگوں نے آپ کو گالیاں دیں اور اتنا زور دوکوب کیا گیا کہ آپ کے نعلین مبارک خون سے لبریز ہو گئے۔ آپ کو مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کیا گیا، آپ جب مدینہ تشریف لے گئے تو وہاں بھی سکون و اطمینان سے نہیں رہنے دیا گیا، طرح طرح کی یورشیں جاری رکھی گئیں اور یہودیوں کے ساتھ ملکر رحمت عالم ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف منصوبہ بند مہم چھیڑ دی گئی۔ فتح مکہ کے موقع پر کفار کو موت اپنے سامنے نظر آرہی تھی، ان کو خطرہ تھا کہ آج ان کی ایذا رسانیوں کا انتقام لیا جائے گا، لیکن قربان جائیں رحمت عالم ﷺ پر کہ آپ نے ارشاد فرمایا:

”اے قریشیو! تم کو کیا توقع ہے، اس وقت میں تمہارے ساتھ کیا کروں؟ انہوں نے جواب دیا: ہم اچھی امید رکھتے ہیں، آپ کریم النفس اور شریف بھائی ہیں اور کریم و شریف بھائی کے بیٹے ہیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں تم سے وہی کہتا ہوں جو یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا، آج تم پر کوئی الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔“ ۸

کیا انسانی تاریخ میں رحم و کرم کی کوئی مثال پیش کی جاسکتی ہے؟ اسلام نہ صرف حسن سلوک کی تعلیم دیتا ہے بلکہ عفو و درگزر کو ایک صالح معاشرہ کے لئے لازمی جز قرار دیتا ہے تاکہ دنیا کو یہ بتایا جاسکے کہ حسن اخلاق کی اگر تمہیں عمدہ نظیر اور مثال ڈھونڈنی ہے تو آؤ اس سماج اور معاشرہ میں سکونت اختیار کرو جہاں تمام افراد انسانی کو اللہ کا کنبہ قرار دے کر ان کے ساتھ یکساں سلوک کیا جاتا ہے اور عفو و درگزر اور معافی کو اس معاشرہ کی خصوصیت قرار دیا جاتا ہے۔

یہودیوں کے ساتھ حسن سلوک:

یہودیوں کے قبائل مدینہ میں آباد تھے، نبی کریم ﷺ کے مدینہ ہجرت فرما جانے کے بعد شروع میں یہودی غیر جانب اور خاموش رہے لیکن اس کے بعد وہ اسلام اور نبی رحمت ﷺ اور مسلمانوں کے تئیں اپنی عداوت و معاندانہ رویہ زیادہ دنوں تک نہ چھپا سکے۔ انہوں نے سرکارِ دو عالم ﷺ اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی، خفیہ سازشیں کیں، بغاوت کے منصوبے بنائے، آپ ﷺ کو شہید کرنے کی تدبیریں سوچیں، اسلام اور مسلمانوں کو زک پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا، اس کی ایک وجہ یہودیوں میں حسد، تنگ دلی اور جمود و تعصب کا پایا جانا تھا (یہود اسی فطرت پر آج بھی قائم ہیں) دوسرے ان کے عقائد باطلہ، اخلاق رزیلہ اور گندی سرشت تھی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ حضرت عزیر اللہ کے بیٹے ہیں: وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ. (التوبہ: ۳۰) محمد ﷺ نے ان کی سازشوں کے بعد بھی ان کے ساتھ نہایت اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کیا۔

مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد سرکارِ دو عالم ﷺ نے یہودیوں کے ساتھ ایک اہم معاہدہ کیا تاکہ مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان خوش گوار تعلقات ہوں، دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کریں اور مشکلات میں ایک دوسرے کی مدد کریں۔

معاہدہ کی چند دفعات مندرجہ ذیل ہیں:



(۱) تمام یہودیوں کو شہریت کے وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اسلام سے پہلے انہیں حاصل تھے۔

(۲) مسلمان تمام لوگوں کے ساتھ دوستانہ برتاؤ رکھیں گے۔

(۳) اگر کوئی مسلمان یثرب والے کے ہاتھ مارا جائے تو بشرط منظوری ورثا قاتل سے خون بہا

لیا جائے گا۔

(۴) باشندگان مدینہ میں سے جو شخص کسی سنگین جرم کا مرتکب ہو، اس کے اہل و عیال سے سزا

کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔

(۵) موقع پیش آنے پر یہودی مسلمانوں کی مدد کریں گے اور مسلمان یہودیوں کی۔

(۶) حلیفوں میں سے کوئی فریق اپنے حلیف کے ساتھ دروغ گوئی نہیں کرے گا۔

(۷) مظلوموں اور ستم رسیدہ شخص کی خواہ وہ کسی قوم سے ہو مدد کی جائے گی۔

(۸) یہود پر بیرونی دشمن حملہ آور ہوگا تو مسلمانوں کو ان کی مدد کرنی ہوگی۔

(۹) یہود کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔

(۱۰) مسلمانوں میں سے کوئی شخص ظلم و زیادتی کرے گا تو مسلمان انہیں سزا دیں گے۔

(۱۱) بنی عوف کے یہودی مسلمانوں میں ہی شمار ہوں گے۔

(۱۲) یہودیوں اور مسلمانوں میں جس وقت کوئی قضیہ پیش آئے گا تو اس کا فیصلہ رسول اللہ ﷺ

کریں گے۔

(۱۳) یہ عہد نامہ کبھی کسی ظالم یا خاطی کی جانب داری نہیں کرے گا۔ ۹

آپ ﷺ اس معاہدے کے مطابق یہودیوں کے ساتھ برتاؤ کرتے رہے۔ لیکن یہودیوں نے

اس معاہدے کی پاس داری نہیں کی۔ مسلمانوں کے خلاف مشرکین مکہ کی مدد کی اور اسلام اور مسلمانوں کے

خلاف ہمیشہ درپے آزار رہے۔

عیسائیوں کے ساتھ حسن سلوک:

عیسائیوں کے ساتھ بھی سرکارِ دو عالم ﷺ نے مثالی رواداری برتی۔ مکہ مکرمہ اور یمن کے درمیان

واقعہ 'نجران' کا ایک مقرر وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے ان کو مسجد میں ٹھہرایا۔ انہوں نے

سرکارِ دو عالم ﷺ کے ساتھ مذہبی معاملات میں گفتگو کی۔ اس موقع پر آپ نے عیسائیوں کے ساتھ ایک

تاریخی معاہدہ فرمایا۔ جس کی چند دفعات مندرجہ ذیل ہیں:

- (۱) ان کو ان کے مذہب سے برگشتہ نہیں کیا جائے گا۔
- (۲) جزیہ کی ادائیگی کے لئے ان کو محصل کے پاس نہیں جانا پڑے گا۔
- (۳) ان کی جان محفوظ رہے گی۔
- (۴) کوئی دشمن ان پر حملہ کرے تو ان کی طرف سے مدافعت کی جائے گی۔
- (۵) ان کو مذہبی و ملی تحفظ فراہم کیا جائے گا۔
- (۶) ان کا مال محفوظ رہے گا۔
- (۷) ان کے قافلے اور تجارتی کارواں محفوظ رہیں گے۔
- (۸) ان کی زمین محفوظ رہے گی۔
- (۹) وہ تمام چیزیں جو ان کے قبضے میں تھیں بحال رہیں گی۔
- (۱۰) پادری، راہب اور گرجوں کے عہدیداران اپنے عہدوں سے برطرف نہیں کئے جائیں گے۔
- (۱۱) صلیبوں اور مورتیوں کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔
- (۱۲) ان سے عشر نہیں لیا جائے گا۔
- (۱۳) ان کے ملک میں فوج نہیں بھیجی جائے گی۔
- (۱۴) فکر و عقیدہ کی آزادی ان کو حاصل رہے گی۔
- (۱۵) ان کو جو حق پہلے حاصل تھا ختم نہیں کیا جائے گا۔ ۸۰

مذکورہ بالا حقوق اسلام نے دیگر اقوام اور رعایا کو عطا کئے ہیں، ان سے زیادہ حقوق تو کوئی اپنی حکومت بھی اپنے افراد کو نہیں دے سکتی۔ جو غیر مسلم اسلامی حکومت اور اسلامی معاشرہ میں رہتے ہیں ان کے متعلق اسلامی نقطہ نظریہ ہے کہ وہ اللہ اور رسول کی پناہ میں ہیں، اسی لئے ان کو ذمی کہا جاتا ہے۔ اسلامی قانون یہ ہے کہ ذمی چوں کہ خدا اور اس کے رسول کی پناہ میں ہوتے ہیں، اس لئے ان کے تمام حقوق کا خیال رکھا جائے گا، جیسا کہ مندرجہ ذیل تفصیل سے معلوم ہوگا۔

## غیر مسلم رعایا (ذمیوں) کے حقوق:

اسلام تمام افراد بشر اور طبقات انسانی کے لئے رحمت و رافت کا پیکر بن کر آیا تھا، اس لئے اس نے غیر مسلم اقوام اور رعایا کے ساتھ مالی رحم و کرم، مساوات و ہمدردی اور رواداری کا معاملہ کیا ہے اور ان کو انسانی تاریخ میں پہلی بار وہ سماجی حقوق عطا کئے ہیں جو کسی مذہب یا تمدن والوں نے دوسرے مذہب و تمدن والوں کو نہیں دیئے۔ جو غیر مسلم اسلامی ریاست اور اسلامی معاشرہ میں قیام پذیر ہوں، اسلام نے ان کی جان و مال، عزت و آبرو اور مذہبی آزادی کے تحفظ کی ضمانت دی ہے اور حکمرانوں کو پابند کیا ہے کہ ان کے ساتھ مسلمانوں کے مساوی سلوک کیا جائے۔ ان غیر مسلم رعایا (ذمیوں) کے بارے میں اسلامی تصور یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی پناہ میں ہیں، لہذا ان کے ساتھ ایفائے عہد کیا جائے، اگر ان پر ظلم ہو تو دفاع کیا جائے اور ان پر اتنا ہی جزیہ لازم کیا جائے، جس کی وہ طاقت رکھتے ہوں:

”عن عمران قال واوصيه بذمه الله وذمه رسوله ان يوفى لهم بعهدهم وان

يقاتل من ورائهم ولا يكلفوهم الا طاقتهم.“ ۸۱

اسی طرح ان کی جان و مال کی حفاظت کی جائے گی۔ ارشاد نبوی ہے:

عن عبد الله بن عمرو عن النبي ﷺ قال من قتل معاهدا لم يرح رائحة وان

ريحها لتوجد من مسيرة اربعين عاما.“ ۸۲

(نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے کسی معاہد کو قتل کیا وہ جنت کی خوشبو نہیں پائے گا اور

بلاشبہ جنت کی خوشبو چالیس سال کی مسافت پر پائی جائے گی۔)

ذمیوں کا خون مسلمانوں کے خون کی طرح محفوظ ہے اور ان کے مال ہمارے مال کی طرح محفوظ

ہیں۔ ۸۳

سرکارِ دو عالم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”من قتل معاهدا في غير كنهه حرم الله عليه الجنة.“ ۸۴

(سنو! جو کسی معاہد (غیر مسلم) کو قتل کرے گا اللہ اس پر جنت کو حرام کر دے گا۔)

## منافقین کے ساتھ حسن سلوک:

اسلام نے نہ صرف کھل کر دشمنی کرنے والوں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی بلکہ وہ لوگ جو ظاہراً مسلمان کے ساتھ ہوں لیکن دل میں مسلمانوں سے بغض و کینہ رکھتے ہوں اور خفیہ سازشیں کرتے ہوں، ان کے ساتھ بھی بہتر برتاؤ کا حکم رہا۔ مدینہ منورہ میں ایک طبقہ ان مفاد پرستوں کا پیدا ہو گیا تھا جو زبان سے ایمان لے آیا تھا، مگر دل میں ایمان و یقین سے یکسر خالی تھے۔ یہ لوگ اسلام کے بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر بظاہر مسلمانوں کے ساتھ ہو گئے تھے، مگر باطن میں مسلمانوں کے تئیں سخت کینہ، بغض اور حسد رکھتے تھے، انکا سربراہ عبداللہ بن ابی ابن سلول تھا، یہ مدینہ کا با اثر آدمی تھا اور سرکارِ دو عالم ﷺ کے مدینہ تشریف لانے سے پہلے مدینہ کے لوگ اس کو حکمراں بنانے کی تیاری کر رہے تھے۔ حضور اکرم ﷺ کی ہجرت سے اس کی آرزو خاک میں مل گئی۔ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے کے باوجود دل سے کافر ہی رہا۔ منافقین نے مسلمانوں کے درمیان میں پھوٹ ڈالنے کی تمام کوششیں کیں، حتیٰ کہ مسجدِ ضرار کی بنیاد تک ڈال دی جس کا ذکر سورہ توبہ میں ہے کہ انہوں نے مسجدِ ضرار کی بنیاد محض تفرقہ کے لئے ڈالی۔ قرآن کہتا ہے:

”وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِداً ضُرَّاراً وَتَفَرِّقاً بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ وَإِرْصَاداً لِّمَنْ حَارَبَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ.“ (التوبہ: ۱۰۷)

(اور وہ جنہوں نے مسجد بنائی نقصان پہنچانے کو اور کفر کے سبب اور مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کو اور اس کے انتظار میں جو پہلے سے اللہ اور اس کے رسول کا مخالف ہے۔)

منافقوں نے نبی رحمت ﷺ کی شان میں گستاخیاں کیں، کافروں اور یہودیوں کے ساتھ مل کر اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے منصوبے تیار کئے، ان سب شرارتوں اور عداوتوں کے باوجود سرکارِ دو عالم ﷺ اور مسلمانوں نے ان کے ساتھ بھی حسن اخلاق اور رواداری ہی کا معاملہ فرمایا۔ عبداللہ ابن ابی کی نماز جنازہ بھی سرکارِ دو عالم ﷺ نے پڑھائی اور اس کے لڑکے کی درخواست پر اپنا جبہ مبارک اس کے کفن کے لئے مرحمت فرمایا۔ ۸۵

نبی کریم ﷺ کا یہ طریقہ کار اسلامی معاشرت اور اسلامی ریاست کا ایک امتیاز ہے کہ تم ہماری راہوں میں کانٹے بچھاؤ، ہم گلوں سے اس کی سختی کم کر دیں گے۔ تم بد اخلاقی سے پیش آؤ گے اور ہم عمدہ

اخلاق کا مظاہرہ پیش کریں گے۔ تمہاری طرف سے سازشیں ہوں گی ہماری طرف سے تمہاری ہدایات کے لئے دعائیں ہوں گی۔ الغرض ہم ہر حال میں تمہارے ساتھ حسن سلوک کریں گے، جس کا ہمیں پابند بنایا گیا ہے۔

مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے والوں کے سلسلے میں اسلامی ہدایات:

اسلامی معاشرہ کی بنیاد امن و سکون اور صلح و آشتی پر رکھی گئی ہے اور حتی المقدور اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ معاشرہ کی فضا بگڑنے نہ پائے، اس کا امن قائم رہے اور غیر اقوام و ملل کے ساتھ قتل اور جھگڑے کی نوبت نہ آئے۔ لیکن اگر ان کی طرف سے پہل ہو اور مسلمانوں کو طرح طرح سے پریشان کیا جا رہا ہو اور قتال کے بغیر امن کی کوئی شکل نہ ہو تو پھر اسلام کچھ شرائط کے ساتھ قتال کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

مکہ مکرمہ میں مسلمانوں پر کفار مظالم کے پہاڑ توڑ رہے تھے۔ ان کا جینا دو بھر کر دیا تھا، ہر طرح سے ان کو پریشان کیا جا رہا تھا تو مسلمانوں نے اولاً حبشہ کی طرف ہجرت کی پھر مدینہ منورہ چلے گئے، لیکن اس کے بعد بھی کفار، مشرکین، یہود اور منافقین کی سازشوں کے شکار رہے۔ مدینہ کو تاخت و تاراج کرنے اور مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے ارادے سے ایک لشکر جرار مدینہ پر چڑھائی کر دی، اس انتہائی مجبوری کی حالت میں اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا کہ مسلمانوں کو تلوار اٹھانے کی اجازت دی جائے، چنانچہ اللہ رب العزت نے مسلمانوں کو لڑائی کی اجازت دی اور فرمایا:

”أَذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتِلُونَ بَأْنَهُمْ ظَلَمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ“۔ (الحج: ۳۹)

(حکم ہوا ان لوگوں کو جن سے کافر لڑتے ہیں، اس واسطے کہ ان پر ظلم ہوا اور اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے)

جہاد کی اجازت ظلم و ستم کے مقابلہ کے لیے دی گئی اور برسر پیکار لوگوں کے لیے اس میں بے نظیر رواداری اور حسن اخلاق کی بھی تعلیم دی گئی جو کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی، چنانچہ اس سلسلے میں جو اسلامی ہدایات ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں، اگر تمام اقوام ان اصولوں پر عمل کر لیں تو پھر جنگ کی نوبت ہی نہ آئے گی۔

(۱) ”فَإِنْ قَاتَلْتُمُوهُمْ فَاقْتُلُوهُمْ“ (البقرہ: ۱۹۱) (اگر وہ قتال کریں تو تم ان سے قتال کرو) مراد

یہ ہے کہ تمہیں جنگ میں پہل کرنے کی اجازت نہیں ہے بلکہ اگر کفار جنگ میں پہل کرتے ہیں تو پھر اجازت ہے۔

(۲) ”وَلَا تَعْتَدُوا“ (البقرہ: ۱۹۰) (اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے قتال کرو جو تم سے قتال

کرتے ہیں اور حد سے تجاوز نہ کرو)

(۳) دشمن کے قاصدوں کو امن دیا جائے گا، ابوداؤد کی روایت ہے:

”عن سلمة بن نعيم بن مسعود الا شجعي عن ابيه نعيم قال سمعت رسول الله ﷺ يقول لهنما حين قرأ كتاب مسيلمة ما تقولان انما قالا نقول كما قال

قال اما والله لولا ان الرسل لا تقتل لضربت اعناقكما“ ۷۶

(۴) دشمن کی عورتوں، بچوں اور معذوروں کو نہیں مارا جائے گا۔ ۷۷

(۵) سرسبز کھیتوں اور پھل دار درختوں کے کاٹنے کی ممانعت فرمائی۔ ۷۸

(۶) عبادت گاہوں کو ڈھانے سے منع فرمایا۔ قرآن میں ہے: ”وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ

بِبَعْضٍ لَّهُدَمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا“ (الحج: ۴۰)

(۷) اسیران جنگ کو تکلیف پہنچانے سے منع کیا گیا اور ان کے بارے میں آپؐ نے خیر کی

وصیت کی، آپؐ نے ارشاد فرمایا: ”استوصوا بالاسارى خيراً“۔ ۷۹

(۸) دشمن اگر صلح کی درخواست کرے تو اس کو قبول کیا جائے گا۔ اللہ فرماتا ہے: ”وَإِنْ جَنَحُوا

لِلسَّلَامِ فَاجْنَحْ لَهَا“ (الانفال: ۶۱)

(۹) محض مال غنیمت کے لیے جہاد کرنے سے روکا، نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے:

”عن ابی ہریرۃ ان رجلاً قال یا رسول اللہ رجل یرید الجہاد فی سبیل اللہ

وہو یتغی عرضاً من عرض الدنیا فقال النبی ﷺ لا اجر لہ“۔ ۹۰

(ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے کہا کہ اے اللہ کے رسول، ایک شخص محض اس غرض سے اللہ

کی راہ میں جہاد کا ارادہ کرتا ہے کہ وہ دنیاوی ساز و سامان کا مالک ہو جائے تو آپؐ نے ارشاد

فرمایا کہ ایسے شخص کو کوئی اجر نہیں ملے گا۔

(۱۰) لوٹ کے مال کو حرام قرار دیا گیا ہے، ابوداؤد میں ہے:

”عن ابی لبید قال کنا مع عبدالرحمن بن سمرۃ بکابل فاصاب الناس غیمة فانتهبوها فقام خطیباً فقال سمعت رسول الله ﷺ ینهی عن النهی فردوا ما اخذوا فقسمه بینهم“ - ۹۱

(ابولبید سے منقول ہے کہ وہ عبدالرحمن بن سمرۃ کے ساتھ کابل میں تھے وہاں لوگوں کو مال غنیمت ملا وہ لوٹ کھسوٹ کرنے لگے، عبدالرحمن نے کھڑے ہو کر کہا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو لوٹ کے مال سے منع کرتے ہوئے سنا ہے۔)

یہ وہ جنگی اصول و ہدایات ہیں جو مسلمانوں کو ہمیشہ اس بات کا احساس دلاتی ہیں کہ تم خیر امت ہو لہذا تمہاری طرف سے کوئی ظلم و زیادتی اور بدلہ لینے میں بے اعتدالی نہ ہونی چاہیے ورنہ تم اور تمہارا معاشرہ دوسروں کے لیے نمونہ نہیں بن سکتا۔

وطن کی محبت اسلام میں:

یہ حقیقت ہے کہ انسان کو دنیا میں جینے اور زندگی بسر کرنے کے لیے ہمیشہ غذا کی ضرورت پڑتی ہے۔ انسان کو یہ غذا زمین سے حاصل ہوتی ہے اور بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان مٹی سے پیدا ہوا ہے، اللہ نے ارشاد فرمایا:

”فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ تُرَابٍ“ - (الحج: ۵)

دوسری آیت میں ارشاد ربانی ہے:

”وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ“ - (الاعراف: ۱۰)

(ہم نے تم کو زمین میں ٹھہرایا اور تمہارے لیے زندگی کے سامان زمین سے پیدا کیے)

انسان جہاں پیدا ہوتا ہے، جہاں وہ رہتا ہے اور جہاں کی تہذیب کو وہ اختیار کرتا ہے، اس سے انسان کو فطری لگاؤ ہوتا ہے اور اسلام چونکہ فطرت کے عین مطابق مذہب ہے اس لیے اس کی تعلیمات میں وطن سے محبت کرنے کا حکم بھی داخل ہے جیسا کہ ہمیں اس کا اشارہ ہجرت کے واقعہ سے ملتا ہے، جب نبی کریم ﷺ ہجرت فرما کر مکہ مکرمہ سے مدینہ جانے لگے تو فرمایا کرتے تھے: اے مکہ تو خدا کا شہر ہے تو مجھے کس قدر محبوب ہے، اے کاش تیرے باشندے مجھے نکلنے پر مجبور نہ کرتے تو میں تجھے ہرگز نہ چھوڑتا۔

”عن عبداللہ بن عدی الحمراء ورایت رسول الله ﷺ واقفا علی الحزورة

وهو يقول والله انك لغير ارض واجب ارض الى الله تعالى ولولا انى

اخرجت منك ماخرجت“ ۹۲۔

جب سرکارِ دو عالم ﷺ نے مدینہ کو وطن بنالیا تو دعا میں فرمایا کرتے تھے: اے اللہ ہمارے اندر مدینے کی اتنی محبت پیدا فرما دے جتنی تو نے مکہ کی محبت دی ہے، مدینہ کی آب و ہوا درست فرما دے اور ہمارے لیے مدینے کے صاع اور مد (ناپنے کے پیمانے) میں برکت عطا فرما اور مدینہ کے بخار کو جحفہ کی طرف منتقل فرما دے۔ ”قال النبی ﷺ اللهم حبب الینا المدینة کحبنا مکة أو اشد حبا“ ۹۳۔ اس حدیث سے وطن عزیز کی محبت کا بخوبی پتہ چلتا ہے، نیز اس کی اقتصادی ترقی اور آب و ہوا کی درستی اور صحت و عافیت کی بحالی کی شدید رغبت بھی ظاہر ہوئی ہے، اسی لیے وطن مالوف سے محبت کرنا فطری تقاضا بھی ہے اور شرعی بھی، نبی علیہ السلام کا مکہ کے لیے بے قرار ہونا ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ہمارے دلوں میں بھی وطن کی محبت جاگزیں ہونی چاہیے اور اس کی تعمیر و ترقی میں ہر طرح کی شرکت یہ اس محبت کا تقاضہ ہے جس کا شریعت ہم سے مطالبہ کرتی ہے۔

خلاصہ:

ایک سچے مسلمان کی زندگی اعلیٰ درجے کے اصول پر مبنی ہے اور اس کا نقشہ اس طرح مرتب کیا گیا ہے کہ مسرت اور فلاح فرد کے حصے میں بھی آئے اور معاشرہ بھی اس میں حصہ دار بنے، کیوں کہ فرد کے بغیر معاشرہ کا تصور نہیں اور جب ہر فرد فلاح و مسرت کا ضامن ہوگا تو پورا معاشرہ اس کی فلاح و مسرت میں شرکت کرے گا۔ طبقاتی جنگ، معاشرتی تفریقات اور فرد کا معاشرہ ہر غلبہ و تسلط یا اس سے برعکس معاشرہ کا فرد پر ایسا تسلط جس میں اس کی کوئی حیثیت باقی نہ رہے، یہ سب اسلامی مزاج اور اسلامی معاشرت سے مغایرت رکھتے ہیں۔ اسلامی طرز زندگی اور اسلامی معاشرہ میں افراد کے درمیان باہمی کوئی تفریق نہیں ہے، قرآن و حدیث میں ہمیں کسی جگہ کوئی ایسی بات نہیں ملتی جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ معیار شرافت، طبقہ، نسب، خاندان یا دولت کو قرار دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس ایسی بہت سی آیات قرآنی ہیں اور احادیث نبویہ بھی جو انسان کو زندگی کے اہم حقائق یا دلاتی ہیں، وہ حقائق جو اسلامی زندگی کے معاشرتی ڈھانچے کے لیے اصول کا بھی کام دیتے ہیں، ان میں سے ایک وہ جس میں فرمایا گیا ہے کہ پوری انسانیت ایک خاندان ہے جس کے سارے افراد ایک ہی ماں باپ سے وجود میں آئے ہیں اور سب کا مقصد بھی ایک



ہے جیسا کہ اللہ نے ارشاد فرمایا: ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ“۔  
(النساء: ۱) (لوگو! ڈرو اپنے رب سے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا) دوسرے جگہ ارشاد باری ہے: ”هُوَ  
الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ“۔ (الاعراف: ۱۸۹)

پوری نوع انسانی کی وحدانیت اور مساوات کے پس منظر میں اسلام نے معاشرتی زندگی کا جو تصور پیش کیا ہے، اس میں فرد اور سماج دونوں کی مشترکہ ذمہ داری ٹھہرتی ہے، فرد اپنے معاشرہ کی عمومی عافیت اور فلاح کے لیے ذمہ دار ہے، اس کا یہ کردار متعین کیا گیا ہے کہ وہ معاشرہ کے لیے اپنی قوت و صلاحیت کے بقدر سب کچھ کر گزرے۔ دوسری طرف معاشرہ بھی فرد کی بھلائی کے لیے کوشش کرے۔ باہمی امن و سلامتی کے ساتھ دونوں کے درمیان ہم آہنگی پایا جانا ضروری ہوتا ہے۔ اسلام جانہن کی اس ضرورت کو محسوس کرتا ہے اور کچھ ضابطے اور اصول مقرر کرتا ہے اور ان تمام ضابطوں کی بنیاد وحدت انسانی کو قرار دیتا ہے، چنانچہ ہم اس بنیاد کی روشنی میں دیکھتے ہیں کہ اسلام میں معاشرتی زندگی کی عمارت بہت بلند، صحت مند اور جامع ہے، جس سے ہمیں یہ درس ملتا ہے کہ ہم مسلمانوں کو اپنا معاشرہ کیسے بنانا چاہیے اور ہم مسلمان اپنی معاشرتی زندگی کس انداز سے گذاریں، ہم ایک دوسرے کے ساتھ کیسا برتاؤ کریں، غیروں اور اپنوں کے ساتھ کیسا رویہ رہے، عزیز واقارب اور پڑوسیوں کے ساتھ کیسا برتاؤ رہے، ایک دوسرے کے حقوق کیا ہیں اور ان کا خیال رکھنا کتنا ضروری ہے، اگر ہم حکمران ہیں تو اپنی رعایا کے ساتھ کیسا برتاؤ کریں، ہماری رعیت میں اگر غیر مسلم بھی ہوں تو ان کے حقوق کیا ہیں اور ان کا خیال رکھنا کتنا ضروری ہے، ان کی ذمہ داری ہم پر کیا ہیں اور ان کی حفاظت کرنا ہمارے لیے کتنا ضروری ہے، ان کی جان و مال کا تحفظ ہم پر کس قدر لازم ہے، اگر ہم رعایا ہیں تو ہمیں اپنے حکمران اور اپنے ملک کے ساتھ کیسا سلوک اختیار کرنا چاہیے، اپنے وطن میں کس طرح زندگی گذارنی چاہیے اور اپنے وطن عزیز سے کس قدر محبت کرنی چاہیے، اگر غیر اقوام کے ساتھ جنگ کی نوبت آئے تو کیا طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے، معاشرہ میں امن و سلامتی کی فضا کس طرح ہموار ہونی چاہیے، عورتوں کا کیا مقام ہونا چاہیے، والدین کے کیا حقوق ہیں، انسانی جان کی کتنی عظمت ہے اور انسانی خون کی کتنی قیمت ہے؟ یہ وہ خطوط ہیں جن پر اسلامی معاشرہ کی بنیاد رکھی گئی ہے اور یہی اس معاشرہ کی خصوصیت اور امتیاز ہے کہ وہ وحدت انسانیت کے نقطہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے تمام افراد انسانی کے ساتھ یکساں سلوک رکھے جانے کا قائل ہے، وہ بنی نوع انسان کو ذلیل و خوار اور اسے ہڑپ نہیں

کرتا بلکہ اس کے غم کو اپنا غم اور اس کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھتا ہے۔ وہ اپنے پیٹ کو کاٹ کر دوسروں کی حاجت روائی کرتا ہے، وہ لوٹ کھسوٹ، ظالمانہ استحصال اور طبقاتی نفرت کا نہیں بلکہ عدل و انصاف اور ایثار و محبت کا پیکر مجسم بن جاتا ہے۔ اگر اس کے پڑوس میں کوئی بیمار ہے تو یہ کراہتا ہے، بھوکا ہو تو تڑپتا ہے، ننگا ہو تو کپکپاتا ہے۔ الغرض وہ شیطان اور درندوں کا نہیں بلکہ خدائے جی و قیوم کی شان عدل و کرم کا ایک چلتا پھرتا نمونہ بن جاتا ہے، جہاں نہ خوف ہے، نہ حزن و بے چینی ہے اور نہ اضطراب و حرص و ہوس ہے اور نہ ظلم و بے انصافی، بلکہ ہر چیز اپنے مرکز پر قائم ہے اور چاروں طرف سکون ہی سکون ہے اور ایسا کیوں نہ ہو، کیوں کہ اس اسلامی معاشرہ کی بنیاد محمد عربی ﷺ نے خود رکھی ہے اور انھوں نے قیامت تک انسانیت کی فلاح کے لیے یہی شاہراہ متعین کی، جس پر چل کر انسان امن و سلامتی سے پُر زندگی کے پوشیدہ گوہر کو حاصل کر سکتا ہے۔

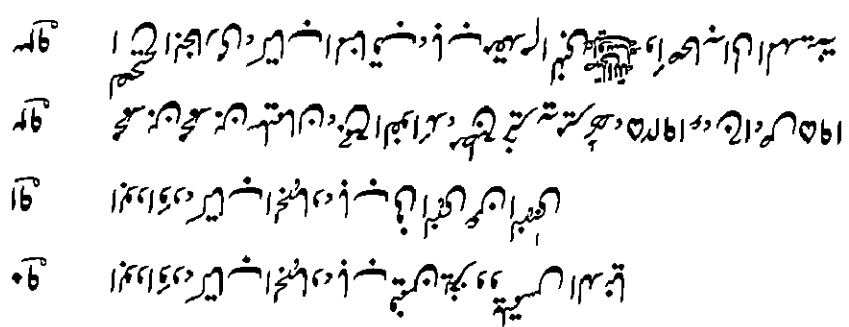
## حواشی و مراجع

۱. میک آئیور، سوسائٹی، میک ملن پریس، لندن، ۱۹۷۹ء، ص ۴۱
۲. حنیف ندوی، افکار ابن خلدون، مطبع تنیلہ پریس، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۸۰-۸۱
۳. میک آئیور، سوسائٹی، ص ۵
۴. گینس برگ، Studies in Sociology، نیویارک، ۱۹۳۲ء
۵. ضیاء الدین علوی، علم سماجیات، علی گڑھ، سن اشاعت غیر مرقوم، ص ۳۲
۶. میک آئیور، سوسائٹی، ص ۵۰۹
۷. ایضاً، ص ۵۳۱
۸. ولیم ایف اوگبرن، سوشیالوجی، نیویارک، سن اشاعت غیر مرقوم، ص ۶۹۴
۹. ڈاکٹر طاہر القادری، اسلام میں انسانی حقوق، ادبی دنیا، دہلی، ۲۰۰۷ء، ص ۹۵
۱۰. الصحیح المسلم، کتاب البر والصلة والادب، باب تحریم الظلم
۱۱. الصحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب من قام لجنائز یهودی
۱۲. ایضاً
۱۳. ابن ماجہ، کتاب الجنائز، باب فی النہی عن کسر عظام المیت
۱۴. ابویعلیٰ، مسند ابویعلیٰ، دار ایمان للتراث، دمشق، ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۸ء، ج ۶، ص ۲۵
۱۵. مسند احمد ابن حنبل، دار الحدیث قاہرہ، ۱۴۱۶ھ/ ۱۹۹۵ء، ج ۱، ص ۱۲
۱۶. محمد بن عبد الباقی الزرقانی، زرقانی، مطبع ازہریہ، مصریہ، ۱۳۲۷ھ، ج ۴، ص ۳۱۹
۱۷. علامہ شبلی نعمانی، الفاروق، مطبع برلاس پریس مراد آباد، ۱۹۰۷ء، ج ۲، ص ۱۳۱
۱۸. ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی رحمۃ الناس
۱۹. ایضاً
۲۰. الصحیح المسلم، کتاب البر والصلة والادب، باب فضل عیادۃ المریض
۲۱. الصحیح البخاری، کتاب الادب، باب رحمۃ الولد

- ۲۲ الصحیح البخاری، کتاب الادب، باب رحمۃ الناس والیہائم
- ۲۳ محمد بن محمد بن سلیمان، جمع الفوائد، مطبع خیریہ میرٹھ، ۱۹۴۵ء، ج ۱، ص ۲۷۵
- ۲۴ اشرف علی تھانوی، بیان القرآن، تاج پبلیشرز، پیری والا باغ، نئی دہلی، ج ۱، ص ۸۴
- ۲۵ ابوبکر بن حسین ابن علی البیہقی، السنن الکبریٰ، مطبع معارف عثمانیہ حیدرآباد، ۱۹۵۴ء، ج ۸، ص ۳۰
- ۲۶ ابن یوسف زیلیعی، نصب الرایۃ، دار المامون شبرا، ۱۳۵۷ھ / ۱۹۳۸ء، ج ۴، ص ۳۳۷
- ۲۷ الصحیح البخاری، کتاب الجہاد، باب ان اللہ یشد الدین بالرجل الفاجر
- ۲۸ منظور نعمانی، معارف الحدیث، مطبع الفرقان بکڈ پوکھنؤ، ۲۰۰۰ء، ج ۷، ص ۶۶
- ۲۹ ایضاً، ص ۶۴
- ۳۰ الصحیح البخاری، کتاب الادب، باب قول اللہ یشد الدین امنوا لایسخر قوم من قوم
- ۳۱ الصحیح المسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی ان من قصد اخذ مال بغير حق کان القاصد مہدر الدم فی حقہ وان قتل کان فی النار
- ۳۲ ابویوسف ابن ابراہیم، کتاب الخراج، مطبع المیریہ مصر، ۱۳۰۲ھ، ص ۲۰۹
- ۳۳ ایضاً، ص ۸۲
- ۳۴ ابن یوسف زیلیعی، نصب الرایۃ، ج ۳، ص ۳۸۱
- ۳۵ ترمذی، ابواب البیوع، باب ماجاء فی کراہیۃ الغش فی البیوع
- ۳۶ ترمذی، ابواب البیوع، باب ماجاء فی کراہیۃ بیع الغرر
- ۳۷ منوسر قی، اردو ترجمہ، مطبع نول کشور کانپور، ۱۹۶۵ء، باب دوم، اشلوک: ۱۳۵
- ۳۸ ابوالحسن علی ندوی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ، ص ۵۰۰
- ۳۹ میریا کالی کٹ، تاریخ اسپین، مطبع جان مری البی، اسٹریٹ، ۱۸۴۰ء، ص ۲۵
- ۴۰ الصحیح البخاری، کتاب الادب، باب قول اللہ یشد الدین امنوا لایسخر قوم من قوم
- ۴۱ الصحیح البخاری، باب کیف کان بدء الوحی
- ۴۲ المدینۃ والاسلام، ص ۱۴۳
- ۴۳ ابو جعفر، تفسیر ابن جریر طبری، مطبع المیمیہ، مصر، ۱۳۲۱ھ، ج ۳

- ۴۴ حبیب الرحمان عثمانی، اشاعت اسلام، شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند، ۱۹۹۷ء، ص ۷۶۰
- ۴۵ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، سیرت النبی، مکتبہ مدینہ لاہور، ۱۴۰۸ھ، ج ۱، ص ۲۱۴/۱۹۴
- ۴۶ ایضاً
- ۴۷ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی ادب الولد
- ۴۸ ایضاً
- ۴۹ ترمذی، ابواب العلم، باب فی فضل الفقہ علی العبادة
- ۵۰ ایضاً، باب ماجاء فی الاستیضاء بمن یطلب العلم
- ۵۱ ایضاً، ابواب الفتن، باب افضل الجہاد کلمۃ عدل عند سلطان جائز
- ۵۲ ابن ماجہ، ابواب الصدقات، باب لصاحب الحق سلطان
- ۵۳ الصحیح البخاری، کتاب الاحکام، باب قول اللہ تعالیٰ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول
- ۵۴ الصحیح البخاری، کتاب البیوع، باب کسب الرجل وعملہ بیدہ
- ۵۵ تفسیر عثمانی مع ترجمہ شیخ الہند، ۳۶۷
- ۵۶ ایضاً، ص ۱۴۴
- ۵۷ ترمذی، ابواب الطہارۃ، باب فینمن یتنظ ویری بللاً ولا ینکر احتلاماً
- ۵۸ الصحیح البخاری، کتاب الادب، باب المعارض مندوحۃ عن الکذب
- ۵۹ نسائی، کتاب النکاح، باب المرأة الصالحة
- ۶۰ ایضاً، کتاب الجہاد، باب الرخصة فی التحلف لمن له والده
- ۶۱ ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب حسن معاشرۃ النساء
- ۶۲ صفی الرحمان مبارکپوری، الرقیق المختوم، مجلس علمی مبارک پور، اعظم گڑھ، طبع پنجم، ص ۵۳۷
- ۶۳ ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی دعاء المشرکین
- ۶۴ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی أدب الولد
- ۶۵ ابن ماجہ، ابواب الادب، باب بر الوالدین
- ۶۶ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب من الفضل فی رضاء الوالدین
- ۶۷ الصحیح البخاری، کتاب الادب، باب بر الوالدین والیہما حق بہ

- ۶۸ الصحیح المسلم، کتاب البر والصلۃ، باب فضل صلۃ اصدقاء الابرار
- ۶۹ ترمذی، ابواب البر والصلۃ، باب الخالۃ بمنزلۃ الام
- ۷۰ الصحیح البخاری، کتاب الادب، باب صلۃ الوالد المشرک
- ۷۱ ابن ماجہ، ابواب الادب، باب صل من کان ابوک یصل
- ۷۲ الصحیح البخاری، کتاب الادب، باب لا یسب الرجل والدہ
- ۷۳ محمد علیم اللہ صدیقی، مسلمانوں کا نظام مملکت، محبوب المطالع پریس، دہلی، ۱۳۶۶ھ/۱۹۴۷ء، ص ۳۳۹-۳۴۴
- ۷۴ ابن ماجہ، ابواب الادب، باب حق الیتیم
- ۷۵ الصحیح البخاری، کتاب الادب، باب الساعی علی الارملہ
- ۷۶ الصحیح المسلم، کتاب البر والصلۃ والادب، باب فضل عیادۃ المریض
- ۷۷ تفسیر عثمانی مع ترجمہ شیخ الہند، ص ۲۷۹
- ۷۸ ابو محمد عبد الملک بن ہشام، السیرۃ النبویۃ، دار الفکر قاہرہ، ۱۹۵۵ء، ج ۴، ص ۱۲۵۴
- ۷۹ ایضاً، ج ۲، ص ۵۲۷-۵۳۰
- ۸۰ احمد بن یحییٰ بن جابر البلاذری، فتوح البلدان، (مترجم: سید ابوالخیر مودودی)، نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۲ء، ج ۱، ص ۱۰۶
- ۸۱ الصحیح البخاری، کتاب الجہاد، باب یقاتل عن اہل الذمہ
- ۸۲ الصحیح البخاری، کتاب الجہاد، باب اثم من قتل معاہدا بغير جرم
- ۸۳ ابن یوسف زبیلی، نصب الرایۃ، ج ۴، ص ۳۳۷
- ۸۴ ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی الوفاء لمعاہد وحرمة ذمتہ
- ۸۵ ابن جریر طبری، تفسیر ابن جریر طبری، ج ۱۰، ص ۱۲۶
- ۸۶ ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی الرسل
- ۸۷ محمد امین بن عابدین، رد المختار علی الدر المختار، مکتبہ زکریا، دیوبند، ۱۴۱۷ھ، ص ۲۱۱-۲۱۳
- ۸۸ ابن یوسف زبیلی، نصب الرایۃ، ج ۳، ص ۴۰۷
- ۸۹ ابو محمد عبد الملک بن ہشام، السیرۃ النبویۃ، ج ۲، ص ۶۸۶



حکیم و پیر و عالم و ستار و امام الحرمین و قنبر

لہ، خد



- آخری حصہ -

تو اسی کی خبر آ رہی تھی کہ جس نے کثرتِ نعمت اور رحمتِ نبی کی کم کر، اقبالات اچھل چکا اور

اس وقت تک آگہی نہ ہو کہ اس شخص کی زندگی میں کون سا کام ہو گا۔

[illegible]

۱۰: ستره ستره ستره ستره

کے تابع کر دیا اور خود کو ان حضرات کے حوالے کر دیا۔

ہادی اور رہبر کی ضرورت:

اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہر زمانہ میں ہر قوم کی ہدایت و رہنمائی کے لئے متعدد رسول اور نبی بھیجے، جنہوں نے گمراہی اور سرکشی کی سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی انسانیت کو ہدایت و رہنمائی کی روشنی بخشی۔ قرآن کریم کی متعدد آیتیں اس بات پر شاہد ہیں کہ ہر قوم کے لئے اللہ نے رسول اور نبی بھیجے۔ سورہ یونس میں ہے:

”وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَسُولٌ فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ“ (یونس: ۴۷)

(ہر امت کے لئے ایک رسول ہے، پھر جب کسی امت میں اس کا رسول ظاہر ہو گیا تو ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور ایسا نہیں ہوتا کہ بے انصافی ہو۔) دوسری جگہ ہے:

”إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ.“ (الرعد: ۷۱)

(آپ ان کے بد عملی کے نتائج سے خبردار کر دینے والے راہ نما ہیں اور ہر قوم کے لئے ایک راہ نما ہوا ہے۔)

ایک جگہ اور ارشاد ہوتا ہے:

”وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ.“ (النحل: ۳۶)

(ہم نے ہر امت میں کوئی نہ کوئی رسول ضرور پیدا کیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور سرکش قوموں سے بچو۔)

سورہ فاطر میں اللہ نے ارشاد فرمایا:

”إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ.“ (فاطر: ۲۴)

(ہم نے تجھے نیک عمل والوں کو خوش خبری دینے والا اور بد عمل والوں کو ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور کوئی قوم نہیں جس میں کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔)

ایک دوسرے مقام پر یہ بھی فرمایا گیا ہے:

”أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَالَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا اللَّهُ.“ (ابراہیم: ۹)

(کیا تم تک ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ مثلاً قوم نوح، قوم عاد، قوم

ثمود اور وہ قومیں جو ان کے بعد ہوئیں اور جن کا حال اللہ ہی کو معلوم ہے۔)

ان تمام آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم اور ہر علاقے میں نبی اور رسول بھیجے گئے تاہم تمام

انبیاء کا ذکر قرآن پاک میں موجود نہیں ہے، صرف چند کا ذکر ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:

”وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّن لَّمْ نَقْصُصْ

عَلَيْكَ.“ (المومن: ۷۸)

(اور اے پیغمبر ہم نے تم سے پہلے کتنے ہی رسول مبعوث کئے ہیں، ان میں سے کچھ ایسے ہیں

جن کے حالات تمہیں سنائے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن کے حالات تمہیں نہیں سنائے۔)

خلاصہ یہ ہے کہ مخلوق کا خالق سے رشتہ جوڑنے کے لئے، تاریکی سے روشنی کی طرف رہبری

کرنے کے لئے، درندگی سے انسانیت کی طرف بلانے کے لئے اور انسان کو معراج انسانیت سے روشناس

کرانے کے لئے ہر دور اور ہر زمانہ میں ایسے افراد کی ضرورت رہی ہے جو بندوں اور خدا کے درمیان پل کا

کام انجام دیں، خدا کا کلام بندوں تک پہنچانے کا ذریعہ بنیں اور پیغمبر خدا کی حیثیت سے گمراہ لوگوں کو راہ

راست پر لاسکیں اور انہیں ان کی زندگی کے مقصد اصلی سے واقف کرا سکیں۔

انبیاء کی بعثت کا مقصد:

اللہ کے رسولوں کی بعثت کا مقصد جیسا کہ ماقبل میں اس کی طرف ضمنی طور پر اشارہ کیا گیا، یہ ہے

کہ اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف بلایا جائے اور اسی مقصد کو بیان کرنے کے لئے قرآن مجید میں دعوت الی

اللہ کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کی بعثت کے مقصد کو بیان کرتے ہوئے کہا گیا:

”يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا. وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِآذِنِهِ

وَبِرَاجًا مُّنِيرًا.“ (الاحزاب: ۴۵-۴۶)

(اے نبی! ہم نے آپ کو شہادت دینے والا، خوش خبری دینے والا، ڈرانے والا اور اللہ کے حکم

سے اس کی طرف دعوت دینے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔)

یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو شاہد، مبشر، نذیر اور داعی الی اللہ کی حیثیت سے مبعوث فرمایا ہے اور آپ

کو ساری دنیا کے لئے سراج منیر بنایا گیا ہے۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ آپ اپنی (بلکہ ساری دنیا) سے کہئے:  
 ”فَقَرُّوا إِلَى اللَّهِ إِنِّي لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيرٌ مُّبِينٌ. وَلَا تَجْعَلُوا مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ إِنِّي لَكُمْ  
 مِّنْهُ نَذِيرٌ مُّبِينٌ.“ (الذاریات: ۵۰-۵۱)

(پس تم دوڑو اللہ کی طرف، بے شک میں تمہارے لئے اس کی جانب سے صاف صاف  
 ڈرانے والا ہوں اور اللہ کے ساتھ کسی کو معبود نہ ٹھہراؤ، بے شک میں تمہارے لئے اس کی  
 جانب سے صاف صاف ڈرانے والا ہوں۔)

اللہ کی طرف سے بلانے اور ڈرانے سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کی جائے، اس کی رحمت  
 تلاش کی جائے اور سارے جھوٹے خداؤں کو چھوڑ کر خدائے حقیقی کے دامن میں پناہ لی جائے اور توحید کی  
 راہ اختیار کی جائے۔

تمام جزئیات کو ملانے کے بعد جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ نے اپنے رسولوں کو اس لئے  
 بھیجا تا کہ وہ خدا کے بندوں کے سامنے توحید کا تصور پیش کریں اور انہیں ایک خدا کی عبادت اور بندگی پر  
 آمادہ کریں اور شرک والحاد اور طغیان و سرکشی سے انہیں دور رکھیں۔ رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا ہے:  
 ”قُلْ إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ وَلَا أُشْرِكَ بِهِ إِلَيْهِ أَدْعُو وَإِلَيْهِ مَآبٌ.“ (الرعد: ۳۶)  
 (کہہ دو کہ مجھے تو بس اس کا حکم ہوا ہے کہ اللہ کی عبادت کروں اور اس کے ساتھ شرک نہ  
 کروں۔ میں اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف مجھے پلٹ کر جانا ہے۔)

اس آیت میں توحید کی تعلیم دی گئی جس کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ عبادت اللہ کی ہو اور شرک سے  
 پاک ہو، کسی بھی فرد یا گروہ کو، کسی بھی مرئی یا غیر مرئی طاقت کو خدائی کا مقام نہ دیا جائے کہ اسے معبود سمجھا  
 جائے اور اس کی عبادت کی جائے۔

دعوت الی اللہ کے امتیازات:

ما قبل کی عبارتوں اور آیتوں سے یہ ثابت ہو گیا کہ انبیاء کی بعثت کا مقصد دعوت الی اللہ ہے جس کا  
 امتیاز یہ ہے کہ یہ ایک عالم گیر دعوت ہے اور اس کا خطاب دنیا کے تمام انسانوں سے ہے، چاہے ان کا تعلق  
 مشرق سے ہو یا مغرب سے، شمال سے ہو یا جنوب سے، اور ان کے درمیان رنگ و روپ، زبان اور نسل  
 کے کتنے ہی اختلافات کیوں نہ ہوں۔ قرآن مجید ہر فرد بشر کو اور نوع انسانی کے تمام افراد اور طبقات کو

بار بار آواز دیتا ہے کہ وہ اللہ واحد کی عبادت کریں، کیوں کہ وہی اس کا مستحق ہے:

”يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ.“ (البقرہ: ۲۱)

(اے لوگو! اپنے رب کی بندگی کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلے کے لوگوں کو پیدا کیا۔ توقع ہے کہ اس طرح تم خدا کے عذاب سے بچ جاؤ گے۔)

”يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ.“ (النساء: ۱)

(اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔)

”يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ. الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ. فِي أَيِّ صُورَةٍ مَا شَاءَ رَكَّبَكَ.“ (الانفطار: ۶-۸)

(اے انسان کس چیز نے تجھے اپنے رب کریم سے دھوکے میں ڈال رکھا ہے، جس نے تجھے پیدا کیا، تجھے ٹھیک کیا اور تیری ساخت میں اعتدال رکھا اور جس صورت میں چاہا ترتیب دے کر (تجھے بنایا۔)

دعوت الی اللہ کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ اس دعوت میں درحقیقت انسانوں کی خیر خواہی اور فلاح کی دعوت ہے۔ یہ ذاتی، خاندانی اور گروہی مفاد اور نام و نمود جیسے غلط جذبات سے، جن میں مادی تحریکوں کے علم بردار ملوث ہوتے ہیں، پاک ہوتی ہے۔ اللہ کے رسول اسی اخلاص اور بے غرضی کے ساتھ دعوت الی اللہ کا فرض انجام دیتے ہیں۔ قرآن میں رسول اکرم ﷺ کو خطاب کر کے کہا گیا:

”قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ.“ (الانعام: ۹۰)

(کہہ دو کہ میں اس پر تم سے کوئی اجر طلب نہیں کرتا ہوں۔ یہ تو بس سارے جہاں کے لئے نصیحت ہے۔)

اللہ کے جتنے رسول اس دنیا میں آئے سب ہی اخلاص کا نمونہ ہیں۔ وہ جب اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف بلاتے ہیں تو ان کی یہ دعوت بے غرض اور بے لوٹ ہوتی ہے اور کسی اجر کی طالب بھی نہیں ہوتی۔ جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو دعوت دی تو ان کی سرکشی اور انکار پر ارشاد فرمایا گیا:

”وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجِرِيَ إِلَّا عَلَى رَبِّ الْعَالَمِينَ.“ (الشعرا: ۱۰۹)

(میں تم سے کوئی اجر نہیں طلب کر رہا ہوں۔ میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔)

یہی بات حضرت ہوڈ، حضرت صالح، حضرت لوط اور حضرت شعیبؑ نے کہی۔ جیسا کہ سورہ شعرا کی متعدد آیتوں (۱۲۷، ۱۲۵، ۱۶۴، ۱۸۰) میں یہی مضمون بار بار دہرایا گیا ہے۔

دعوت الی اللہ کی تیسری خصوصیت اور امتیاز یہ ہے کہ یہ انسان کو تنگ نظری سے دور کرتی ہے، کیوں کہ انسان کی نظر محدود ہے، اس کے ساتھ فکر و عمل کی کمزوریاں ہیں، وہ ایک خاص دائرہ میں سوچتا ہے، اس کی بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ انسانوں کو گرد ہوں میں تقسیم کرا کے اپنے مفادات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ کبھی ایک فرد دوسرے فرد سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے اور کبھی ایک قوم دوسری قوم کا استحصال کرتی ہے۔ اسی سے کش مکش اور فتنہ و فساد کی راہیں کھلتی ہیں۔ دعوت الی اللہ مخلوق کو خالق کی عبادت و اطاعت کی دعوت ہے۔ یہ سب کے لئے ہے اور ہر ایک کی فلاح اس سے وابستہ ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اب تم ہی بتاؤ کہ اس سے بہتر کون سی دعوت ہے:

”وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ.“ (حم سجدہ: ۳۳)

(اس سے بہتر کس کی بات ہے جو اللہ کی طرف دعوت دے اور (اس کے مطابق) نیک عمل کرے اور کہے کہ میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔)

**دعوت الی اللہ کے مقاصد:**

دعوت الی اللہ کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ انسان کو ان کی پیدائش کے مقصد سے آگاہ کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ ان کی تخلیق کا مقصد خدا کی بندگی کرنا ہے:

”وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُون.“ (الذاریات: ۵۶)

(میں نے انسان اور جنات کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔)

انسان کو یہ بتایا جائے کہ خدا کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے اور خدا آئندہ اس کے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہے۔ یہ گویا انسان کو خدا سے متعارف کرانے کا ایک کام ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ خدا کے بارے میں انسان کی غفلت ٹوٹے اور وہ اپنی بندگی کا ادراک کر کے خدا کی طرف متوجہ ہو جائے۔ خدا کو پہچانے اور خدا کے مقابلے میں اپنے آپ کو عاجز تصور کرے۔ دعوت الی اللہ کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ انسان کے اندر سوئی ہوئی روح کو بیدار کیا جائے، بھٹکے ہوئے انسان کو خدا کی طرف جانے والے سیدھے

راستے پر کھڑا کیا جائے اور اس کی بصیرت کو روشنی فراہم کی جائے، تاکہ وہ کائنات کی نشانیوں میں خدا کے جلووں کو دیکھنے لگے۔

دعوت کا مقصد یہ بھی ہے کہ انسان براہ راست اپنے رب سے مربوط ہو جائے اور روحانی سطح پر خدا کا فیضان اس تک پہنچنے لگے۔ دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کی مخلوق بن جائے، وہ دنیا کی عظمتوں میں خدا کی عظمت دریافت کرے، وہ دنیا کی نعمتوں میں جنت کی نعمتوں کا تجربہ کرنے لگے، دنیا کی تکلیفیں اس کو جہنم کی تکلیف کی یاد دلائیں اور دنیا کے مناظر اس کو آخرت کی حقیقتوں کا مشاہدہ کرانے لگیں۔ یہی دعوت الی اللہ کا مقصد ہے اور اسی عظیم مقصد کو انجام دینے کے لئے اس کائنات میں اللہ نے بے شمار نبی اور رسول بھیجے۔

نبیوں کا سلسلہ منقطع ہو جانے کے بعد یہ عظیم مقصد آج بھی قائم ہے اور جس کی ذمہ داری نبی اکرم ﷺ کی امت پر ہے۔ ان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اللہ کے دین کو مکمل طور پر لوگوں کے سامنے پیش کریں اور زندگی کے تمام مسائل عقیدہ، عبادت، اخلاق، معاشرت، معیشت، تہذیب، قانون و سیاست غرض کہ ہر شعبہ حیات میں اس کی ہدایات واضح کریں۔ اس اہم ذمہ داری کو انجام دینے کے لئے ضروری ہے کہ دور حاضر کی فکری بنیادوں اور ان کی کمزوریوں سے آگاہی ہو، دین کا صحیح فہم، اس میں گہری بصیرت اور حالات پر اس کے انطباق کی صلاحیت ہو، تمام اصول و فروع کو مکمل دلائل و براہین کے ساتھ بہترین اسلوب میں پیش کیا جائے اور اس پورے عمل میں حکمت و دانائی اور اخلاص و للہیت پائی جائے۔ اسی سے دعوت الی اللہ کے تقاضے پورے ہوں گے، اس کا حق ادا ہوگا اور کامیابی کی راہیں کھلیں گی۔

اس اہم فریضے کو انجام دینے کے لئے ہمارے سامنے انبیاء کرام کا طریقہ کار بہترین نمونہ اور اسوہ ہے۔ ہم اس سے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ کس طریقے اور نہج پر انبیاء کرام نے گمراہ لوگوں کا رشتہ اللہ سے استوار کیا۔ کس طرح سیکڑوں معبودان باطل کے سامنے سر جھکانے کے بجائے ایک اللہ کے سامنے سر بہ سجود ہونے کے لئے ان کو آمادہ کیا۔ اس مقصد کو انجام دینے میں طرح طرح کے مصائب و مشکلات کا کس طرح سامنا کیا اور دعوت و تبلیغ کے لئے کس طرح کی زبان استعمال کی اور کس طرح انہوں نے اسلامی طرز حیات کو اپنانے پر لوگوں کو راضی کیا۔

## دعوت الی اللہ کے پیغمبرانہ آداب:

دعوت الی اللہ دراصل انبیاء کا منصب اور ذمہ داری ہے۔ امت کے علما اس منصب کو ان کے نائب ہونے کی حیثیت سے استعمال کرتے ہیں، تو لازم ہے کہ اس کے آداب اور طریقے بھی انہیں سے سیکھیں اور اسی کے مطابق لوگوں کو اللہ کی طرف بلائیں، کیوں کہ اگر انبیاء کے طریقوں کو چھوڑ کر دعوت دی جائے گی تو ممکن ہے کہ وہ دعوت عداوت اور جنگ و جدال کا موجب بن جائے۔ پیغمبرانہ دعوت کے اصول میں جو ہدایت قرآن کریم میں حضرت موسیٰ و حضرت ہارون کے لئے نقل کی گئی ہے کہ:

”فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيْنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَحْشَىٰ.“ (طہ: ۴۴)

یعنی فرعون سے نرم بات کرو شاید وہ سمجھ لے یا ڈر جائے۔

اس فرمان الہی سے بنیادی طور پر ایک داعی کے لئے یہ ہدایت ہے کہ وہ دعوت کے وقت اپنی بات کو نرم رکھے اور سخت بات نہ کرے، کیوں کہ ماقبل میں مذکورہ آیت کریمہ میں اس فرعون کے لئے نرم بات کرنے کی ہدایت دی جا رہی ہے جس کی موت بھی علم الہی میں کفر ہی پر ہونے والی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ حضرت ہارون اور حضرت موسیٰ کو نرم گفتاری کی ہدایت کے ساتھ بھیجتے ہیں۔ آج ہم جن لوگوں کو اللہ کی طرف بلا رہے ہیں وہ فرعون سے زیادہ گمراہ ہیں اور نہ ہی فرعون سے زیادہ سرکش اور ہم میں سے کوئی حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون جیسا داعی بھی نہیں، تو جو حق اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو نہیں دیا کہ وہ مخاطب سے سخت کلامی کریں۔ اس پر فقرے کہیں اور اس کی توہین کریں، وہ حق ہمیں کہاں سے حاصل ہو گیا۔ قرآن کریم انبیاء کی دعوت و تبلیغ اور کفار کے مجادلات سے بھرا ہوا ہے، اس میں کہیں نظر نہیں آتا کہ کسی رسول نے حق کے خلاف طعنہ زنی کرنے والوں کے جواب میں کوئی سخت اور ثقیل کلمہ بھی بولا ہو۔

سورہ اعراف میں دو مشہور پیغمبروں کا واقعہ مذکور ہے۔ ایک حضرت نوح علیہ السلام جو اللہ کے اولوالعزم پیغمبروں میں سے ہیں، جن کی طول عمر دنیا بھر میں مشہور ہے۔ وہ ساڑھے نو سو برس تک اپنی قوم کی دعوت و تبلیغ اور اصلاح و ایثار میں دن رات مشغول رہے، مگر اس بد بخت قوم میں چند لوگوں کو چھوڑ کر کسی نے بھی ان کی بات نہ مانی، حتیٰ کہ خود ان کا ایک لڑکا اور بیوی بھی کافروں کے ساتھ لگے رہے۔ وہ اپنی جہد مسلسل کے باوجود کامیابی نہ ملنے پر سخت جملہ استعمال نہیں کرتے ہیں، بلکہ عاجزانہ طریقے پر اپنی قوم سے



کہتے ہیں:

”يَقَوْمَ لَيْسَ بِي ضَلَالَةٌ وَلَكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ.“ (الاعراف: ۶۱)

(میرے بھائیوں مجھ میں کوئی گمراہی نہیں ہے، میں تو رب العالمین کا رسول اور قاصد ہوں۔)

دوسرے حضرت ہود علیہ السلام بھی بڑے پیغمبروں میں سے ہیں۔ ان کی قوم نے معجزات دیکھنے

کے بعد بھی جب ایمان قبول نہیں کیا تو حضرت ہود نے فرمایا:

”إِنِّي أَشْهَدُ اللَّهَ وَ أَشْهَدُ وَأَنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ.“ (ہود: ۵۴)

(میں گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں ان بتوں سے بری اور بیزار ہوں جن کو تم اللہ کا

شریک مانتے ہو۔)

قرآن مجید میں دوسری جگہ ہے کہ ان کی قوم نے ان سے کہا کہ ہم تو آپ کو بیوقوفی میں مبتلا سمجھتے

ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ آپ جھوٹ بولنے والوں میں سے ہیں۔ ”أَنَا لَنَسْرِكُ فِي سَفَاهَةٍ وَأَنَا

لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَذِبِيِّنَ.“ (الاعراف: ۶۶) قوم کے اس دل آزار جواب میں اللہ کے رسول حضرت ہودؑ

نہ ان پر کوئی فقرہ کستے ہیں اور نہ ہی سخت جملہ استعمال کرتے ہیں، بلکہ ان کے الزام کی تردید کرتے ہوئے

کہتے ہیں:

”يَقَوْمَ لَيْسَ بِي سَفَاهَةٌ وَلَكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ.“ (الاعراف: ۶۱)

(اے میری برادری کے لوگوں مجھ میں کوئی بیوقوفی یا کم عقلی نہیں ہے، میں تو رب العالمین کا

رسول ہوں۔)

حضرت شعیب علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو اللہ کی طرف بلایا اور ناپ تول میں کمی کرنے کا جو

عیب ان میں تھا اس سے باز آنے کی ہدایت فرمائی، تو ان کی قوم نے تمسخر کیا، ان کا مذاق اڑایا اور توہین

آمیز انداز میں ان کو خطاب کیا:

”قَالُوا يَا شُعَيْبُ أَصْلَاتُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ نَتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَنْ نَفْعَلَ فِي

أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ إِنَّكَ لَأَنْتَ الْحَلِيمُ الرَّشِيدُ“ (ہود: ۸۷)

(اے شعیب کیا تمہاری نمازیں یہ حکم دیتی ہیں کہ ہم اپنے باپ دادا کے معبودوں کو چھوڑ دیں

اور یہ کہ جن اموال کے ہم مالک ہیں ان میں اپنی مرضی کے موافق جو چاہیں نہ کریں، واقعی

آپ ہیں بڑے عقلمند، دین پر چلنے والے۔)

انہوں نے ایک تو یہ طعنہ دیا کہ تم جو نماز پڑھتے ہو، یہی تمہیں بیوقوفی کے کام سکھاتی ہے، دوسرے یہ کہ یہ مال ہمارے ہیں، ان کی خرید و فروخت کے معاملات میں تمہارا یا تمہارے خدا کا کیا عمل دخل ہے۔ ہم جس طرح چاہیں ان میں تصرف کا حق رکھتے ہیں۔ تیسرا جملہ تمسخر و استہزا کا یہ کہا کہ آپ ہیں بڑے عقلمند، بہت دین پر چلنے والے۔ لیکن اس ظالم قوم کے اس تمسخرے پن اور دل آزار گفتگو کا جواب حضرت شعیب نے برگشتہ ہو کر نہیں دیا، بلکہ نہایت بردباری سے یہ کہا:

”قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْ رَبِّي وَرَزَقْنِي مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا وَمَا أُرِيدُ أَنْ أَمْلِكُمْ إِلَىٰ مَا أَنَّهُكُمْ عَنْهُ إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ.“ (ہود: ۸۸)

(اے میری قوم بھلا یہ تو بتاؤ کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے دلیل پر قائم ہوں اور اس نے مجھ کو اپنی طرف سے عمدہ دولت نبوت دی تو پھر کیسے میں اس کی تبلیغ نہ کروں اور میں خود بھی اس کے خلاف عمل نہیں کرتا، جو تمہیں بلاتا ہوں، میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں، جہاں تک میری قدرت میں ہے اور مجھ کو جو اصلاح اور عمل کی توفیق ہو جاتی ہے وہ صرف اللہ ہی کی مدد سے ہے، میں صرف اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور تمام امور میں اس کی طرف رجوع کرتا ہوں۔)

اسی طرح جیسا کہ ماقبل میں گذرا کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کو نرم بات کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس ہدایت کی تکمیل کرنے کے باوجود فرعون کا حضرت موسیٰ سے یہ خطاب تھا:

”قَالَ أَلَمْ نُرَبِّكَ فِينَا وَلِيدًا وَلَبِثْتَ فِينَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِينَ. وَفَعَلْتَ فَعَلْتِكَ الَّتِي فَعَلْتَ وَأَنْتَ مِنَ الْكَافِرِينَ.“ (شعراء: ۱۸-۱۹)

(فرعون کہنے لگا کیا ہم نے بچپن میں تمہاری پرورش نہیں کی اور تم اس عمر میں برسوں ہمارے پاس رہے اور تم نے اپنی وہ حرکت بھی کی تھی جو کی تھی (یعنی قطبی کو قتل کیا تھا) اور بڑے ناشکرے ہو۔)

فرعون نے حضرت موسیٰ پر اپنا یہ احسان بتلایا کہ بچپن میں ہم نے تجھے پالا، پھر یہ احسان بتلایا کہ بڑے ہونے کے بعد بھی کافی مدت تک ہمارے پاس رہے۔ پھر حضرت موسیٰ کے ہاتھ سے جو ایک قطبی بغیر ارادہ قتل کے مارا گیا تھا، اس پر غصہ و ناراضگی کا اظہار کر کے یہ بھی کہا کہ تم ناشکروں میں سے

ہو گئے۔ حضرت موسیٰ کا جواب دیکھئے جو پیغمبرانہ آداب دعوت اور پیغمبرانہ اخلاق کا شاہ کار ہے، کہ اس میں سب سے پہلے تو اس کم زوری اور کوتاہی کا اعتراف کر لیا جو ان سے سرزد ہو گئی تھی، یعنی انہوں نے ایک اسرائیلی سے لڑنے والے قطبی کو ہٹانے کے لئے اس کو مکارا تھا جس سے وہ مر گیا، تو گویا یہ قتل عداوت نہیں تھا مگر کوئی دینی تقاضہ بھی نہیں تھا، بلکہ شریعت موسوی کے لحاظ سے بھی وہ شخص قتل کا مستحق نہیں تھا، اس لئے پہلے یہ اعتراف فرمایا:

”فَعَلْتُهَا إِذَا وَأَنَا مِنَ الضَّالِّينَ.“ (شعرا: ۲۰)

(یعنی میں نے یہ کام اس وقت کیا تھا، جب کہ میں نادان تھا۔)

مراد یہ ہے کہ یہ فعل عطاء نبوت سے پہلے سرزد ہو گیا تھا، جب کہ مجھے اس کے بارے میں اللہ کا کوئی حکم معلوم نہیں تھا۔ اس کے بعد فرمایا:

”فَقَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِي رَبِّي حُكْمًا وَجَعَلَنِي مِنَ

الْمُرْسَلِينَ.“ (شعرا: ۲۱)

(پھر مجھ کو تم سے ڈر لگا تو میں تمہارے یہاں سے مفرور ہو گیا، پھر مجھ کو میرے رب نے

دانشمندی عطا فرمائی اور مجھ کو اپنے پیغمبروں میں شامل کر دیا۔)

پھر اس کے احسان جتلانے کا یہ جواب دیا کہ تمہارا یہ احسان جتنا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ میری پرورش کا معاملہ تمہارے ہی ظلم وعدوان کا نتیجہ تھا کہ تم نے اسرائیلی بچوں کے قتل کا حکم دے رکھا تھا، اس لئے والدہ نے مجبور ہو کر مجھے دریا میں ڈالا اور تمہارے گھر تک پہنچنے کی نوبت آئی۔ فرمایا:

”وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ.“ (شعرا: ۲۲)

(وہ نعمت ہے جس کا تو مجھ پر احسان رکھتا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو سخت ذلت میں ڈال

رکھا تھا۔)

اس کے بعد فرعون نے سوال کیا ”وَمَا رَبُّ الْعَالَمِينَ.“ یعنی تمام جہانوں کا پالنے والا کون ہے اور

کیا ہے؟ تو جواب میں فرمایا کہ وہ رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان سب کا۔

اس پر فرعون نے بطور استہزا کے حاضرین سے کہا کہ: ”أَلَا تَسْتَمِعُونَ“ یعنی تم سن رہے ہو یہ کیسی بے عقلی

کی باتیں کہہ رہے ہیں۔ اس پر موسیٰ نے کہا: رَبُّكُمْ وَرَبُّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ۔ یعنی تمہارا اور تمہارے باپ

دادا کا بھی وہی رب ہے۔ اس پر فرعون نے جھنجھلا کر کہا: اِنَّ رَّسُوْلَ لَّكُمْ الَّذِیْ اَرْسَلَ اِلَیْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ۔ یعنی یہ جو تمہاری طرف اللہ کے رسول ہونے کا مدعی ہے وہ دیوانہ ہے۔ مجنون، دیوانہ کا خطاب دینے پر بھی موسیٰ نے بجائے اس کے کہ ان کا دیوانہ نہ ہونا اور عاقل ہونا ثابت کرتے، اس طرف کوئی التفات ہی نہیں کیا، بلکہ اللہ کی ایک اور صفت بیان کر دی:

”رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ“ (شعراء: ۲۸)

(یعنی وہ رب ہے مشرق و مغرب کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اگر تم کو کچھ عقل ہو۔)

یہ ایک طویل مکالمہ ہے جو فرعون کے دربار میں حضرت موسیٰ اور فرعون کے درمیان ہو رہا ہے۔ جو سورہ شعراء کے تین رکوع میں بیان ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ کے اس مکالمہ کو اول سے آخر تک دیکھئے نہ کہیں جذبات کا اظہار ہے، نہ فرعون کی بدگوئی کا جواب ہے، نہ اس کی سخت کلامی کے جواب میں کوئی سخت کلمہ ہے، بلکہ مسلسل اللہ جل شانہ کی صفات کمالیہ کا بیان ہے اور تبلیغ کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ مختصر سا نمونہ ہے انبیاء علیہم السلام کے مجادلات کا جو اپنے معاند اور ضدی قوم کے مقابلے میں کئے گئے ہیں اور وجہ اللہم بالتی ہی احسن جو قرآن کی تعلیم ہے اس کی عملی تشریح ہیں۔ مجادلات کے علاوہ دعوت و تبلیغ میں ہر مخاطب اور ہر موقع کے مناسب کلام کرنے میں حکیمانہ اصول اور حکمت و مصلحت کی رعایتیں بھی جو انبیاء نے اختیار فرمائی ہیں اور دعوت الی اللہ کو مقبول و موثر بنانے کے لئے جو طرز عمل اختیار فرمایا ہے وہی دراصل دعوت کی روح ہے۔

دعوت میں مخاطب پر بے جا بار نہ ڈالنا:

پیغمبرانہ آداب دعوت میں جہاں ہمیں تحمل اور بردباری کی تفصیلات ملتی ہیں وہیں ہمیں انبیاء کا یہ طرز بھی نظر آتا ہے کہ وہ دعوت و تبلیغ میں اسی بات کا لحاظ رکھتے تھے کہ وہ اتنی طویل اور پیچیدہ نہ ہو جو مخاطب کے لئے بار کا باعث ہو۔ خود نبی اکرم ﷺ کو اس بات کا بڑا لحاظ رہتا تھا کہ دعوت و تبلیغ میں مخاطب پر بار نہ ہونے پائے۔ صحابہ کرامؓ جیسے عشاق رسول جن سے کسی بھی وقت اس بات کا احتمال نہ تھا کہ وہ آپؐ کی باتیں سننے سے اکتا جائیں گے، ان کے لئے بھی آپ ﷺ کی عادت یہ تھی کہ وعظ و نصیحت روزانہ نہیں بلکہ ہفتہ کے بعض دنوں میں فرماتے تھے، تاکہ لوگوں کے کاروبار کا حرج اور ان کی طبیعت پر بار نہ ہو۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ ہفتہ کے بعض ایام میں ہی وعظ فرماتے

تھے، تاکہ ہم اکتانہ جائیں اور دوسروں کو بھی آپ کی طرف سے یہی ہدایت تھی:

”عن ابن مسعود قال كان النبي صلى الله عليه وسلم يتخولنا بالموعظة في

الايام كراهة السامة علينا.“۱

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

”يسروا ولا تعسروا وبشروا ولا تنفروا.“۲

(لوگوں پر آسانی کرو دشواری نہ پیدا کرو اور ان کو اللہ کی رحمت کی خوش خبری سناؤ، مایوس یا

متنفّر نہ کرو۔)

عصر حاضر میں دعوت و تبلیغ کا اثر کم ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ عموماً اس کے کرنے والے اصول و آداب کی رعایت نہیں کرتے، لمبی تقریریں بے وقت کی نصیحت، مخاطب کے حالات معلوم کئے بغیر اس کو کسی کام پر مجبور کرنا ان کی عادت بن گئی ہے۔

براہ راست تنبیہ سے صرف نظر:

انبیاء کی دعوت کا ایک اصول یہ بھی تھا کہ مخاطب کو شرمندگی سے بچاتے تھے۔ اسی لئے بعض اوقات جو کام مخاطب سے سرزد ہوا ہے اس کو اپنی طرف منسوب کر کے اصلاح کی کوشش فرماتے۔ سورہ یسین میں ہے:

”وَمَا لِيَ لَا أَعْبُدُ الَّذِي فَطَرَنِي.“ (یسین: ۲۲)

(یعنی مجھے کیا ہو گیا کہ میں اپنے پیدا کرنے والے کی عبادت نہ کروں۔)

ظاہر ہے کہ یہ قاصد رسول تو ہر وقت عبادت میں مشغول رہتے تھے، سنانا اس مخاطب کو مقصود تھا، جو مشغول عبادت نہیں ہے۔

نبی کریم ﷺ کی دعوت و اصلاح کے کام میں اس کا بھی بڑا اہتمام تھا کہ مخاطب کی سبکی یا رسوائی نہ ہو، اس لئے جب کسی شخص کو دیکھتے کہ وہ کسی غلط اور برے کام میں مبتلا ہے تو براہ راست اسے خطاب کرنے کے بجائے مجمع عام کو مخاطب کر کے فرماتے: ”مَا بَالُ أَقْوَامٍ يَفْعَلُونَ كَذَا.“ (لوگوں کو کیا ہو گیا کہ فلاں کام کرتے ہیں۔) اس عام خطاب میں جس کو سنانا اصل مقصود ہوتا وہ بھی سن لیتا اور دل میں شرمندہ ہو کر اس کے چھوڑنے کی فکر میں لگ جاتا۔

## عقلی دلائل کا سہارا:

انبیاء کی دعوت الی اللہ کا خاص امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنی قوم کی گمراہیوں اور ضلالت کو عقلی دلائل سے ثابت کرتے تھے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو بتوں کی پوجا کرتے ہوئے دیکھا تھا تو ان سے پوچھا کہ تم لوگ کس کی پوجا کرتے ہو؟ انہوں نے کہا: ”ہم بتوں کی پوجا کرتے ہیں اور ان کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔“ ابراہیم نے کہا: ”کیا یہ تمہاری بات سنتے ہیں، جب تم ان کو بلاتے ہو؟ کیا یہ تمہیں نقصان دیتے ہیں؟“ وہ کہنے لگے: ”کچھ بھی نہیں بس ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایسا کرتے دیکھا ہے۔“ ابراہیم کہنے لگے:

”قَالُوا نَعْبُدُ أَصْنَامًا فَنَظِلُّ لَهَا عَاكِفِينَ . قَالَ هَلْ يَسْمَعُونَكُمُ إِذْ تَدْعُونَ . أَوْ يَنْفَعُونَكُمُ أَوْ يَضُرُّونَ . قَالُوا بَلْ وَجَدْنَا آبَاءَنَا كَذَلِكَ يَفْعَلُونَ . قَالَ أَفَرَأَيْتُمْ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُونَ . أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ الْأَقْدَمُونَ . فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّي إِلَّا رَبَّ الْعَالَمِينَ . الَّذِي خَلَقَنِي فَهُوَ يَهْدِينِ . وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِ . وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ . وَالَّذِي يُمِيتُنِي ثُمَّ يُحْيِينِ . وَالَّذِي أَطْمَعُ أَنْ يَغْفِرَ لِي خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ .“ (شعراء: ۷۱-۸۲)

(پھر سن لو کہ جس کی تم یا تمہارے آباؤ اجداد پوجا کرتے رہے ہیں یہ سب میرے دشمن ہیں سوائے اس ذات کے جو تمام دنیا کا پالن ہار ہے، جس نے مجھے پیدا کیا اور میری رہنمائی کرتا رہتا ہے، جو مجھے کھلاتا پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو مجھے شفا دیتا ہے، جو مجھے موت دے گا پھر زندگی دے گا اور جس سے مجھے توقع ہے کہ قیامت کے دن میرے گناہ معاف کرے گا۔)

ان آیتوں میں واضح طور پر حضرت ابراہیم کی قوم کی گمراہیوں پر عقلی دلیل موجود ہے کہ جن بتوں کی وہ عبادت کرتے ہیں وہ نفع و نقصان پہنچانے پر قادر نہیں، پھر بھلا وہ معبود کس طرح ہو سکتے ہیں۔ معبود تو وہ ہوتا ہے جو سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرے، جو کھانا کھلائے، جو زندگی اور موت دے اور روز جزا میں اپنی شان عفو دکھاتے ہوئے تمام گناہوں کو بخش دے اور وہ صرف ایک ذات اللہ کی ہے جو تمام جہانوں کا پالن ہار ہے۔

اسی طرح حضرت صالح علیہ السلام کی قوم بہت سرکش تھی۔ یہ لوگ فن تعمیر میں ملکہ رکھتے تھے اور بڑے اونچے اونچے محل بناتے تھے اور پہاڑوں کو تراش کر خوب صورت گھر بناتے تھے اور خود پر فخر و غرور کرتے تھے۔ جب حضرت صالح علیہ السلام نے اپنے رسول ہونے کی بات کہی اور انہیں اللہ سے ڈرایا، نیز انہیں یہ بتلایا کہ جن محلوں اور باغات پر تم اتراتے ہو اس میں ہمیشہ نہیں رہنا ہے اور یہ حقیقت تمہارے سامنے ہے۔ قرآن میں ہے:

”كَذَّبَتْ ثَمُودُ الْمُرْسَلِينَ. إِذْ قَالَ لَهُمُ أَخُوهُمْ صَالِحٌ أَلا تَتَّقُونَ. إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ. فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا. وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى رَبِّ الْعَالَمِينَ. أَتَتْرَكُونَ فِي مَا هَاهُنَا آمِنِينَ. فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ. وَزُرُوعٍ وَنَخْلٍ طَلُوعُهَا هَضْبٌ. وَتَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا فَارِهِينَ. فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا. وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ. الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ.“ (شعراء: ۱۴۱-۱۵۲)

(ثمود نے پیغمبروں کو جھٹلایا جب ان سے ان کے بھائی (ہم نسب) صالح نے کہا: کیا تم اللہ سے نہیں ڈرتے؟ بلاشبہ میں تمہاری طرف امانت دار اور پیغمبر ہوں۔ اس لئے اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس تبلیغ کے سلسلے میں تم سے کسی اجر کا طلب گار نہیں۔ میرا اجر تو اللہ رب العالمین کے ذمہ ہے۔ کیا تم یہاں ہمیشہ کے لئے امن و امان کے ساتھ رہو گے؟ ان باغوں اور چشموں میں، ان کھیتوں اور نخلستانوں میں جن کے خوشے ٹوٹے پڑے ہیں (یعنی رس بھرے ہیں) تم بلا ضرورت تکلف کرتے ہوئے، پہاڑوں کو تراش کر گھر بنا لیتے ہو۔ اللہ سے ڈرو اور میرے پیچھے لگو۔ ان ظالموں کی بات نہ مانو جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔)

ثمودیتوں کی پوجا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف حضرت صالح علیہ السلام کو پیغمبر اور واعظ بنا کر بھیجا۔ ان کا معجزہ وہ اونٹنی تھی جو ان کے سامنے پتھر سے نکلی تھی۔ جب قوم ثمود نے اس اونٹنی کو قتل کر دیا تو انہیں ایک کڑک دار آواز کے ساتھ ہلاک کر دیا گیا۔ حضرت صالح اور ان پر ایمان لانے والے بچ گئے، جو قوم کی ہلاکت کے بعد فلسطین کے علاقے رملہ میں چلے گئے۔ یہ قوی ترین قول ہے کیوں کہ ان کے قریب یہی زرخیز علاقہ تھا۔ عرب لوگ اپنے جانوروں کو چرانے کی خاطر گھاس اور پانی کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ ۳

## مشکل حالات میں دعوت:

انبیاء علیہم السلام دعوت حق کا فریضہ انجام دینے میں ان مصائب کی فکر نہیں کرتے تھے جن میں وہ گھرے ہوتے تھے، بلکہ وہ موقع غنیمت جان کر فوراً حق کی تبلیغ شروع کر دیتے تھے، جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام جو عزیز مصر کے قیدی تھے، قید خانہ کی زندگی میں بھی دعوت حق کا داعیہ ان کے قلب مبارک میں اٹھا، اس وقت تک انہوں نے مصر میں دین حق کی تبلیغ نہیں کی تھی، اگرچہ خود اس پر قائم تھے۔ لیکن اب وقت آ گیا تھا کہ خاندانی نبوت کا ان میں ظہور ہو، لیکن اب سوال یہ تھا کہ ان کی تبلیغ کا مخاطب کون ہو۔ آخر کار قید خانہ کے ساتھیوں کی شکل میں ان کے مخاطب مل گئے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی رہائی کا انتظار نہیں کیا اور انہی قیدیوں میں تبلیغ حق شروع کر دی اور اب مصر کا قید خانہ دعوت حق کی تعلیم و تربیت کا مرکز بن گیا۔

اسی قید خانے میں دو نئے قیدی آتے ہیں جو بادشاہ کے خاص خدمت گاروں میں سے تھے۔ وہ اپنا خواب بیان کرتے ہیں۔ خواب سن کر حضرت یوسف علیہ السلام معلوم کر لیتے ہیں کہ ایک کی رہائی قریب ہے۔ دوسرے کی موت قریب ہے۔ لیکن انہوں نے خواب سن کر فوراً اس کی تعبیر نہیں بتلائی بلکہ ان کی توجہ اور رجوع سے فائدہ اٹھا کر تبلیغ حق اشارتاً شروع کر دی اور فرمایا:

”إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ.“ (یوسف: ۳۷)

(میں نے ان لوگوں کی ملت ترک کی جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے بھی منکر ہیں۔)

مولانا ابوالکلام آزاد حضرت یوسف علیہ السلام کے اس کردار کے بارے میں لکھتے ہیں:

”ان کی سیرت کے اس مقام سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ دعوت حق کا فریضہ کیوں کر ادا ہونا

چاہیے اور داعی حق کے جوش و طلب دعوت کا کیا حال ہوتا ہے؟ قید خانے کی زندگی بھی ادائے

فرض دعوت سے مانع نہ ہوئی۔ اس حالت میں بھی فکر اس کی نہ تھی کہ کیوں کر قید سے رہائی

پاؤں، بلکہ تمام تر اس کی تھی کہ خدا کے بندے جہل و گمراہی سے کیوں کر نجات پائیں۔“

یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام قید و صعوبت کی مصیبت میں گرفتار

ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ دعوت الی الحق کے فریضہ کو انجام دینے میں کوتاہی نہیں برت رہے ہیں، بلکہ

ناموافق اور نامساعد حالات کو بھی اپنے لئے موافق بنا رہے ہیں اور ماحول کو سازگار بنانے کی کوشش



کر رہے ہیں اور بالواسطہ ایمان باللہ اور آخرت پر یقین کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔ مزید برآں انہوں نے بات سے بات نکالتے ہوئے دعوت کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے کہا:

”يَا صَاحِبِي السَّجْنِ أَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ.“ (یوسف: ۳۹)

(اے یارانِ مجلس! جدا جدا معبودوں کا ہونا بہتر ہے یا صرف اللہ کا جو یگانہ اور سب پر غالب ہے؟)

عفو و درگزر انبیاء کا اہم وصف:

انبیاء کرام کی دعوتی زندگی کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ وہ سراپا رافت و محبت کے پیکر تھے اور لوگوں کی تنگ نظری کا جواب عفو و درگزر کے ذریعہ دیا کرتے تھے، جیسا کہ قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس پہلو کو جا بجا نمایاں کیا گیا ہے کہ وہ رحمت و محبت کے پیامبر تھے چنانچہ یہودیوں کی اخلاقی خشونت و قساوت کے مقابلے میں مسیحی اخلاق کی رقت و رافت کی بار بار مدح کی گئی ہے۔ قرآن میں ہے:

”وَلَنَجْعَلَنَّ آيَةً لِلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِنَّا وَكَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا.“ (مریم: ۲۱)

(اور تاکہ ہم اس کو (یعنی مسیح کے ظہور کو) لوگوں کے لیے ایک الہی نشان اور اپنی رحمت کا فیضان بنائیں اور یہ بات مشیت الہی میں طے شدہ تھی۔)  
دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا:

”وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً.“ (حدید: ۲۷)

(اور ان لوگوں کے دلوں میں جنہوں نے (مسیح کی پیروی کی) ہم نے شفقت و رحمت ڈال دی۔)  
مولانا ابوالکلام آزاد حضرت مسیح اور بعثت کے وقت کے احوال اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

”حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور ایسے عہد میں ہوا جب کہ یہودیوں کا اخلاقی تنزل انتہائی حد تک پہنچ چکا تھا۔ دل کی نیکی اور اخلاق کی پاکیزگی کی جگہ ظاہری احکام و رسوم کی پرستش، دینداری اور خدا پرستی سمجھی جاتی تھی۔ یہودیوں کے علاوہ جس قدر متمدن قومیں قرب و جوار میں تھیں مثلاً رومی، مصری، آشوری وہ بھی انسانی رحم و محبت کی روح سے یکسر نا آشنا تھیں۔ لوگوں نے یہ بات معلوم تو کر لی کہ مجرموں کو سزائیں ملنی چاہئیں، لیکن اس حقیقت سے بے بہرہ تھے کہ رحم و محبت اور عفو و بخشش کی چارہ سازیوں سے مجرموں اور گناہوں کی پیدائش روک دینی چاہیے۔ انسانی قتل و ہلاکت کا تماشہ دیکھنا، طرح طرح کے ہولناک

طریقوں سے مجرموں کو ہلاک کرنا، زندہ انسانوں کو درندوں کے سامنے ڈال دینا، آباد شہروں کو بلاوجہ جلا کر خاکستر کر دینا، اپنی قوم کے تمام انسانوں کو غلام سمجھنا اور غلام بنا کر رکھنا، رحم و محبت اور حلم و شفقت کی جگہ قلبی قساوت و بے رحمی پر فخر کرنا، رومی تمدن کا اخلاق اور مصری و آشوری دیوتاؤں کا پسندیدہ طریقہ تھا۔ ضرورت تھی کہ نوع انسانی کی ہدایت کے لئے ایک ایسی ہستی مبعوث ہو، جو سرتاپا رحمت و محبت کا پیام ہو اور جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں سے قطع نظر کر کے صرف اس کی قلبی و معنوی حالت کی اصلاح و تزکیہ پر اپنی تمام پیغمبرانہ ہمت مبذول کر دے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کی شخصیت میں وہ ہستی نمودار ہو گئی۔ اس نے جسم کی جگہ روح پر، زبان کی جگہ دل پر اور ظاہر کی جگہ باطن پر نوع انسانی کو توجہ دلائی اور انسانیت اعلیٰ کا فروموش شدہ سبق تازہ کر دیا۔“ ۵

حضرت مسیح علیہ السلام کے اس طرز عمل میں داعی کے لئے پیغام ہے کہ سختی کی جگہ نرمی اور قساوت کی جگہ شفقت اور ظلم و جور کی جگہ عفو و درگزر کے ذریعے قلوب کو مسخر کیا جاسکتا ہے اور اللہ کا پیغام اللہ کے بندوں تک پہنچایا جاسکتا ہے۔

محمد عربیؐ صلی اللہ علیہ وسلم:

یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ دین کی دعوت اور اس کے تعارف کا صحیح طریقہ وہی ہے جو انبیاء کرام علیہم السلام نے اختیار فرمایا۔ ضرورت ہے کہ ہادی عالم ﷺ کے پیغامات کو تمام بنی نوع انسان تک پہنچایا جائے، بھٹکی ہوئی انسانیت کو راہ راست پر لانے کے لئے اور اس کا رشتہ معبود حقیقی سے جوڑنے کے لئے ان تمام طریقے اور تدابیر کو بروئے کار لایا جائے جن کے ذریعے انبیاء نے سماج اور معاشرہ میں انقلاب برپا کیا۔ غیر مسلموں کو اسلام سے روشناس کرانے، مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات میں استواری پیدا کرنے کے لئے خاص طور پر خاتم النبیین محمد ﷺ کے ان پیغامات کا مطالعہ نہایت ضروری ہے جو آپؐ نے خطوط کی شکل میں اس وقت کے ممتاز لوگوں کے نام ارسال فرمائے تھے۔ آپؐ نے ہر قلم شاہ روم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

”يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا

اللَّهَ“۔ (آل عمران: ۶۴)

(اے اہل کتاب! اس کلمہ کی طرف جلدی سے آ جاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے، یعنی یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے۔)

آپ ﷺ نے اس خط میں پہلے آپس کا ایک مشترک نقطہ وحدت ذکر کیا کہ توحید کا عقیدہ ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے، اس کے بعد عیسائیوں کی غلطی پر تنبیہ فرمائی۔

اسی طرح دوسرے لوگوں کو بھی آپ نے نہایت معتدل انداز میں خطوط ارسال فرمائے۔ ان خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے دنیا میں کس طرح کا ذہنی، فکری اور عملی انقلاب برپا کیا اور انسانیت کے لئے کیا کیا اصول وضع کئے۔ تمدن اور معاشرت کو کن راہوں پر ڈالا اور انسانیت کے فطری تقاضوں کی کس حد تک تکمیل فرمائی۔ اس تعلیم کی بدولت دنیا کی سب سے زیادہ جاہل اور پس ماندہ قوم، علمی اور روحانی، سیاسی اور اخلاقی اعتبار سے سب سے زیادہ مہذب متمدن اور شائستہ قوم بن گئی اور ایک ایسا معاشرہ وجود میں آ گیا جس میں خدا پرستی و حقوق کی ادائیگی، تقویٰ و پرہیزگاری اور نیکی و ہمدردی کے جملہ اوصاف بدرجہ اتم پائے جاتے تھے۔

حقیقت یہی ہے کہ اللہ رب العزت نے محمد صل اللہ علیہ وسلم کی زبانی اپنی بادشاہت کا اعلان کچھ اس طرح کیا۔ ارشادِ باری ہے:

”قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ  
وَالْأَرْضِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَأَمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيُّ الْأُمِّيَّ الَّذِي  
يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ“ (الاعراف: ۱۵۸)

(اے پیغمبر! آپ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ: اے بنی نوع انسان! میں تم سب کی جانب خدا کا بھیجا ہوا ہوں، آسمانوں اور زمین کی ساری بادشاہت اسی خدا کے لئے ہے، کوئی معبود نہیں مگر اسی کی ایک ذات ہے، وہی زندگی بخشتا ہے، وہی موت دیتا ہے، پس اللہ پر اور اس کے رسول امی پر ایمان لاؤ جو خود اللہ پر اور اس کے احکام پر ایمان رکھتا ہے، اس کی پیروی کرو تاکہ تم راہِ راست پر آ جاؤ۔)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہی ہے کہ لوگوں کو توحید کی تعلیم دی جائے، خدا کے احکام کی تبلیغ اور گم کردہ راہِ انسانیت کو ضلالت و تباہی کے راستوں سے ہٹا کر خدائے واحد کی صراطِ مستقیم پر چلایا جائے اور دنیا میں امن و امان قائم کیا جائے۔

آپ ﷺ کی ذات مقدس آفاقی اور عالم گیر ہے۔ آپ تمام عالم کے لئے رحمت تھے، آپ نے انسانیت کا احترام لوگوں کے دلوں میں پیدا کیا، رنگ و نسل اور ذات و قبیلہ کے انسانی ہاتھوں سے تراشے ہوئے تمام بت چور چور ہو گئے۔ اسی لئے آپ ﷺ کو خداوند قدوس کی جانب سے رحمۃ المسلمین کے بجائے رحمۃ للعالمین کے خطاب سے نوازا گیا۔ ”وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ“۔ (الانبیاء: ۱۰۷) جس سے اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ آپ ﷺ کی نبوت کسی خاص قوم، خاص ملک اور کسی خاص زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں، کسی خاص جغرافیائی حدود کے ساتھ وابستہ نہیں، بلکہ تمام انسانوں کے لئے ہے، یہ زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہے، یہ اصول و نظریات کا پیغام ہے۔

آپ ﷺ نے دنیا کو خالص توحید کے تصور سے آشنا کیا، انسانوں میں اعلیٰ و ادنیٰ کی تفریق مٹا کر اخوت و مساوات کا سبق دیا، انسانوں کی عظمت قائم کی اور اوہام و خرافات کی زنجیروں سے انسانوں کو آزاد کر کے حقیقت شناس بنادیا۔

دونوں جہاں میں فوز و فلاح کی حصولیابی، مساوات اور قیام امن کے لئے آپ نے لوگوں کے سامنے توحید کا جامع تصور پیش کیا۔ آپ نے نہ صرف تصور پیش کیا بلکہ عملی طور پر لوگوں کے ذہنوں سے سینکڑوں معبودان باطل کے خود ساختہ تصورات کو کھرچ ڈالا اور ایک اللہ رب العزت کی بندگی میں زندگی گزارنے کا پاکیزہ تصور پیش کیا۔ اس راہ میں آپ نے بے شمار تکالیف برداشت کیں، مصیبتیں اٹھائیں اور اپنے اور غیروں کے طعنے سنے۔ اللہ نے جب آپ کو نبی بنایا تو توحید و رسالت کے اعلان کے لئے آپ کو وہ صفا پر چڑھ گئے اور بلند آواز سے ایک ایک قبیلے کا نام لے کر پکارا۔ سارے لوگ پہاڑ کے نیچے جمع ہو گئے۔ آپ نے اس مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ”اے اہل قریش! اگر میں یہ خبر دوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے حملہ آوروں کی بڑی سی فوج موجود ہے تو کیا تم مجھ پر یقین کرو گے؟ لوگوں نے کہا: تم صادق اور امین ہو، ہم تمہاری بات پر یقین کریں گے۔ آپ نے فرمایا: تو پھر میں تم کو آگاہ کرتا ہوں کہ بت پرستی گناہ ہے، اس جہاں کو پیدا کرنے والے معبود برحق اللہ واحد پر ایمان لاؤ، تا کہ اس کے عذاب سے بچ سکو۔ آپ کی بات سن کر اہل قریش ہنسنے لگے۔ ابو لہب نے کہا: تجھ پر ہلاکت ہو۔ کیا یہی کہنے کے لئے ہم سب کو جمع کیا تھا؟ اس کے بعد سب لوگ آپ کا مذاق اڑاتے ہوئے چلے گئے۔ اس وقت سورہ تبت یداً نازل ہوئی۔“ ۲۔ جس میں فرمایا گیا:

”تَبْتُ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ. مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ. سَيَصْلَىٰ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ  
وَأَمْرَاتُهُ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ. فِي جِيدِهَا حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ.“ (الابہب: ۱-۵)

(ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ (خود ہلاک ہو گیا) نہ تو اس کا مال اس کے کام آیا نہ  
اس کی کمائی۔ وہ عنقریب بھڑکنے والی آگ میں جائے گا، اس کی بیوی بھی (جائے گی) جو  
لکڑیاں ڈھونے والی ہے، اس کی گردن میں پوست کھجور کی رسی ہوگی۔)

آپؐ ان تمام آزمائشوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرتے رہے اور حق کی تبلیغ میں لگے رہے۔  
آپؐ کے صبر و تحمل اور کریمانہ مزاج ہی کا تو اثر تھا کہ آپؐ نے پوری زندگی میں اپنے اوپر کئے گئے مظالم کا  
کبھی بدلہ نہیں لیا۔ حضرت عائشہؓ گواہی دیتی ہیں کہ: مَا انتَقَمَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لِنَفْسِهِ بِ(رسول اللہ  
ﷺ نے اپنی ذات کے لئے کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا۔) کافروں نے آپؐ کو گالیاں دیں، اذیت پہنچائی،  
قتل کی سازش کی، مگر جب آپؐ نے ان پر قابو پایا تو ان سب سے بدلہ لینے کے بجائے ان کو فراخ دلی  
سے معاف کر دیا۔ فتح مکہ آپؐ کے رحمانہ سلوک کی زندہ مثال ہے۔ صبر و تحمل اور عفو و درگزر آپؐ کی امتیازی  
خصوصیت ہے۔ اللہ نے آپؐ کی اس خصوصیت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا:

”فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ  
فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ.“ (آل عمران: ۱۵۹)

(اے محمد ﷺ یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے نرم مزاج واقع ہوئے ہو ورنہ  
تم کہیں سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔ ان کے قصور معاف  
کر دو اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو۔)

عفو و درگزر کی اس سے بڑی اور کیا تعلیم ہو سکتی ہے جو آپؐ نے اپنی امت کو دی۔ آپؐ نے فرمایا:

”صل من قطعك وآت من حرمك واعرض عن من ظلمك.“ ۱

(جو تم سے کٹ جائے تم اس سے جڑ جاؤ، جو تم کو منع کرے تم اس کو عطا کرو اور جو تم پر ظلم  
کرے اس سے اعراض کرو۔)

سیرت نبوی کے مطالعہ سے جو بات سب سے زیادہ اہم محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ اثر کے لحاظ سے  
جو بات آں حضرت ﷺ کی پاکیزہ زندگی کے واقعات میں ہے وہ کسی دوسرے انسان کی زندگی میں نہیں  
پائی جاتی۔ کس طرح ایک فرد واحد نے عرب کی سنگلاخ وادی میں انقلاب برپا کر دیا تھا اور کس طرح لوگوں

کے دلوں پر اپنی بادشاہت قائم کر لی تھی۔ اس کا اندازہ حضرت جعفر طیار کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے جو انہوں نے نجاشی کے دربار میں دیا تھا۔ حضرت جعفر فرماتے ہیں:

”بادشاہ سلامت! ہم جاہلیت میں مبتلا تھے، بتوں کی پوجا کرتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاری کا ارتکاب کرتے تھے، رشتہ داروں سے قطع تعلق کرتے تھے، پڑوسیوں سے برا سلوک کرتے تھے، ہمارا طاقت ور کمزور کو دبا لیتا تھا، ہم اسی حال میں تھے کہ اللہ نے ہمارے درمیان ایسا رسول بھیجا جس کے نسب، سچائی، امانت اور پاک دامنی سے ہم سب واقف ہیں۔

انہوں نے ہمیں دعوت دی کہ ہم صرف ایک معبود کی پرستش کریں، اس کے علاوہ پتھر وغیرہ کے وہ تمام بت جس کی ہم اور ہمارے آباء اجداد پرستش کرتے تھے، چھوڑ دیں۔ انہوں نے ہمیں سچ بولنے کی امانت داری کی، صلہ رحمی کی، پڑوسیوں سے حسن سلوک کی، حرام کاموں اور دوسروں کا خون بہانے سے پرہیز کرنے کی تعلیم دی۔

انہوں نے ہمیں بدکاری سے، جھوٹی بات کہنے سے، یتیم کا مال کھانے سے، پاک دامن عورتوں پر الزام لگانے سے روکا۔ انہوں نے ہمیں حکم دیا کہ ہم اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت کریں، نماز، زکوٰۃ اور روزہ وغیرہ کا حکم دیا۔ چنانچہ ہم نے ان کی تصدیق کی، ان پر ایمان لے آئے اور اللہ کی طرف سے لائے ہوئے احکام میں ان کی پیروی کی، ایک اللہ کی عبادت کی، شرک چھوڑ دیا، جس کو حرام کہا اس کو حرام جانا، جسے حلال کیا اسے حلال سمجھا۔“ ۹

حضرت جعفر طیار کی یہ تقریر حضور اکرم ﷺ کی انقلابی شخصیت کو بیان کرنے کے لئے کافی ہے کہ آپؐ نے کس طرح عرب کے بدو اور وحشی قوم کو مہذب اور متمدن بنادیا اور سارے جہاں کے لئے منارۂ نور بنادیا۔

جزیرۃ العرب میں کی گئی آپؐ کی تمام کاوشوں اور جدوجہد کا خلاصہ یہ ہے کہ آپؐ کی دعوت خداوند قدوس کے سامنے سب کے سروں کو جھکا ہوا دیکھنا چاہتی ہے۔ اس کا بنیادی مقصد انسان اور انسان کے درمیان پیدا کئے ہوئے گمراہ کن امتیازات اور عدم مساوات کو ختم کرنا، خدا فراموشی اور بد اخلاقی کو صالح قدروں سے بدل کر خدا شناسی کے فطری جذبے کو ابھارنا اور صحیح معنی میں انسان کو انسان بنانا ہے۔

آں حضرت ﷺ کی دعوت کے جو نتائج دنیا نے دیکھے وہ بجائے خود بے مثال اور انتہائی حیرت انگیز ہیں۔ اس دعوت سے قوموں کے مزاج بدل گئے، انسانی اخلاق و معاشرت میں عظیم انقلاب برپا

ہو گیا۔ آپؐ نے انسانیت کو ایک متحدہ اخلاقی نظام، ایک متحدہ قومیت، ایک مکمل شریعت اور ایک ابدی مذہب دے کر ایک نئی فکر، ایک نئے تمدن اور نئی تہذیب کی بنیاد ڈالی، جس نے انسانوں کے اندر خدا پرستی، اخلاق، دیانت، تقویٰ اور باہمی اخوت و محبت کے جذبات کو فروغ بخشا۔ آپؐ نے صاف صاف لفظوں میں حجۃ الوداع کے موقع پر اعلان کر دیا کہ:

”تمہارا رب بھی ایک ہی ہے، اور تمہارا باپ بھی ایک ہی ہے، تم سب آدم کی اولاد ہو، اور آدم کی پیدائش مٹی سے ہوئی تھی، خدا کے نزدیک عزت کا مستحق وہ شخص ہے جو تم میں سب سے زیادہ برائیوں سے بچنے والا ہے۔ عربوں کو غیر عربوں پر صرف نیکی کے سبب ہی برتری حاصل ہو سکتی ہے۔“ ۱۰

دنیا نے دیکھا کہ یہ تعلیم صرف الفاظ کی حد تک ہی محدود نہیں رہی، بلکہ اسلام نے اس کے مطابق ایک عالم گیر برادری قائم کر کے دکھادی۔ جس میں رنگ، نسل، زبان، وطن اور قومیت کی کوئی تمیز نہیں، جس میں اونچ نیچ، چھوٹ چھات، تفریق و تعصب کا کوئی تصور نہیں، جس میں شریک ہونے والے تمام انسان خواہ وہ کسی نسل و قوم اور ملک و وطن سے تعلق رکھتے ہوں بالکل مساویانہ حقوق کے ساتھ شریک ہونے کا حق رکھتے ہیں۔ انسانی مساوات اور وحدت کے اصول کو جس کامیابی کے ساتھ مسلم معاشرے میں عملی شکل دی گئی ہے اس کی کوئی نظیر دنیا کے کسی مذہب اور نظام میں نہیں پائی جاتی۔ صرف اسلام ہی وہ دین ہے جس نے روئے زمین کے تمام گوشوں میں پھیلی ہوئی بے شمار نسلوں اور قوموں کو ملا کر ایک امت بنادیا۔ قرآن میں ہے:

”وَإِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ.“ (المومنون: ۵۲)

(بے شک یہ تمہاری امت ایک امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں، تو تم مجھ ہی سے ڈرو۔)

اس امت میں اگر کسی کو کوئی بڑائی حاصل ہے تو وہ صرف تقویٰ اور پرہیزگاری کی بنا پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ۔ (الحجرات: ۱۳) (بلاشبہ تم میں سے سب سے زیادہ مکرم اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہو۔)

تعلیمات نبویؐ کا ہی اثر تھا کہ غلام و آقا کے درمیان کوئی امتیاز نہیں تھا، بلکہ بحیثیت ایک انسان کے سب برابر تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے غلام کے ساتھ شام کا سفر کیا، آپ کے پاس سفر کے لئے ایک ہی اونٹ تھا، جس کے پچھلے حصے پر کھانے کا سامان تھا اور اگلے

حصے پر باری باری کبھی آپ بیٹھتے اور کبھی اپنے غلام کو سوار کرتے۔ جس وقت آخری منزل پر اسلامی کیمپ میں خلیفہ کے داخلے کا وقت تھا اور تمام فوج اپنے خلیفہ کے استقبال کے لئے کھڑی تھی اور مختلف قوموں کے لوگ بھی اسلامی خلیفہ کی شان و شوکت اور تزک و احتشام دیکھنے کو جوق در جوق جمع ہو گئے تھے۔ اس بھیڑ میں ایک مسلم غازی سے کسی شخص نے پوچھا کہ آپ کا خلیفہ یہی ہے جو اونٹ پر سوار ہے؟ غازی نے نہایت متانت سے جواب دیا نہیں، وہ نہیں۔ ہمارا خلیفہ امیر المومنین تو وہ ہے جو اونٹ کی مہار پکڑے پیدل آ رہا ہے، اونٹ پر سوار تو ان کا غلام ہے۔ ۱۱

حضرت محمد ﷺ کی صحبت کا اثر تھا کہ آپ کے وصال کے بعد بھی آپ کے اقوال اور تعلیمات پر صحابہ کرام سختی سے کار بند تھے اور ماقبل میں مذکورہ آیت کریمہ کی عملی تفسیر تھے کہ غلام و آقا کے درمیان کوئی امتیاز نہیں تھا۔ نبی کریم ﷺ کا اپنے غلام کے ساتھ یہ سلوک تھا کہ آپ کا ایک غلام زید بن محمد کہلاتا تھا۔ ۱۲

خلاصہ:

جیسا کہ اس باب کے شروع میں قرآن کریم کی متعدد آیتوں کے ذریعے انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کے مقصد کی وضاحت کی گئی کہ اللہ نے مختلف خطوں، مختلف علاقوں میں لوگوں کی رہبری اور رہنمائی کے لئے اور اللہ سے ان کا رشتہ جوڑنے کے لئے متعدد رسول اور نبی بھیجے۔

تمام انبیاء کی بعثت کے احوال میں بہت ساری چیزیں ایسی ہیں جو سب میں مشترک ہیں۔ مثلاً ہر نبی کو ایسے علاقے میں اور ایسے لوگوں میں بھیجا گیا جو طرح طرح کے خرافات میں مبتلا تھے۔ کفر و نفاق، شرک و بت پرستی، قتل و غارت گری، فتنہ و فساد اور دوسروں کے حقوق کا تلف کرنا تقریباً ہر قوم کا شیوہ تھا۔ اس کے علاوہ ہر نبی کو اس کی قوم نے دعوت حق پرستایا، ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے، حتیٰ کہ بعض انبیاء کو اپنی جان سے ہاتھ بھی دھونا پڑا۔ لیکن تمام انبیاء نے قوم کی بد مزاجی اور ظلم و زیادتی کا جواب عفو و درگزر اور صبر و تحمل سے دیا اور حتیٰ الامکان انہوں نے گمراہ لوگوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی، خود نبی کریم ﷺ نے بے شمار آزمائش اور مشکل حالات کا خندہ پیشانی کے ساتھ سامنا کیا اور اپنی بعثت سے لے کر اپنی وفات تک خدا کے دین کی اشاعت اور حق و صداقت کی تبلیغ میں نہایت انہماک کے ساتھ مشغول رہے۔ آپ نے تبلیغ اسلام کے لئے مختلف طریقے استعمال کئے جو امت کے لئے نمونہ ہیں۔

(۱) آپ ﷺ نے اشاعت اسلام کے لئے موقع کی مناسبت سے لوگوں کو قرآنی آیات سنائیں، جن میں



۱۔ گتھ کرچ خور اور بیہوش

نہایت پرست و محترم ہے۔ یہ ایک ایسا نیا اور اعلیٰ ترین فن ہے جس سے کہ فتنہ ہوا کرتا تھا۔

(۱۰) - تہ خطوط کے لئے ایک اور کمال انسانیت ہے کہ وہ خطوں کو انسانی اور انسانی ہونے کی مختلف

- تہ خطوں کو انسانی ہونے کی مختلف

انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ اگرچہ یہ سب باتیں سن کر میری دلچسپی ہوئی مگر میں نے اس پر کچھ جواب نہ دیا اور یہی طریقہ کار میں نے اپنی زندگی میں بھی اختیار کیا ہے۔ (۹)

(v)  $\frac{d}{dt} \left( \frac{1}{r^2} \right) = -\frac{2}{r^3} \frac{dr}{dt}$

— آیه دلالت بر آن دارد

۷. در مورد این شعر چه می‌گویید؟ (۷)

(b) -

چند

(۵) سہولتوں، مراعات، معجزہ سرگرمیوں کے بغیر، شہر کی آچھوتے طبقہ کی ترقی

جہ سے ہوا، اور اس کے ساتھ ساتھ (د)

[illegible]

۱۰۰  
 ۱۰۱  
 ۱۰۲  
 ۱۰۳  
 ۱۰۴  
 ۱۰۵  
 ۱۰۶  
 ۱۰۷  
 ۱۰۸  
 ۱۰۹  
 ۱۱۰  
 ۱۱۱  
 ۱۱۲  
 ۱۱۳  
 ۱۱۴  
 ۱۱۵  
 ۱۱۶  
 ۱۱۷  
 ۱۱۸  
 ۱۱۹  
 ۱۲۰  
 ۱۲۱  
 ۱۲۲  
 ۱۲۳  
 ۱۲۴  
 ۱۲۵  
 ۱۲۶  
 ۱۲۷  
 ۱۲۸  
 ۱۲۹  
 ۱۳۰  
 ۱۳۱  
 ۱۳۲  
 ۱۳۳  
 ۱۳۴  
 ۱۳۵  
 ۱۳۶  
 ۱۳۷  
 ۱۳۸  
 ۱۳۹  
 ۱۴۰  
 ۱۴۱  
 ۱۴۲  
 ۱۴۳  
 ۱۴۴  
 ۱۴۵  
 ۱۴۶  
 ۱۴۷  
 ۱۴۸  
 ۱۴۹  
 ۱۵۰  
 ۱۵۱  
 ۱۵۲  
 ۱۵۳  
 ۱۵۴  
 ۱۵۵  
 ۱۵۶  
 ۱۵۷  
 ۱۵۸  
 ۱۵۹  
 ۱۶۰  
 ۱۶۱  
 ۱۶۲  
 ۱۶۳  
 ۱۶۴  
 ۱۶۵  
 ۱۶۶  
 ۱۶۷  
 ۱۶۸  
 ۱۶۹  
 ۱۷۰  
 ۱۷۱  
 ۱۷۲  
 ۱۷۳  
 ۱۷۴  
 ۱۷۵  
 ۱۷۶  
 ۱۷۷  
 ۱۷۸  
 ۱۷۹  
 ۱۸۰  
 ۱۸۱  
 ۱۸۲  
 ۱۸۳  
 ۱۸۴  
 ۱۸۵  
 ۱۸۶  
 ۱۸۷  
 ۱۸۸  
 ۱۸۹  
 ۱۹۰  
 ۱۹۱  
 ۱۹۲  
 ۱۹۳  
 ۱۹۴  
 ۱۹۵  
 ۱۹۶  
 ۱۹۷  
 ۱۹۸  
 ۱۹۹  
 ۲۰۰  
 ۲۰۱  
 ۲۰۲  
 ۲۰۳  
 ۲۰۴  
 ۲۰۵  
 ۲۰۶  
 ۲۰۷  
 ۲۰۸  
 ۲۰۹  
 ۲۱۰  
 ۲۱۱  
 ۲۱۲  
 ۲۱۳  
 ۲۱۴  
 ۲۱۵  
 ۲۱۶  
 ۲۱۷  
 ۲۱۸  
 ۲۱۹  
 ۲۲۰  
 ۲۲۱  
 ۲۲۲  
 ۲۲۳  
 ۲۲۴  
 ۲۲۵  
 ۲۲۶  
 ۲۲۷  
 ۲۲۸  
 ۲۲۹  
 ۲۳۰  
 ۲۳۱  
 ۲۳۲  
 ۲۳۳  
 ۲۳۴  
 ۲۳۵  
 ۲۳۶  
 ۲۳۷  
 ۲۳۸  
 ۲۳۹  
 ۲۴۰  
 ۲۴۱  
 ۲۴۲  
 ۲۴۳  
 ۲۴۴  
 ۲۴۵  
 ۲۴۶  
 ۲۴۷  
 ۲۴۸  
 ۲۴۹  
 ۲۵۰  
 ۲۵۱  
 ۲۵۲  
 ۲۵۳  
 ۲۵۴  
 ۲۵۵  
 ۲۵۶  
 ۲۵۷  
 ۲۵۸  
 ۲۵۹  
 ۲۶۰  
 ۲۶۱  
 ۲۶۲  
 ۲۶۳  
 ۲۶۴  
 ۲۶۵  
 ۲۶۶  
 ۲۶۷  
 ۲۶۸  
 ۲۶۹  
 ۲۷۰  
 ۲۷۱  
 ۲۷۲  
 ۲۷۳  
 ۲۷۴  
 ۲۷۵  
 ۲۷۶  
 ۲۷۷  
 ۲۷۸  
 ۲۷۹  
 ۲۸۰  
 ۲۸۱  
 ۲۸۲  
 ۲۸۳  
 ۲۸۴  
 ۲۸۵  
 ۲۸۶  
 ۲۸۷  
 ۲۸۸  
 ۲۸۹  
 ۲۹۰  
 ۲۹۱  
 ۲۹۲  
 ۲۹۳  
 ۲۹۴  
 ۲۹۵  
 ۲۹۶  
 ۲۹۷  
 ۲۹۸  
 ۲۹۹  
 ۳۰۰  
 ۳۰۱  
 ۳۰۲  
 ۳۰۳  
 ۳۰۴  
 ۳۰۵  
 ۳۰۶  
 ۳۰۷  
 ۳۰۸  
 ۳۰۹  
 ۳۱۰  
 ۳۱۱  
 ۳۱۲  
 ۳۱۳  
 ۳۱۴  
 ۳۱۵  
 ۳۱۶  
 ۳۱۷  
 ۳۱۸  
 ۳۱۹  
 ۳۲۰  
 ۳۲۱  
 ۳۲۲  
 ۳۲۳  
 ۳۲۴  
 ۳۲۵  
 ۳۲۶  
 ۳۲۷  
 ۳۲۸  
 ۳۲۹  
 ۳۳۰  
 ۳۳۱  
 ۳۳۲  
 ۳۳۳  
 ۳۳۴  
 ۳۳۵  
 ۳۳۶  
 ۳۳۷  
 ۳۳۸  
 ۳۳۹  
 ۳۴۰  
 ۳۴۱  
 ۳۴۲  
 ۳۴۳  
 ۳۴۴  
 ۳۴۵  
 ۳۴۶  
 ۳۴۷  
 ۳۴۸  
 ۳۴۹  
 ۳۵۰  
 ۳۵۱  
 ۳۵۲  
 ۳۵۳  
 ۳۵۴  
 ۳۵۵  
 ۳۵۶  
 ۳۵۷  
 ۳۵۸  
 ۳۵۹  
 ۳۶۰  
 ۳۶۱  
 ۳۶۲  
 ۳۶۳  
 ۳۶۴  
 ۳۶۵  
 ۳۶۶  
 ۳۶۷  
 ۳۶۸  
 ۳۶۹  
 ۳۷۰  
 ۳۷۱  
 ۳۷۲  
 ۳۷۳  
 ۳۷۴  
 ۳۷۵  
 ۳۷۶  
 ۳۷۷  
 ۳۷۸  
 ۳۷۹  
 ۳۸۰  
 ۳۸۱  
 ۳۸۲  
 ۳۸۳  
 ۳۸۴  
 ۳۸۵  
 ۳۸۶  
 ۳۸۷  
 ۳۸۸  
 ۳۸۹  
 ۳۹۰  
 ۳۹۱  
 ۳۹۲  
 ۳۹۳  
 ۳۹۴  
 ۳۹۵  
 ۳۹۶  
 ۳۹۷  
 ۳۹۸  
 ۳۹۹  
 ۴۰۰  
 ۴۰۱  
 ۴۰۲  
 ۴۰۳  
 ۴۰۴  
 ۴۰۵  
 ۴۰۶  
 ۴۰۷  
 ۴۰۸  
 ۴۰۹  
 ۴۱۰  
 ۴۱۱  
 ۴۱۲  
 ۴۱۳  
 ۴۱۴  
 ۴۱۵  
 ۴۱۶  
 ۴۱۷  
 ۴۱۸  
 ۴۱۹  
 ۴۲۰  
 ۴۲۱  
 ۴۲۲  
 ۴۲۳  
 ۴۲۴  
 ۴۲۵  
 ۴۲۶  
 ۴۲۷  
 ۴۲۸  
 ۴۲۹  
 ۴۳۰  
 ۴۳۱  
 ۴۳۲  
 ۴۳۳  
 ۴۳۴  
 ۴۳۵  
 ۴۳۶  
 ۴۳۷  
 ۴۳۸  
 ۴۳۹  
 ۴۴۰  
 ۴۴۱  
 ۴۴۲  
 ۴۴۳  
 ۴۴۴  
 ۴۴۵  
 ۴۴۶  
 ۴۴۷  
 ۴۴۸  
 ۴۴۹  
 ۴۵۰  
 ۴۵۱  
 ۴۵۲  
 ۴۵۳  
 ۴۵۴  
 ۴۵۵  
 ۴۵۶  
 ۴۵۷  
 ۴۵۸  
 ۴۵۹  
 ۴۶۰  
 ۴۶۱  
 ۴۶۲  
 ۴۶۳  
 ۴۶۴  
 ۴۶۵  
 ۴۶۶  
 ۴۶۷  
 ۴۶۸  
 ۴۶۹  
 ۴۷۰  
 ۴۷۱  
 ۴

۲- کمالیہ سہ ماہی

میں کر کے پھرتی ہوئی تھی کہ اس وقت اس کی طرف سے ایک اور چیز سامنے آئی۔

سره ستمه، د کورنۍ لویو زلمیو ته چې د "داسې"، او "خاوندانه" ژباړه کېږي تر

مَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (١)

۱۔ سر پتھری کے مضمون کو مولوی اسحاق

کی عظیم الشان عمارت تعمیر کی گئی تو اس تعمیر میں بڑی زبردست کامیابی ہوئی اور دنیا نے قلیل عرصے میں یٰدُ خُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا کا نظارہ دیکھا۔

ان تمام بحثوں کا حاصل یہ ہے کہ چوں کہ تمام انبیاء کو غیر اسلامی اور خدا کی اطاعت و فرماں برداری سے دور معاشرہ میں مبعوث کیا گیا تھا اور ہر نبی نے حکمت عملی، دلسوزی، صبر و تحمل، بلند اخلاق، ایثار و قربانی اور عفو و درگزر کے ذریعے لوگوں کو خدا کی طرف بلانے کی کوشش کی اور آج جب کہ نبیوں کی بعثت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے اور مسلمانوں کی بڑی تعداد تکثیری معاشرہ میں رہتی ہے، اس لئے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ امت وسط ہونے کا لحاظ رکھیں اور انبیاء کرام کی زندگی کو ان کی معاشرت کو، ان کے طرز دعوت کو اور ان کے بلند اخلاق و کردار کو اپنے لئے نمونہ بنائیں اور نہایت بردباری اور تحمل کے ساتھ خدا کے پیغام کو خدا کے بندوں تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ جب ہی مسلمان اللہ کی رضا کے مستحق بن سکتے ہیں۔

## حواشی و مراجع

- ۱۔ الصحیح البخاری، کتاب العلم، باب ما کان النبی ﷺ یتخولہم بالموعظة والعلم کی لاتنفر
- ۲۔ الصحیح البخاری، کتاب العلم، حوالہ گذشتہ
- ۳۔ ابن کثیر، قصص الانبیاء، ص: ۱۰۶ مکتبہ الصفا، ۱۴۲۲ھ
- ۴۔ مولانا ابوالکلام کے مقالات کا مجموعہ، انبیائے کرام علیہم السلام، مرتب مولانا غلام رسول مہر، ص: ۲۳۴، پرویز بک ڈپو، دہلی، سنہ ندارد
- ۵۔ انبیاء کرام علیہم السلام، ص: ۲۳۷
- ۶۔ الصحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب قوله وانذر عشیرتک الاقربین
- ۷۔ الصحیح البخاری، کتاب المناقب، باب صفة النبی ﷺ
- ۸۔ مسند احمد، ص: ۵۷۵، ج: ۲۸
- ۹۔ سیرۃ النبی، ابن ہشام، ج: ۱، ص: ۳۳۶
- ۱۰۔ العقد الفرید، ج: ۲، ص: ۱۱۱
- ۱۱۔ قاضی سلیمان منصور پوری، سیرت رحمۃ للعالمین، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۵۳ء، ج: ۳، ص: ۴۴۷
- ۱۲۔ اسماعیل ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، دار الفکر، بیروت، ۱۹۸۰ء، ج: ۳، ص: ۴۶۶



## باب سوم

غیر مسلم معاشرے میں مسلمانوں کی آبادی اور ان کے مسائل

حضور اکرم ﷺ کی مکی و مدنی زندگی ہمارے لیے اسوہ:

مسلمانوں کو دو طرح کے حالات پیش آتے ہیں یا تو وہ مسلم اکثریت اور مسلم تہذیب کے حامل ملک و سلطنت کا حصہ اور شہری ہوتے ہیں یا پھر ان کو ایسے ملک میں بود و باش اختیار کرنی پڑتی ہے، جہاں کا معاشرہ، جہاں کی تہذیب اور حکومت غیر اقوام کی اکثریت پر مشتمل ہوتی ہے اور مسلمانوں کی حیثیت اقلیت کی ہوتی ہے، ایسے ماحول و معاشرہ میں مسلمانوں کو طرح طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، بعض جگہوں پر تو انھیں مذہبی ارکان پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہوتی ہے اور بعض جگہوں پر انھیں بندشوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کی مدنی زندگی کا زیادہ تر حصہ ایک ایسے ماحول کا نمونہ تھا، جس میں اقتدار کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں تھیں، لہذا آپ کی مدنی زندگی کو مسلم حکومت اور مسلم اکثریت والے ماحول میں رہنے والے مسلمان اپنے لیے نمونہ بنا کر اپنے دین و دنیا کو سنوار سکتے ہیں۔ دوسری طرف اگر آپ کی مکی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو آپ کی مکی زندگی ان مسلمانوں کے لیے نقشہ کار فراہم کرتی ہے، جو اپنی طاقت اور دشمنوں کے درمیان کھڑے ہیں، اور مدنی زندگی کا ابتدائی دور، نیز مہاجرین حبش کے حالات ان مسلمانوں کے لیے خضر طریق ہیں، جو غیر مسلم معاشرہ میں دیگر اہل مذاہب کے ساتھ باہمی اہن و آشتی اور مذہبی آزادی کے معاہدہ کے ساتھ رہ رہے ہوں۔ یہ مسلمان آپ کی مکی زندگی سے یہ درس اور عبرت حاصل کر سکتے ہیں کہ مسلمان قلیل تعداد میں ہیں، دشمنوں کا غلبہ ہے، اسلام اور مسلمانوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی سازشیں رچی جا رہی ہیں، ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں، ان کی مذہبی و دینی بنیاد کو متزلزل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، ان پر پتھر برسائے جاتے ہیں اور سماجی طور پر ان کو الگ تھلگ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن اس کے باوجود اسلام کا پھول مرجھانے کے بجائے کھلتا چلا گیا، تعداد کم ہونے کے بجائے بڑھتی گئی، دشمنوں کے ظلم و ستم سے رنجیدہ اور ملول ہونے کے بجائے ان کے سامنے اعلیٰ اخلاق و کردار کا نمونہ پیش کیا گیا اور ہر طرح کے مسائل کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں حل ڈھونڈھا گیا۔

اس وقت مسلمانوں کی نصف آبادی ان ممالک میں قیام پذیر ہے، جہاں غیر مسلموں کی اکثریت ہے، یہ مسلمان اقلیتیں ایسے مسائل سے دوچار ہیں، جن سے گذشتہ ادوار میں مسلمانوں کو سابقہ پیش نہیں آتا تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے ہر سلطنت کا ایک مذہب متعین ہوتا تھا، اسی لیے قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر پیغمبروں سے حکومت وقت کے تصادم کی نوبت آتی تھی، حالاں کہ انبیاء کرام حکومت و اقتدار کے طلب گار نہیں تھے جیسا کہ قرآن میں متعدد جگہوں پر کہا گیا ہے کہ ان کی دعوت ”ان اجری الا علی اللہ“ کے اعلان کے ساتھ ہوتی تھی، لیکن اس کے باوجود حکومتیں ان کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جاتی تھیں، خود جب رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی تو اس وقت بھی بڑی بڑی سلطنتیں، روم، ایران وغیرہ ایک خاص مذہب کے پیرو تھے، غالباً اسی لیے یہود جزیرۃ العرب میں پناہ گزیں ہوئے، جہاں باضابطہ کوئی حکومت قائم نہیں تھی، اور کہا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین، انصار اور یہود کے درمیان جو میثاق طے فرمایا تھا، وہ ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کی کوشش تھی، جس میں مختلف مذاہب کے لوگ ایک دوسرے کے انسانی حقوق کا احترام کرتے رہیں اور ایک دوسرے کے مذہبی معاملات میں جبر و تشدد کا راستہ اختیار کرنے سے گریز کریں اور انسانیت کا احترام ہر حال میں ملحوظ رکھیں تاکہ معاشرہ بدامنی اور فتنہ و فساد سے پاک رہے۔

اسلامی فتوحات کے بعد صدیوں تک صورت حال یہ رہی کہ اگر کسی علاقہ میں مسلمانوں کا قدم پیچھے ہٹ جاتا اور کوئی خطہ ان کے اقتدار سے نکل جاتا، تو وہاں کے بچے کچے مسلمان دارالاسلام کی طرف ہجرت کر جاتے، کیوں کہ جہاں مسلمانوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی نہ ہو اور وہ وہاں سے دارالاسلام کی طرف ہجرت کرنے پر قادر ہوں، تو ان پر ہجرت واجب قرار دی گئی ہے۔ ۳۔

غرض کہ ان غیر مسلم ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کو مختلف حالات پیش آتے ہیں جو کبھی سازگار ہوتے ہیں اور کبھی ناموافق، ایسی صورت میں مسلمانوں کے لیے نبی کریم ﷺ کی مکی و مدنی زندگی نمونہ ہے۔

غیر مسلم معاشرہ میں مسلمانوں کی آبادی کے مسائل:

غیر مسلم اکثریت والے ممالک میں مسلمانوں کی آبادی اور ان کے بود و باش سے متعلق طرح طرح کے مسائل پیدا ہوتے ہیں کہ آیا مسلمانوں کو غیر مسلم آبادی میں مخلوط معاشرت اختیار کرنی چاہیے یا

پھر ان کو اپنی علیحدہ آبادی بنانی چاہیے۔

اس کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال ملتے ہیں:

جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ مسلمانوں کو مخلوط معاشرت سے اجتناب کرنا چاہیے اور ان کے لیے الگ آبادی بنانا، ان کے دینی و مذہبی تشخص کی بناء کے لیے ضروری اور مناسب ہے کیوں کہ عام طور پر مخلوط معاشرہ میں دیگر اقوام کے عادات و اطوار کے مسلمانوں کے درمیان رائج ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے، یہ لوگ نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے دلیل دیتے ہیں جس میں آپؐ نے ان لوگوں سے اپنی برائت کا اعلان فرمایا جو مشرکین کے درمیان رہتے ہیں۔ انا باری من کل مسلم یقیم بین اظهر المشرکین، قالو: یا رسول اللہ: لم، قال: لا تراءى ناراهما۔ علامہ خطابی اس حدیث کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ اللہ نے دار کفر اور دار اسلام کے درمیان فرق کر دیا ہے، لہذا کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ کافروں کے ساتھ ان کے شہر میں رہیں۔ وقال بعضهم معناه ان الله قد فرق بین داری الاسلام والكفر، فلا يجوز لمسلم ان يساکن الکفار فی بلادهم۔ ۵

علامہ سیوطی نہایہ کے حوالہ سے کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے لازم اور واجب ہے کہ وہ اپنا ٹھکانہ مشرکین کے ٹھکانوں سے دور رکھیں۔ قال فی النہایۃ ای یلزم المسلم ویجب علیہ أن یتباعد منزله عن منزل المشرک۔ ۶

ابن القیم کہتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کے لیے مشرکین کے درمیان سے ہجرت کرنا ممکن ہو تو نبی کریم ﷺ نے ان کے درمیان بود و باش اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے: ومنع رسول اللہ ﷺ من اقامة المسلم بین المشرکین اذا قدر وعلى الهجرة من بینهم۔ ۷

اس کے علاوہ مخلوط معاشرت کے منکرین حضرت عمرؓ کی اس روایت سے بھی استدلال کرتے ہیں جس میں آپ ﷺ نے فرقہ قدریہ کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور میل ملاپ سے منع فرمایا: ”عن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ: لا تجالسوا أهل القدر ولا تفاتحوهم“۔ ۸ وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب فرقہ قدریہ کے ساتھ مصاحبت کی ممانعت ہے تو کفار و مشرکین کے ساتھ بدرجہ اولیٰ ممنوع ہوگی۔ جب کہ فتاویٰ عالمگیری کے مفہوم کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان اگر اپنی علاحدہ بستیاں آباد کریں تو غیر مسلموں کے لیے بھی دروازہ کھلا رکھیں لیکن اسی حد تک کہ ان کا غلبہ نہ ہو جائے تاکہ وہ دین کے محاسن اور خوبیوں سے واقف

ہوسکیں اور ہوسکتا ہے کہ اس نتیجہ میں وہ ایمان لے آئیں۔ ۹۔

دوسرے بعض حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ اگر علیحدہ رہنا ممکن نہ ہو اور سرکاری و قانونی کوئی رکاوٹ ہو تو مخلوط آبادی میں اس نیت سے رہائش بہتر ہے کہ وہ غیر مسلموں کو اسلامی اخلاق و کردار کے ذریعہ متاثر کرسکیں، اسی بات کے قائل حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ بھی رہے ہیں۔ ۱۰۔

جو لوگ مخلوط معاشرت سے گریز کے قائل ہیں وہ اس فقہی قاعدہ سے بھی استدلال کرتے ہیں: إذا تعارضت مفسدة ومصلحة قدم دفع المفسدة غالباً۔ اے یہ لوگ کہتے ہیں کہ غیر مسلموں کے محلہ میں رہائش اختیار کرنے سے نفع کم اور نقصان زیادہ ہے اس لیے نقصان سے بچنے کے لیے معاشرت سے اجتناب کیا جائے گا، کیوں کہ اپنے اخلاق و کردار کے ذریعہ غیر مسلموں کو متاثر کرنے کا صرف امکان ہے، لیکن مشاہدات و تجربات سے غیر مسلموں کے تہذیبی اثرات اور ان کے ماحول کا اثر مسلمانوں، ان کے بچوں پر پڑنا یقینی ہے، مکی زندگی میں حضور اکرم ﷺ کے اخلاق و کردار کے ذریعہ کفار مکہ مسلمان نہ ہوسکے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کے تہذیبی اثرات سے بچنے اور مذہبی آزادی کے لیے مدینہ ہجرت کرنے کا حکم دیا تھا۔ اسی وجہ سے فقہاء نے آریہ سماج یا کسی باطل جلسہ جلوس میں شرکت کی اجازت نہ دی ہے، اس لیے کہ فساد دین کا احتمال ہے۔ ۱۲۔

ان تمام اقوال و دلائل کا جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اصل مسئلہ مسلم تہذیب اور دین و ایمان کی بقا ہے، اگر غیر مسلم آبادی میں رہائش اختیار کرنے سے دین و ایمان اور تشخص کو برقرار رکھنے میں کوئی پریشانی اور حرج لاحق نہ ہو تو ان آبادیوں میں رہائش اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے، لیکن وہاں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام ہو جس کے ذریعہ دینی و ملی تشخص کی حفاظت ممکن ہو۔ ۱۳۔

ان تمام باتوں کے علاوہ اگر غیر مسلم آبادی میں رہائش اختیار کرنے کے فوائد پر غور کیا جائے (بشرط دین و جان کی حفاظت) تو اس کے متعدد فائدے نظر آتے ہیں، وہ یہ کہ مسلمان اپنے اخلاق و کردار کے ذریعہ غیر اقوام کو متاثر کرسکتے ہیں، دعوتی روابط باسانی قائم کیے جاسکتے ہیں اور اس کے لیے ماحول سازگار کیا جاسکتا ہے، نیز تہذیب و مذاہب کے اختلاف کی وجہ سے جو آپسی کشمکش اور فرقہ وارانہ منافرت کی فضا قائم ہوتی ہے، ان کے ساتھ بود و باش اختیار کر کے اور اپنے اخلاق و کردار کے ذریعہ بڑی حد تک



اس کشمکش کو ختم کیا جاسکتا ہے۔

چونکہ اللہ رب العزت نے امت مسلمہ کو امت خیر ہونے کی حیثیت سے ایک انفرادی ذمہ داری سے سرفراز فرمایا ہے وہ یہ کہ اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف بلایا جائے اور معبودان باطل سے ان کا رشتہ توڑ کر ایک خدا کی پرستش پر انھیں آمادہ کیا جائے، اس ذمہ داری کو غیر مسلم آبادی میں رہ کر بحسن و خوبی انجام دیا جاسکتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر مقصد مخلوط آبادی میں رہ کر دین کی نشر و اشاعت اور اسلامی اخلاق و آداب سے متاثر کرنا اور دعوت الی الحق ہو تو غیر مسلموں پر مشتمل مخلوط آبادی میں سکونت اختیار کی جاسکتی ہے، تاہم دینی و ملی تشخص اور جان کی بقا یہ اولین شرط ہے۔

### سیاسی مسائل:

مسلمانوں کی مطلوب اور مثالی پوزیشن یہ ہے کہ وہ جہاں بھی رہیں، اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور غیر مشروط بندگی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں، وہ سر بھی اللہ کے آگے جھکائیں، دل میں بھی اس کی یاد بسائیں اور دماغ میں بھی اس کی محبت و اطاعت کا چراغ جلائیں، وہ عبادت بھی اسی کی کریں، سیاست میں بھی اسی کی ہدایت کی پابندی کریں، معیشت میں بھی اسی کے ضابطہ احکام کو اختیار کریں اور معاشرت کو بھی اسی کے نور ہدایت سے منور کریں۔ غرضیکہ زندگی کے کسی گوشہ میں وہ اللہ کو چھوڑ کر غیر اللہ کی بندگی نہ کریں، مسلمانوں کی زندگی اللہ کے اس ارشاد کی عملی تفسیر ہونی چاہیے:

”قُلْ إِنْ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ“۔ (الانعام: ۱۶۴)

(کہو میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔)

یہ صرف ایک شرعی تقاضا نہیں، بلکہ منطقی اور اخلاقی معاملہ بھی ہے، جو ذات کائنات کی خالق ہے وہی اس کی مالک بھی ہے اور وہی معبود برحق بھی ہے، جو لائق سجدہ ہے، قرآن پاک نے اس فطری کلیہ کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

”أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ“۔ (الاعراف: ۵۴)

(آگاہ رہو کہ خلق اور حکم اسی کا ہے تو بابرکت ہے اللہ جو تمام جہانوں کا رب ہے)

”وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَهٌ وَهُوَ الْحَكِيمُ

الْعَلِيمُ“۔ (الزخرف: ۸۴)

(وہی ذات ہے جو آسمان میں بھی معبود ہے اور زمین میں بھی معبود ہے اور وہ حکمت والا علم والا ہے)

”إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ“۔ (یوسف: ۴۰)  
(حکم تو بس اللہ کا ہے، اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور کی عبادت نہ کرو، یہی سیدھا راستہ ہے)

مذکورہ آیات صراحت کے ساتھ مسلمانوں کی زندگی کے نصب العین کو روشن کرتی ہیں اور مقصد زندگی کو واضح کرتی ہیں۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ زندگی کے کسی معاملہ میں اللہ اور اس کے رسول محمد عربی ﷺ کی تعلیم کو نظر انداز کر کے کوئی خود ساختہ نظریہ اور دوسرا طریقہ اختیار کر لے، کیوں کہ ایسا کرنا ایمان کی نفی کرنا ہے اور اپنی دینی بنیادوں کو کمزور کرنا ہے۔

اس وقت مسلمان جن ملکوں میں آباد ہیں، ان میں کچھ ممالک تو ایسے ہیں جہاں ان کو عبادت، معیشت، معاشرت اور سیاست ہر شعبہ حیات میں اللہ کے حکم کو نافذ کرنے اور اس کی اطاعت کرنے کا اختیار اور آزادی حاصل ہے۔ وہاں وہ اسلامی زندگی کا مکمل نفاذ کر سکتے ہیں اور ہر شعبہ حیات کی تشکیل اسلامی اصول و احکام کی روشنی میں کر سکتے ہیں۔ فریضہ عبادت بھی کامل یکسوئی سے انجام دیے سکتے ہیں اور اسلام کے عائلی اور دیوانی فوج داری قوانین کو نافذ کر سکتے ہیں۔

مگر مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ان ممالک میں بھی آباد ہے جہاں اقتدار غیروں کا ہے اور وہ حکومتیں قومی جمہوری یا بادشاہی نظام کے ماتحت قائم ہیں، جہاں نہ اللہ کو مالک حقیقی تصور کیا جاتا ہے اور نہ اس کے احکام کو سرکاری نظام میں دخل دینے کی اجازت ہے۔ ایسے ملکوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں، وہ نظریہ حکومت کو تبدیل کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں اور نہ اپنے دینی اقدار و آئین کو نافذ کروانے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بعض ممالک ایسے ہیں جن میں مسلمان اقلیت میں ہونے کے باوجود مسلم ملکوں سے زیادہ تعداد میں ہیں۔ وہاں ان کی اپنی جمعیت ہے، اپنی تاریخ ہے، اپنا تہذیبی ورثہ ہے اور ان کی دیرینہ روایات ہیں، ان ملکوں میں مسلمانوں کے بڑے بڑے دینی تعلیمی اور سماجی ادارے ہیں، بڑی تعداد میں مساجد اور مدارس ہیں، علمی اور سماجی انجمنیں ہیں، اوقاف کی جائدادیں ہیں، تجارتی اور معاشی مراکز ہیں، ان سب کو ختم کر کے کسی مسلم ملک میں ہجرت کرنا ان کے لیے آسان نہیں

بلکہ ناممکن ہے۔

دوسری طرف صورت حال یہ ہے کہ معاشی ترقی، انسانی حقوق کی بظاہر یقین دہانی اور شخصی آزادی کے حصول کی وجہ سے مسلم ممالک میں ہجرت کر کے جا رہے ہیں اور وہاں کی شہریت اختیار کر رہے ہیں۔ چونکہ ان غیر مسلم ممالک میں اقتدار کی باگ ڈور غیر اقوام کے ہاتھوں میں ہوتی ہے، اس لیے وہاں اقتدار اعلیٰ اللہ کا نہیں بلکہ انسانوں کا ہوتا ہے جس کی وجہ سے خاص طور پر مسلمانوں کے لیے بے شمار مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ان ممالک میں اکثر ملکوں کا نظام حکومت جمہوری طرز پر قائم ہوتا ہے، جہاں اقتدار کا حصول ووٹوں پر منحصر ہوتا ہے اور نمائندگی کی کثرت سے قوانین بنتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں مسلمانوں کے لیے بہت بڑا سیاسی مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اقتدار میں شرکت کے لیے کون سا راستہ اختیار کریں، جس کے ذریعہ ملکی دستور کی روشنی میں حقوق کا تحفظ ممکن ہو اور ان کے مذہب، تہذیب اور ملی مفادات پر آنچ نہ آنے پائے، نیز ایسے قانون نہ بنے پائیں جن سے مسلمانوں کے حقوق پر زبرد پڑتی ہو یا مذہبی معاملات میں دخل اندازی ہوتی ہو۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب عام طور پر ان ممالک کا سیاسی چہرہ کرپشن اور غیر اخلاقی کاموں کی وجہ سے غبار آلود ہو چکا ہے اور اقلیت خاص طور پر مسلمانوں کے خلاف قانون سازی کے امکانات رہتے ہیں تو مسلمانوں کی نمائندگی سیاسی قانون ساز اداروں میں کس حد تک ہونی چاہیے اور سیاسی پلیدی کو دور کرنے کے لیے انھیں کیا کردار ادا کرنا چاہیے۔ ان تمام احوال اور سوالات کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجہ تک پہنچا جاسکتا ہے کہ ملکی سیاست میں حصہ لینا نہ صرف مسلمانوں کی سیاسی بلکہ مذہبی ذمہ داری بھی ہے کہ وہ اپنے حقوق کی بازیابی اور دینی و ملی تشخص کی بقا کے لیے ملکی سیاست میں سرگرم ہوں اور ایسے افراد کو ایوان قانون ساز تک پہنچانے کی کوشش کریں جو ان کے مفادات کے محافظ ہوں یا اخلاقی قدروں کے امین ہوں اور سیاست کو ملکی ضرورتوں سے ہم آہنگ کرنے اور اسے صاف دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں تاکہ ان رہنماؤں کے ذریعہ عملی طور پر یہ پیغام دینا ممکن ہو کہ اسلام نہ صرف دینی معاملات میں اپنے متبعین کی راہنمائی کرتا ہے بلکہ ان کے لیے سیاسی اصول بھی مرتب کرتا ہے اور سیاسی مسئلہ کے تصفیہ کے لیے تشفی بخش حل بھی پیش کرتا ہے۔

## انتخابی سیاست میں مسلمانوں کی شرکت:

موجودہ انتخابی نظام کے غیر اسلامی ہونے اور ان تمام خرابیوں کے باوجود جو سب پر عیاں ہیں جب یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ غیر مسلم ممالک اور معاشرہ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور اسلامی نظام حکومت کے قیام کے امکانات روشن نہیں ہیں تو مسلمانوں کا مفاد اسی میں ہے کہ مذہبی آمریت کے بجائے جمہوریت کی تائید کریں اور جمہوری نظام کا سب سے بنیادی عنصر الیکشن اور انتخابی عمل ہے تو مسلمانوں کے لیے انتخابی عمل اور الیکشن سے صرف نظر ممکن نہیں۔ لہذا ایسی صورت حال میں الیکشن میں مسلمانوں کا حصہ لینا صرف درست ہی نہیں بلکہ لازم اور ضروری ہے، تاکہ مسلم نمائندہ مسلمانوں کی آواز قانون ساز اداروں تک پہنچا سکے، نیز ان اداروں میں پاس ہونے والے قوانین سے جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہوں مسلمانوں کو آگاہ کر سکے، اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر سکے اور مذہبی، تعلیمی، سماجی اور معاشی حقوق کے تحفظ کی سعی کر سکے۔ اس تناظر میں انتخابی سیاست کا بائیکاٹ کرنا یا اس سے کنارہ کشی اختیار کرنا مسلمانوں کو نہ صرف دیگر شہریوں سے الگ کرے گا بلکہ اکثریت کے ذہنوں میں شکوک و شبہات اور عدم اعتماد کی فضا پیدا کرے گا جو کہ باہمی خیر سگالی اور آپسی بھائی چارہ کے جذبہ کو پروان چڑھانے میں مضر اور نقصان دہ ہے۔

ملک کے آئین اور اس کی اقدار و علامات کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ شہریوں کو تحفظ اور حقوق حاصل ہوتے ہیں، انتخاب میں شرکت کرنا اور حصہ لینا یہ شہریوں کا بنیادی حق ہوتا ہے لہذا اگر مسلمان الیکشن سے کنارہ کشی اختیار کر لیں تو وہ نہ اپنے حقوق کی جنگ لڑ سکتے ہیں اور نہ برادران وطن کے دلوں میں اپنے حقوق کے تئیں ہمدردی اور تعاون کے جذبات پیدا کر سکتے ہیں۔ اقلیتوں کو اپنے حقوق اور تحفظ کی جنگ برادران وطن کے تعاون کے ساتھ لڑنی پڑتی ہے اور زندہ اقلیتیں ہمیشہ برادران وطن کے صاف عناصر کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب رہتی ہیں، ضروری ہے کہ ان کے ذہنوں میں کسی قسم کے شکوک و شبہات پیدا نہ ہونے پائیں اور انھیں مسلمانوں کی حب الوطنی پر شک نہ ہو اس لیے لازماً مسلمانوں کو غیر مسلم اکثریت والے ممالک میں انتخابی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے اور اس میں ایک سرگرم کردار ادا کرنا چاہیے، کیوں کہ اس میں نہ صرف ملک کا مفاد ہے بلکہ مسلمانوں کے ملی مفادات کے تحفظ کا راز بھی پنہاں ہے۔

## الکشن میں امیدوار بننا:

الکشن میں امیدوار بننا، عوام سے ووٹ کی بھیک مانگنا، ووٹ حاصل کرنے کے لیے جھوٹے اور غلط وعدے کرنا، اپنے کو اس عہدے کے لائق اور دوسرے کو نالائق بتانا اور بے بنیاد دلائل دینا، اپنی پارٹی کی خوبیوں کو ذکر کرنا اور دوسری پارٹیوں کے نقص اور عیب کو بتانا، اسلامی نقطہ نظر سے ایک ناروا غیر شریفانہ حرکت ہے اور اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ کیوں کہ ایک مسلمان کا کردار یہ ہے کہ وہ جھوٹ، کذب، دروغ گوئی، وعدہ خلافی، عیب جوئی اور الزام تراشی کو کسی عہدہ کو حاصل کرنے کا ذریعہ نہ بنائے اور مسلمانوں کا یہ بھی شیوہ نہیں ہے کہ وہ محض دنیا کی خاطر کسی عہدہ اور منصب کی لالچ میں مبتلا ہو۔ قرآن کریم اور احادیث رسول میں حب جاہ اور حب مال سے منع کیا گیا ہے اور عام حالات میں عہدہ طلب کرنے اور عہدہ سپرد کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت ہے:

”عن ابی موسیٰ قال دخلت علی النبی ﷺ انا ورجلان من قومی فقال احد الرجلین امرنا یا رسول اللہ وقال الآخر مثله فقال انا لانیولی هذا الامر من سالہ ولا من حرص علیہ“۔ ۱۴

(میں اور میرے دو چچا زاد بھائی اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں پہنچے تو ان دونوں میں سے ایک نے اللہ کے رسول ﷺ سے کہا کہ آپ مجھے بعض اس حصہ پر حاکم بنا دیجیے جس پر اللہ نے آپ کو حاکم بنایا ہے، دوسرے نے بھی کچھ اس طرح کی درخواست کی تو اللہ کے رسول نے فرمایا کہ بخدا ہم کسی ایسے شخص کو حاکم نہیں بناتے جو عہدہ کا مطالبہ کرے یا اس کا حریص ہو)۔

دوسری روایت میں ہے:

”عن عبدالرحمن بن سمرۃ قال: قال لی رسول اللہ ﷺ لا تسأل الامارة فانک ان اعطیتها عن مسئلة وکلت الیہا وان اعطیتها عن غیر مسئلة اعنت علیہا“۔ ۱۵

(حضرت عبدالرحمن بن سمرہؓ فرماتے ہیں کہ مجھ سے اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ عہدہ کا سوال مت کیا کرو، کیوں کہ اگر عہدہ تجھے طلب پر ملا ہے تو (خدا کی مدد اٹھ جائے گی) وہ تیرے حوالہ کر دیا جائے گا (کہ تو جانے اور تیرا کام) اور اگر بغیر طلب کے ملا ہے تو اللہ کی مدد

تیرے شریک حال رہے گی)

جیسا کہ ماقبل میں گذرا کہ دنیا کے بیش تر غیر مسلم ممالک کا نظام حکومت جمہوری طرز پر قائم ہے جہاں ملک کے مستقبل کا فیصلہ اکثریت کی رائے پر منحصر ہے، اور اس کو پرکھنے کا معیار ووٹ اور الیکشن کی سیاست ہے۔ ایسی صورت حال میں مسلمانوں کے لیے اپنے آپ کو امیدوار کی حیثیت سے پیش کیے بغیر کوئی چارہ نہیں تو ان خصوصی حالات کے پیش نظر مسلمانوں کے لیے الیکشن میں حصہ لینا اور امیدوار بننا درست ہوگا، تاہم امیدوار بننے کے لیے اس بات کا خیال رکھا جانا ضروری ہے کہ وہ شخص جو امیدوار بننے کا دعویٰ کر رہا ہے وہ اس عہدہ کا اہل ہو اور دوسرے یہ کہ وہ امین اور دیانت دار ہو اور اس کا مقصد جاہ و جلال کی حصولیابی نہ ہو بلکہ وہ اس عہدہ پر فائز ہو کر خلق خدا کی خدمت کرنا چاہتا ہے تو اس صورت میں مسلمانوں کے لیے الیکشن میں امیدواری کا دعویٰ کرنا اور امیدوار بننا صحیح ہوگا۔ جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر سے درخواست کی تھی کہ انھیں خزانہ کا نگران مقرر کر دیا جائے: ”اجعلنی علی خزائن الارض“۔

حضرت یوسف علیہ السلام اس عہدہ کے اہل بھی تھے کیوں کہ اللہ نے انھیں بے شمار خصوصیات سے سرفراز فرمایا تھا اور وہ امین بھی تھے کہ جب عزیز مصر کی بیوی نے انھیں گناہ کی دعوت دی تو انھوں نے انکار کر دیا اور ارشاد فرمایا:

”قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ“۔ (یوسف: ۲۳)

(کہا اللہ کی پناہ، وہ عزیز تو میرا رب یعنی پرورش کرنے والا ہے، اس نے مجھے اچھی طرح رکھا)

حق رائے دہی کا مناسب استعمال:

انتخابات میں کھڑا ہونے والا ممبر اگر واقعتاً اس عہدے کے لائق، امین اور متدین ہے اور مسلمانوں کے مسائل سے واقفیت رکھتا ہے، نیز اس کے اندر ملی مفادات کے تحفظ کا جذبہ ہے تو ایسے شخص کو ووٹ دیا جاسکتا ہے اور چونکہ اس سے مذہبی، ملی، سماجی اور معاشی حقوق وابستہ ہیں اس لیے بغیر ترغیب اور دعوت کے از خود جا کر اس کے حق میں ووٹ دینا لازم ہے اور یہ شریعت مطہرہ کے نزدیک پسندیدہ اور مرغوب فعل ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

”أَلَا اخبركم بخير الشهداء الذي يأتي بشهادته قبل أن يسألها“۔ ۱۶

(کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ بہترین گواہ کون ہے؟ وہ شخص جو اپنی گواہی طلب کرنے سے پہلے ہی ادا کر دے)

ووٹ دینا بھی اس بات کی شہادت ہے کہ امیدوار اس عہدہ کے لیے موزوں اور مناسب ہے، لہذا اگر کسی امیدوار کے اندر اہلیت پائی جائے تو اس کا انتخاب کرنا اور اس کے حق میں ووٹ ڈالنا ایک پسندیدہ عمل ہے، بلکہ لازم ہے۔

### ووٹ کی شرعی حیثیت:

جب انتخابات سے مسلمانوں کے ملی اور مذہبی مفادات وابستہ ہیں تو ایسی صورت حال میں جس طرح نااہل، ظالم، فاسق اور غلط آدمی کو ووٹ دینا ناجائز ہے اور گناہ کا باعث ہے، اسی طرح کسی اچھے، قابل اور ایسے شخص جس کے سینہ میں مسلمانوں کی ہمدردی اور غم خواری ہو، وہ ان کے ملی، مذہبی اور معاشی حقوق کے تحفظ کا قصد رکھتا ہو ان کو ووٹ دینا ایک دینی فریضہ ہے، قرآن کریم نے جس طرح جھوٹی شہادت کو حرام اور ناجائز قرار دیا ہے اسی طرح سچی شہادت کو واجب اور ضروری قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں:

”كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ“۔ (المائدہ: ۸)

(تم اللہ کے لیے سچی گواہی دینے والے ہو جاؤ)

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

”وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ“۔ (الطلاق: ۲)

(تم اللہ کے لیے شہادت کو قائم کرو)

### مسلم سیاسی جماعت کا قیام:

جمہوری ممالک میں اقتدار کی حصولیابی کے لیے مختلف سیاسی پارٹیاں سرگرم عمل رہتی ہیں اور اپنے مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے طرح طرح کے سیاسی ہتھکنڈے استعمال کرتی ہیں، کچھ سیاسی پارٹیاں تو سیکولر کردار کو اپنا شعار بناتی ہیں اور کچھ جماعتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو اقتدار تک پہنچنے کے لیے مذہب، علاقائیت، نسل اور زبان کو بنیاد بناتی ہیں، کچھ پارٹیاں کھلم کھلا مسلم دشمنی کے ذریعہ تخت نشیں ہونا چاہتی ہیں اور کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں جو ظاہراً مسلم دوستی اور ہمدردی کا دم بھرتی ہیں اب ایسی صورت حال میں مسلمانوں کے لیے ایک سیاسی مسئلہ ہے کہ وہ الگ کوئی جماعت قائم کریں یا پھر ان پارٹیوں میں شمولیت

غٹیا کریں جن کے مزاج میں مسلم دشمنی کا عنصر شامل نہیں ہے۔

یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ سیاسی قوت پیدا کیے بغیر مسلمانوں کی حالت میں سدھار نہیں ہو سکتا لیکن سیاسی قوت کو حاصل کرنے کے لیے کسی مسلم جماعت کا قیام جب کہ وہ اس ملک میں اقلیت کی حیثیت سے رہتے ہوں نہ صرف آپسی منافرت کو بڑھا دے گا بلکہ مسلمانوں اور دیگر اقوام جو کہ اکثریت میں ہیں ان کے درمیان خلیج اور وسیع ہو جائے گی۔ جو یقیناً مسلمانوں کی مذہبی آزادی اور ملی مفادات کے خلاف لگی، اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ تکثیری معاشرہ میں حالات کا جائزہ لیا جائے اور ملک کی سیاسی، اجتماعی، معاشی اور معاشرتی احوال کا تجزیہ کرنے کے بعد ایک ٹھوس نتیجہ پر پہنچا جائے کہ آیا مسلم جماعت کا بام مفید ہے یا مضر؟ اس سلسلے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے استاذ پروفیسر سعود عالم قاسمی کے خیالات سے استفادہ کیا جانا چاہیے جو انھوں نے اپنے ایک مقالہ میں پیش کیا ہے۔ ان کا یہ مقالہ ہندوستانی سیاست کے پس منظر میں ہے، وہ کہتے ہیں:

”ہندوستانی مسلمانوں کے لیے زیادہ اچھی بات یہ ہوگی کہ وہ تابع داری کی سیاست چھوڑ کر ساجھے داری کی سیاست اختیار کریں، یعنی جس ریاست میں وہ قابل لحاظ تعداد میں ہوں وہاں اپنی سیاسی جماعت بنائیں جو ان کے اصولوں کے مطابق سیکولر ایج رکھنے والی سیاسی جماعتیں ہیں ان سے انتخابی معاہدہ کریں اور مشترکہ اہداف کے لیے کام کریں۔ اسی طرح اسمبلی اور پارلیمنٹ میں اپنے نمائندوں کو بھیجیں جو ان کے ملی حقوق کے تحفظ کے لیے جدوجہد کریں اور ان کے مسائل کو معقول اور مدلل انداز سے ایوان اقتدار کے سامنے رکھ سکیں۔“

یہ مقالہ ہندوستانی تناظر میں لکھا گیا ہے تاہم اس کو تمام غیر مسلم ممالک میں قیام پذیر مسلمانوں کی اسی زندگی کے لیے ایک کلید اور نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے کہ اصل چیز ملی مفادات کا تحفظ ہے، پھر حالات کا زبہ اور اپنی تعداد پر نظر کہ کسی مخصوص علاقہ اور ریاست میں وہ امیدواروں کی کامیابی میں مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں تو وہاں اپنی جماعت بنائیں اور اپنی سیاسی قوت کو استحکام فراہم کریں۔

جماعت اسلامی کے ڈاکٹر سید قاسم رسول الیاس مسلم جماعت کے قیام پر دلائل پیش کرتے ہوئے

ریکرتے ہیں:

”کیا مسلمانوں کا رول اس ملک میں صرف اتنا ہی ہے کہ وہ اپنے حقوق کا تحفظ کریں؟ اسلام



نے انھیں جو مقام اور منصب دیا ہے، کیا یہ بات اس سے فروتر نہیں ہے؟ کیا مسلمانوں کو ملک کے تمام انسانوں کو انصاف دلانے، محروم و مظلوم طبقات کے حقوق کا تحفظ کرنے اور ملک کی پالیسیوں کو منصفانہ اور عادلانہ بنانے سے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیے؟ کیا انھیں صرف مسلم معاشرے کی قیادت کرنی چاہیے اور ملک کے عام انسانوں بالخصوص محروم و مظلوم طبقات کی قیادت اور رہنمائی ان کا فریضہ نہیں ہے؟ یقیناً مسلمانوں کا جو مقام و منصب ہے، اس کا تقاضا یہی ہے کہ انھیں تمام انسانوں کو انصاف دلانے، مظلوم و محروم طبقات کو ظلم و ناانصافی سے نجات دلانے، ملک میں امن و امان قائم کرنے کے وسیع تر ایجنڈے کو بنیاد بنا کر سیاسی میدان میں آنا چاہیے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ان کی قائم کردہ پارٹی مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ملک کے تمام انسانوں کی خیر و فلاح کے لیے کام کرے۔ لہذا ایک ایسی سیاسی پارٹی کی ضرورت ہے، جس کی قیادت تو مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو، لیکن وہ بلا تفریق مذہب و ملت سب کی بھلائی کے لیے کام کرے۔“ ۱۸۔

ان کے نزدیک مسلم سیاسی جماعت کا قیام نہ صرف مسلمانوں کے حق میں ہے بلکہ اس سے دیگر اقوام کا بھی مفاد وابستہ ہے کیوں کہ اس مسلم جماعت کے قیام کی بنیاد عدل و انصاف اور امن و امان کو ملک میں قائم کرنا ہے اور مظلوم اور سماج کے دبے کچلے لوگوں کو انصاف دلانا ہے۔ راقم کا نظریہ اس سلسلہ میں یہ ہے کہ مسلم جماعت قائم کرنے کے بجائے ضرورت اس بات کی ہے کہ فرقہ پرست اور مسلم دشمن جماعت کو چھوڑ کر ہر سیاسی جماعت میں مسلمانوں کی ایک معتد بہ تعداد کی شمولیت ہو اور وہ لوگ اس پارٹی میں ایک مؤثر کردار ادا کریں اور اس کی پالیسیوں پر نہ صرف گہری نظر رکھیں بلکہ پالیسی ساز بننے کی کوشش کریں، ان کے ذہنوں میں ہمیشہ ملی مفاد مقدم رہے اور اگر کہیں اس جماعت کی پالیسی اور مسلمانوں کے ملی مفادات کے درمیان ٹکراؤ کی نوبت آئے تو ذاتی اغراض و مفاد سے بالاتر ہو کر صدائے احتجاج بلند کریں اور اگر ضرورت پڑے تو اس سیاسی جماعت سے علیحدگی اختیار کر لیں، کیوں کہ اصل مقصد مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ہے نہ کہ کسی خاص عہدہ کی حصولیابی، اگر مذکورہ تجویز کے مطابق ہر سیاسی جماعت میں مسلمان شامل ہوتے ہیں اور سرگرم رول ادا کرتے ہیں تو کسی بھی سیاسی جماعت کے اندر اتنی جرأت و ہمت پیدا نہیں ہوگی کہ مسلمانوں کے حقوق کو پامال کرنے کی کوشش کرے یا مسلم دشمنی پر مبنی کوئی قانون بنانے کا ارادہ بھی کرے۔

## اسلام مخالف پارٹی میں مسلمانوں کی شمولیت اور ووٹ:

اگر بعض ایسی سیاسی پارٹیاں الیکشن میں حصہ لیتی ہوں جنہوں نے اعلانیہ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کو اپنی جماعت کا مقصد بنالیا ہو لیکن ان کے بعض امیدوار ذاتی اعتبار سے نیک خصلت ہوں اور مسلمانوں کے ساتھ ان کا رویہ مناسب اور درست ہو تو مسلمانوں کے لیے ان کے جماعتی آئین و قوانین سے قطع نظر اشخاص و افراد کے ذاتی حالات کی بنا پر انہیں ووٹ دینا ناجائز اور حرام ہے اور اس طرح کی فسطائی اور فاشزم والی پارٹیوں میں مسلمانوں کی شمولیت قطعاً درست اور جائز نہیں ہے، اس لیے کہ مسلمانوں کے نزدیک سب سے زیادہ قیمتی اثاثہ اور متاع مذہب اسلام اور اس کے قوانین و احکام ہیں، اس لیے اسلام مخالف پارٹیوں میں کسی بھی طرح کی شمولیت اور ان کو ووٹ دینا درست نہیں۔ ۱۹

## غیر مسلم سیاسی جماعتوں سے معاہدہ اور انتخابی تال میل:

تکثیری معاشرہ میں جہاں مختلف مذاہب اور رنگ و نسل کے لوگ رہتے ہوں اور مسلمان اقلیت میں ہوں تو معاشرہ میں امن و امان کو قائم کرنے اور اپنے مذہبی قوانین و احکام کو آزادی کے ساتھ بجالانے کی غرض سے غیر مسلموں کے ساتھ معاہدہ کی اہمیت ہر دور میں مسلم رہی ہے۔ نبی کریم ﷺ کی تعلیمات ہر دور کے مسلمانوں کے لیے نمونہ عمل ہیں چنانچہ آپؐ جب مکہ سے مدینہ ہجرت کر کے آئے تو آپؐ نے ایسے دو امور انجام دیے جو مسلمانوں کی قومی زندگی کے لیے انتہائی دور رس اثرات کے حامل تھے۔ اول تو یہ کہ مسلمانوں کے دونوں گروہ یعنی انصار اور مہاجرین کے درمیان اخوت اور اٹوٹ اتحاد پیدا کرنے کے لیے مواخات کرائی یہ اسلام کے داخلی استحکام کا ذریعہ تھا اور دوسرے مدینہ کے با اثر غیر مسلم قبائل بالخصوص یہود سے انسانی، سماجی اور دفاعی اصولوں کی بنیاد پر معاہدے کیے جو اسلام کے لیے خارجی استحکام کا فارمولہ تھا۔ یہ میثاق مدینہ کے نام سے مشہور تھا، اس معاہدہ کی بنیادی شق یہ تھی:

”لِلْيَهُودِ دِينُهُمْ وَلِلْمُسْلِمِينَ دِينُهُمْ، مَوَالِيَهُمْ وَانْفُسُهُمْ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ وَاتَمَّ فَاِنَّهُ

لَا يُوْتَعِ اِلَّا نَفْسَهُ وَاهْلَ بَيْتِهِ“۔ ۲۰

اسی طرح مشرکین مکہ سے بھی آپؐ نے معاہدہ فرمایا تھا جس کا تفصیلی ذکر سورۃ التوبہ میں ہے:

”اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَیْكُمْ

اَحَدًا فَاتِّمُوا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰی مُدَّتِهِمْ“۔ (التوبہ: ۴)

(مگر وہ مشرکین جن سے تم نے معاہدہ کیا پھر انھوں نے تمہارے عہد میں کچھ کمی نہ کی اور تمہارے مقابل کسی کو مدد نہ دی تو ان کا عہد ٹھہری ہوئی مدت تک پورا کرو) دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

”فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ“۔ (التوبہ: ۷)

(تو جب تک وہ تمہارے لیے عہد پر قائم رہیں تم ان کے لیے قائم رہو)

یہود مدینہ اور مشرکین مکہ سے معاہدہ کیا جانا اس بات کی علامت ہے کہ بوقت ضرورت دیگر قوموں کے ساتھ معاہدہ کرنے میں امن و سلامتی کا راز مضمر ہے۔ عصر حاضر میں معاہدہ کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہی چیز قومی و بین الاقوامی سطح پر بقائے باہم کا ذریعہ بنتی ہے اور اسی کے ذریعہ شہریوں کے حقوق کے تحفظ میں آسانیاں فراہم ہوتی ہیں۔ مذکورہ اسوہ نبویؐ سے ہمیں اس بات کی روشنی ملتی ہے کہ ہم انتخابات کے موقع پر غیر مسلم سیاسی پارٹیوں کے ساتھ ملی مفادات کے تحت تال میل، معاہدے، ان میں شرکت اور ان کی حمایت حالات کا تجزیہ کر کے مصالحہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے کر سکتے ہیں، تاہم اس انتخابی تال میل میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ حالات اور مصالحہ جس کے متقاضی ہوں اس اعتبار سے معاہدے اور حمایت کا فیصلہ اس وقت کے مخلص، خیر خواہ مسلم قائدین کی صواب دید پر چھوڑ دیا جائے کہ اگر وہ ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ کسی خاص غیر مسلم جماعت سے تال میل کرنے میں مسلمانوں کے حقوق اور ملی مفادات کا تحفظ ممکن ہے تو اجتماعی طور پر اس کی حمایت کا فیصلہ کیا جائے تاکہ اس پارٹی پر مسلمانوں کا ایک دباؤ بنا رہے، کسی پارٹی کی حمایت کا فیصلہ انفرادی طور پر کرنا اور ٹکڑوں میں تقسیم ہونا اجتماعیت کے شیرازہ کو منتشر کرنے کے مترادف ہے اس سے اجتناب ضروری ہے کیوں کہ یہ ایک غیر دانش مندانہ فعل ہے۔ انتخابی تال میل کے لیے ان باتوں کے علاوہ مندرجہ ذیل امور کا بھی لحاظ کیا جانا ضروری ہے۔

۱۔ بڑے شر سے بچنے کے لیے چھوٹے شر کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ غیر مسلم سیاسی پارٹیوں کے ساتھ شرکت پر یہ امید اور توقع ہو کہ قانون ساز اداروں اور حکومت میں شریک ہو کر وہ مسلمانوں کے مذہبی اور قومی مفادات کو حاصل کرنے اور نقصانات سے بچانے میں کوئی اہم رول ادا کر سکیں گے۔

۳- باہمی تعاون اور اشتراک عمل سے اگر ایک اعتبار سے چند فوائد اور مصالح حاصل ہونے کی امید ہو اور دوسرے اعتبار سے مسلمانوں کے ملی اور مذہبی امور کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو پھر ”درء المفسد اولیٰ من جلب المصلح“ ۲۲ کے اصول کی روشنی میں انتخابی تال میل اور اشتراک جائز نہیں، کیوں کہ اصل چیز مسلمانوں کا اجتماعی ملی مفاد ہے، اگر وہ اشتراک اور غیروں کے ساتھ تال میل کرنے سے حاصل ہو تو غیر مسلم سیاسی جماعت کے ساتھ تال میل درست ہوگا ورنہ نہیں۔

### فرقہ پرست سیاسی جماعتیں اور مسلمان:

غیر مسلم معاشرہ اور ممالک میں بعض سیاسی پارٹیاں ایسی بھی ہوتی ہیں، جن کے مزاج، منشور اور دستور میں مسلمانوں کی مخالفت شامل ہوتی ہے، جو مسلمانوں کو ہر طرح سے دبانے کی کوشش کرتی ہیں، جن کا قیام فرقہ واریت کی بنیاد پر ہوتا ہے، جو اسلامی شعائر کو برداشت نہیں کر سکتیں، کھلم کھلا اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کرتی ہیں، قرآنی آیات پر پابندی کا مطالبہ کرتی ہیں اور مسلمانوں کی دل آزاری کرتی ہیں۔ ایسی جماعتوں میں شریک ہونا یا ایسی جماعت کو ووٹ دیکر اقتدار تک آنے میں تعاون کرنا گناہ میں تعاون کرنا ہے اور اللہ پاک کا حکم ہے:

”وَتَعَاوُنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوُنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ“۔ (المائدہ: ۲)

(نیکی اور خدا ترسی کے کاموں میں تعاون کرو اور گناہ اور ظلم کے کاموں میں تعاون نہ کرو)

چنانچہ اسلامی فقہ اکیڈمی نئی دہلی کے چودھویں اجلاس منعقدہ جون ۲۰۰۴ء، بہ مقام حیدر آباد میں ہندوستانی علماء اور فقہاء نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا ہے:

”جس سیاسی جماعتوں نے اعلانیہ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کو اپنی جماعت کا مقصد بنالیا

ہو ان میں مسلمانوں کی شمولیت جائز نہیں اور ان کے کسی امیدوار کو ووٹ دینا بھی جائز نہیں

ہے، خواہ وہ ذاتی طور پر نیک خصلت ہو“۔ ۲۳

اس فیصلے کا نچوڑ یہ ہے کہ انتخاب کے وقت یہ دیکھا جائے گا کہ امیدوار کس پارٹی سے تعلق رکھتا ہے اور اس پارٹی کا دستور و آئین کیا ہے، اگر وہ جماعت اسلام اور مسلم مخالف ہے تو کسی بھی صورت میں اس امیدوار کی حمایت نہیں کی جائے گی خواہ وہ امیدوار ذاتی طور پر اچھے اوصاف کا حامل ہو، مسلمانوں کے ساتھ اس کا رویہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہو تب بھی اس کو ووٹ دینا درست نہ ہوگا، کیوں کہ وہ پارٹی کے

منشور پر عمل کرے گا اور پارٹی میں ہونے کی وجہ سے اس کے مزاج، اصول اور قانون کی ضرور رعایت کرے گا، اس کی ذاتی خصلت کی وجہ سے اتنا فائدہ نہ ہوگا جتنا پارٹی کے منشور اور مزاج سے اسلامی معاشرہ اور مسلمانوں کو نقصان پہنچے گا اور چونکہ اس شخص سے فائدہ موہوم اور منشور کا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہونا یقینی ہے، لہذا یقینی کو موہوم کے تابع کر کے نہ ووٹ دینا جائز ہوگا اور نہ ایسی جماعتوں میں شمولیت درست ہوگی، کیوں کہ فقہی ضابطہ ہے ”الیقین لایزول بالشک“۔ ۲۴ تجربات یہ بتاتے ہیں کہ اس طرح کے امیدوار جب قانون ساز اداروں میں پہنچتے ہیں تو پارٹی کے نظریات سے بندھے ہونے کی وجہ سے مسلم دشمنی پر مبنی ایجنڈے کو اپنانے پر مجبور ہوتے ہیں اور پارٹی ان کو مسلمانوں کے خلاف بننے والے قوانین کے لیے ووٹ دینے کا حکم دیتی ہے اور اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ اپنی جماعت کے منشور سے ہٹ کر مسلمانوں کی حمایت کریں گے، تب بھی اس کو ووٹ دینے میں یہ امکان موجود ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس کی پارٹی اسی امیدوار کی وجہ سے اکثریت حاصل کر لے اور حکومت بنانے میں کامیاب ہو جائے، تو اس طرح اس پارٹی اور اس کے منشور کی حمایت لازم آئے گی، جو شرعاً جائز نہیں۔ قرآن کریم میں اللہ رب العزت واضح طور پر ارشاد فرماتا ہے:

”وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ“۔ (ہود: ۱۱۳)

(ظالموں کی طرف میلان نہ کرو پھر تمہیں آگ چھو لے گی)

اسلام دشمن پارٹیوں کے منشور میں تبدیلی اور مسلمانوں کا لائحہ عمل:

اب ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلام مخالف پارٹیاں اپنے منشور اور مزاج میں تبدیلی کر لیں اور اسلام مخالف سرگرمیوں سے باز آجائیں تو پھر مسلمانوں کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے؟ کیا انھیں محض منشور اور مزاج میں تبدیلی کی وجہ سے ان سیاسی جماعتوں کی حمایت کرنی چاہیے یا پھر سابقہ روش پر برقرار رہتے ہوئے ان پارٹیوں سے کلی اجتناب کرنا چاہیے؟ اس سلسلے میں پروفیسر سعود عالم قاسمی اپنے ایک مقالہ میں تحریر فرماتے ہیں:

”البتہ اگر ایسی سیاسی جماعت مسلم دشمنی کو اپنے ایجنڈے سے نکال دے اور ملک کے ہر طبقہ

کے ساتھ آئین و انصاف پر مبنی سلوک کرنے کا وعدہ کرے تو اس کے ساتھ بھی معاہدہ کیا

جاسکتا ہے۔ قرآن پاک میں اسلام دشمن عناصر کے تعلق سے مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ:

”وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ“۔

(الأنفال: ۶۱)

(اگر وہ صلح پر آمادہ ہوں تو تم بھی صلح کے لیے آمادہ ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو)۔“ ۲۵

پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی کا موقف یہ ہے کہ اگر فرقہ پرست جماعتیں اپنے منشور میں تبدیلی کر لیں اور مسلم دشمنی سے باز آجائیں تو ان کے ساتھ معاہدہ کیا جاسکتا ہے اور نہ صرف یہ کہ ان پارٹیوں میں شامل ہوا جاسکتا ہے بلکہ ان کے امیدواروں کو ووٹ بھی دیا جاسکتا ہے۔ تاہم اس سلسلے میں راقم کا نظریہ ہے کہ وہ سیاسی پارٹیاں جن کے عنصر اور منشور میں مسلم دشمنی شامل ہو اور مخالفت کی ایک طویل تاریخ رہی ہو تو ایسی پارٹیوں پر کسی بھی طرح اعتماد کرنا صحیح نہ ہوگا کیوں کہ اگر انھوں نے اپنے منشور میں تبدیلی کی ہے تو اس ترمیم اور تبدیلی کے عارضی ہونے کا قوی امکان ہے اور اندیشہ اس بات کا ہے کہ یہ پارٹیاں اپنے سابقہ روش پر لوٹ آئیں گی، ایسی بے شمار مثالیں ہیں جن کو اس بات کی دلیل کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے، خاص طور پر اگر ہندوستانی سیاست کے پس منظر میں دیکھیں تو یہ وبا عام ملے گی، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست اتر پردیش میں بہو جن سماج پارٹی جس پر مسلمانوں نے بار بار بھروسہ کیا اور اس کے حق میں رائے دہی کا استعمال کیا، اس نے اقتدار کو حاصل کرنے کے لیے بھارتیہ جنتا پارٹی جیسی فرقہ پرست جماعت سے تال میل کیا اور دو مرتبہ اسکی حمایت سے اقتدار پر قابض ہوئی۔ جھارکھنڈ میں جے ایم ایم نے بھی اسی طرح مسلمانوں کا ووٹ حاصل کر کے بھارتیہ جنتا پارٹی کی مدد سے اقتدار حاصل کیا۔ تامل ناڈو میں جے لتا نے بی جے پی کے ساتھ انتخابی سمجھوتہ کیا، مغربی بنگال کی ترنمول کانگریس کی متنازعہ جیت نے ۱۹۹۹ء میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت مرکز میں بنوانے میں سرگرم رول ادا کیا اور بھی کئی مثالیں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس طرح کی سیاسی پارٹیوں کا اپنا کوئی نظریہ نہیں ہوتا ہے اور یہ اقتدار، منصب اور عہدے کی لالچ میں کسی حد تک جاسکتی ہیں، لہذا مسلمانوں کو ان کی حمایت کرنے سے گریز کرنا چاہیے اور ان پارٹیوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے جن کا کردار سیکولر ہو اور جن کے منشور میں مسلم دشمنی شامل نہ ہو، کیوں کہ ایک سچے مومن اور مسلمان کی پہچان یہ ہے کہ وہ بار بار دھوکہ نہ کھائے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

”لا یلدغ المؤمن من جحر واحد مرتین“۔ ۲۶

(مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاسکتا ہے)

ہر حال میں خدا کی ذات پر توکل اور بھروسہ:

اصل چیز یہ ہے کہ غیر مسلم سیاسی جماعتوں سے اجتناب کیا جائے، لیکن تکثیری معاشرہ میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی پریشانی یہ ہے کہ وہ خود کو معاشرہ سے الگ نہیں کر سکتے اور نہ ہی اس معاشرہ کے افراد سے دوری اختیار کر سکتے ہیں، یہ ایک سماجی مجبوری ہے جس سے راہ فرار اختیار کرنا ممکن نہیں، اس لیے بدرجہ مجبوری غیر مسلم سیکولر کردار کی حامل سیاسی جماعتوں کی حمایت کی جاسکتی ہے، تاہم اس بات کا بھی خیال رکھا جانا ضروری ہے کہ ان پر کلی اعتماد اور بھروسہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ غیر مسلم قوتوں کے شر سے محفوظ رہنے کی تدابیر کرنا اور اللہ کی پناہ مانگنا مسلمانوں کی دینی ذمہ داری ہے۔ نبی کریم ﷺ نے باطل طاقتوں کی شرانگیزی سے محفوظ رہنے کے لیے امت کو اس دعا کی تعلیم دی:

”اللهم انا نجعلک فی نحورهم ونعوذ بک من شرورهم“۔ ۱۷

(اے اللہ ہم ان کی ریشہ دوانیوں میں آپ کا سہارا لیتے ہیں اور ان کے شر سے آپ کی پناہ مانگتے ہیں)

یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے یہود و کفار کی ریشہ دوانیوں کے اثر کو ختم کرنے کے لیے ان سے معاہدے کیے اور ہمیشہ اللہ کی پناہ طلب کرتے رہے جیسا کہ مذکور دعا سے ثابت ہوتا ہے۔ لہذا اگر غیر مسلم سیاسی پارٹیوں کی حمایت معاشرتی ضرورت اور مصلحت کے پیش نظر کرتے ہیں تو ہمیں اپنے فیصلے کی تائید اللہ کی پناہ میں جا کر حاصل کرنی چاہیے۔

سیاست میں مسلمانوں کی شرکت اور فقہ اکیڈمی نئی دہلی کے فیصلے:

اسلامک فقہ اکیڈمی نئی دہلی ۲۸ کے چودھویں اجلاس منعقدہ ۲۰-۲۲ جون ۲۰۰۴ء بہ مقام حیدرآباد میں ہندوستان کے علماء و فقہاء نے تکثیری معاشرہ میں رہنے والے مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کرتے ہوئے متعدد فیصلے کیے جو سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فیصلے مندرجہ ذیل ہیں:

۱- اسلام کا اپنا ایک مستقل نظام حکمرانی ہے، لیکن موجودہ عالمی حالات میں دوسرے غیر اسلامی نظام ہائے حکمت کے مقابلہ میں مروج جمہوری نظام ہی مسلم اقلیتوں کے لیے قابل ترجیح ہے، لہذا اس نظام کے تحت مسلمانوں کا الیکشن میں حصہ لینا، امیدوار بننا، ووٹ دینا اور کسی امیدوار کے لیے انتخابی مہم چلانا

جائز ہے۔

۲۔ مسلمانوں کے ملی و مذہبی مفادات کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ووٹ دینے کا قانونی حق بھرپور طریقے سے استعمال کریں۔

۳۔ جن سیاسی جماعتوں نے اعلانیہ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کو اپنے جماعت کا مقصد بنالیا ہو، ان میں مسلمانوں کی شمولیت جائز نہیں اور ان کے کسی امیدوار کو ووٹ دینا بھی جائز نہیں ہے، خواہ وہ ذاتی طور پر نیک خصلت ہو۔

۴۔ جمہوری سیکولر سیاسی پارٹیوں سے ملی مفادات کے تحت معاہدے کیے جاسکتے ہیں۔ ۲۹

ہندوستانی سیاست اور مسلمان:

ہندوستان کی شناخت کبھی مسلم ملک کی حیثیت سے ہوتی تھی، مگر آج یہ ایک جمہوری ملک ہے جس کی اکثریت غیر مسلموں پر مشتمل ہے اور نظام حکومت سیکولر ازم، نیشنل ازم اور ڈیموکریسی کا پابند ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جمہوریت کی تعریف کر دی جائے اور یہ تحریر کر دیا جائے کہ جمہوریت کے عناصر کیا ہیں اور ہندوستان بہ حیثیت ایک جمہوری ملک کس حد تک کامیاب ہے؟

جمہوریت کی تعریف:

دانش وروں نے جمہوریت کی مختلف تعریف کی ہے، چنانچہ سیلی کے نزدیک جمہوریت اس حکومت کو کہتے ہیں جس میں ہر شخص حصہ لے، ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر ابراہیم لنکن نے اس کی جامع اور مکمل تعریف کی ہے کہ ”جمہوریت عوام یا جمہور کی وہ حکومت ہے جو جمہور کے فائدے کے لیے جمہور ہی کے ذریعے چلائی جاتی ہو“۔ ۳۰

جمہوریت کی بقا کے لیے تین اداروں کا ہونا بہت ضروری ہے:

۱۔ مقننہ، یعنی قانون بنانے والے ادارے۔

۲۔ انتظامیہ۔

۳۔ عدلیہ۔ ۳۱

ان تینوں اداروں کی ذمہ داریاں الگ الگ ہیں۔ مقننہ کا کام قانون بنانا ہوتا ہے، انتظامیہ کے ذریعہ قوانین کا نفاذ عمل میں آتا ہے اور عدلیہ کی ذمہ داری جواب دہی طے کرنا اور قانون شکنی پر سزا تجویز



کرنا ہوتا ہے اور مقننہ کے ذریعہ بنائے گئے قانون پر عمل آوری اور تحفظ کا ذمہ عدلیہ پر ہی ہے۔  
 بنیادی طور پر جمہوریت کے یہی تین ستون ہیں، لیکن میڈیا کو چوتھا ستون قرار دیا گیا ہے،  
 کیوں کہ اس کے ذریعے سماج کی صحیح منظر کشی حکومت کے سامنے ہوتی ہے اور ظلم و استحصا ل اور بدعنوانیوں  
 کی طرف حکومت اور انتظامیہ کو متوجہ کرنا میڈیا کا بنیادی اور اخلاقی پیشہ ہے، بسا اوقات میڈیا کی بیداری  
 عدم مساوات اور ظلم و زیادتی کا قلعہ قمع کرتی ہے اور مستحقین کو ان کا حق دلاتی ہے۔

ہندوستان میں جمہوریت کی عملی شکل:

نیشنل ازم اور سیکولر ازم کسی بھی ملک کی جمہوریت کی روح ہوتے ہیں، ان دونوں میں کوئی ایک  
 بھی اگر کمزور ہو جائے تو جمہوریت کا ڈھانچہ مجروح ہو جاتا ہے۔ ہندوستان میں اس کی بنیاد ابتدا میں ہی  
 کمزور ہو گئی تھی، آزادی کی لڑائی میں نیشنل ازم کی بنیاد تو مضبوط تھی، لیکن کہا جاتا ہے کہ آزادی کے بعد  
 محمد علی جناح کے نعروں نے اسے متزلزل کر دیا، کیوں کہ سیکولر ازم کی جگہ کمیونل ازم نے لے لی جس کے نتیجے  
 میں یہ ملک دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ (یہاں یہ واضح رہے کہ اس بات کی تہہ میں جانا ضروری ہے کہ کیا  
 واقعی محمد علی جناح تقسیم ہند کے ذمہ دار تھے یا پھر اس کے پس پردہ دیگر اسباب و عوامل کار فرما تھے، جیسا کہ  
 جسونت سنگھ نے اپنی کتاب میں تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے اور تقسیم کے لیے نہرو کو زیادہ ذمہ دار قرار دیا  
 ہے۔ ۳۲) بہر حال ہندوستان میں سیکولر ازم کو اپنا یا گیا جس کے نتیجے میں تمام تر خامیوں کے باوجود  
 جمہوریت برقرار ہے۔

جمہوری ہندوستان کے کمزور پہلو:

ذات پات اور مذہب کے نام پر آج بھی یہاں اقتدار کے اعلیٰ پائیدان تک پہنچا جاسکتا ہے اور  
 اقتصادی عدم مساوات کا یہ عالم ہے کہ آج بھی بیش تر کسان اسی لکڑی کے ہل سے کھیتی کرتے ہیں جسے دو  
 بیل یا بعض اوقات دو انسان بھی کھینچتے ہیں۔

جمہوریت کے لحاظ سے ہندوستان دنیا کا سب سے بڑا ملک مانا جاتا ہے، لیکن دراصل حکمرانی کی  
 اصل طاقت چند ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ اس جمہوریت کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ عوام کی جانب سے  
 منتخب کیے بغیر کوئی بھی شخص وزیراعظم کی کرسی تک پہنچ سکتا ہے (جیسا کہ موجودہ وزیراعظم منموہن سنگھ براہ  
 راست عوام کے ذریعہ منتخب نہیں ہیں بلکہ آسام سے راجیہ سبھا کے ممبر ہیں)۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے گھ

جوڑ کی سیاست میں ایسا شخص بھی اعلیٰ عہدے پر پہنچ جاتا ہے جسے واضح اکثریت حاصل نہیں ہوتی جیسا کہ پانچ سو پینتالیس نشستوں والی پارلیمنٹ میں صرف ۵۴ ارکان کی بنیاد پر ۱۹۹۱ء میں چندر شیکھر کانگریس کی حمایت سے وزیر اعظم کی کرسی پر فائز ہو گئے تھے اور ماضی قریب میں ہندوستانی ریاست جھارکھنڈ میں ایک آزاد ممبر اسمبلی مدھو کوڑا وزیر اعلیٰ کی کرسی پر پہنچ گئے۔

ہم نے ماقبل میں جیسا کہ ذکر کیا کہ مجلس عاملہ، مجلس مقننہ، عدلیہ اور میڈیا کو جمہوریت کا ستون کہا جاتا ہے۔ مجلس عاملہ کا براہ راست تعلق پارلیمنٹ سے ہوتا ہے۔ ہندوستان میں پارلیمنٹ ملک کے عوام کی نمائندگی کرنے والا سپریم ادارہ مانا جاتا ہے۔ ۳۳ اس ادارے کی خاص بات یہ ہے کہ سبھی قانون یہی ادارہ بناتا ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ قانون توڑنے والوں کو اپنے اندر آنے سے روک نہیں پاتا، کئی ایسے ارکان اس ادارے میں شامل ہیں، جن کا تعلق جرائم کی دنیا سے رہا ہے۔ اس ادارے کی کارروائی پر نظر ڈالیں تو گذشتہ بیس سالوں سے ۳۶۵ دنوں میں یہاں کی کارروائی کا اوسط ۸۰ دن کا رہا ہے۔ جب کہ برطانیہ کے ہاؤس آف کامنس کے اجلاس کا اوسط ۷۰ دن اور امریکی کانگریس کا اوسط ۵۰ دن کا ہے۔ اسی

ہندوستان کی جمہوریت کا ایک کمزور پہلو یہ بھی ہے کہ ۶۲ کروڑ سے زیادہ ووٹروں والے اس ملک میں آدھے سے بھی کم لوگ ووٹ ڈالتے ہیں، اس پر بھی تیس سے چالیس فیصد پانے والا امیدوار جیت جاتا ہے، یعنی تقریباً ۱۲ کروڑ ووٹروں کے نمائندے ہی کامیاب ہوتے ہیں۔

’ستیہ میو جینے‘ ہندوستانی عدلیہ کا نعرہ ہے، لیکن عوامی تاثر یہ ہے کہ جتنا بڑا گھوٹالہ ہوگا قصور واروں کو سزا ملنے کی امید اتنی ہی کم ہوگی۔ چاہے ۱۹۷۰ء کی دہائی کا ماروتی گھوٹالہ ہو، ۱۹۸۰ء کی دہائی کا بونفوس گھوٹالہ ہو، ۱۹۹۰ء کی دہائی کا شیئر مارکیٹ گھوٹالہ ہو یا پھر بہار کا چارہ گھوٹالہ۔ ان سبھی گھوٹالوں کے قصور واروں کو کیفر کردار تک پہنچانے میں عدالتی سست روی اور جانب داری کا ہی مظاہرہ ہوا ہے، جس کی وجہ سے عدالتی نظام کا منفی اثر عوام کے ذہنوں پر پڑا ہے۔ شاید اسی لیے ہندوستان کے سابق صدر کے آر نرائن نے اپنے دور صدارت میں کہا تھا:

”جرائم پیشہ افراد سیاست دانوں اور سماج کے اہم شخصیتوں کے درمیان ایک نیا گٹھ جوڑ پنپنے

لگا ہے جس کی وجہ سے جرم اور تشدد میں اضافہ ہو رہا ہے، ان سے نمٹنے کے لیے قانون

سازوں کو پھر سے قانون بنانا چاہیے۔“ ۳۵

میڈیا کو جمہوریت کا چوتھا ستون مانا جاتا ہے، جس کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ سماج کے دبے کچلے افراد کی آواز بنے اور غیر جانبداری کے ساتھ خبروں کی ترسیل کا ذریعہ بنے لیکن ہندوستانی میڈیا نے ہمیشہ جانب داری کو فروغ دیا ہے اور بسا اوقات اس نے تعصب سے کام لیا ہے۔ ہندوستان میں دہشت گردانہ حملوں میں ملوث افراد اگر مسلمان ہیں تو اخبارات صفحات کو سیاہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے اور الیکٹرانک میڈیا میں گھنٹوں اس بات پر بحث ہوتی ہے کہ دہشت گرد کا تعلق اسلام اور مسلمان سے ہے اور ہر شرعی ڈاڑھی والا مسلمان دہشت گرد ہے، جب کہ اگر مسلمانوں کی عبادت گاہوں، خانقاہوں اور مزاروں پر اس طرح کے حملے ہوتے ہیں اور ان میں ہندو دہشت گرد گرفتار ہو جائیں تو یہ خبر برائے نام اخباروں اور ٹیلی ویژن میں نظر آتی ہے بلکہ کوشش اس بات کی ہوتی ہے کہ انہیں معصوم قرار دیا جائے، جیسا کہ مالگاوں بم دھماکے میں گرفتار سادھوی پرگیہ کے معاملے میں ایسا ہو رہا ہے۔

جمہوریت کے جب ان تمام ستونوں میں شکاف ہو اور ان سے متعلق افراد اپنے فرائض کی ادائیگی کے تئیں غیر ذمہ دار ہوں تو بھلا کس طرح جمہوریت کو مکمل کامیاب قرار دیا جاسکتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ چاہے مجلس عاملہ ہو، مجلس مقننہ ہو، عدلیہ ہو یا میڈیا، ہر جگہ خوش حال اور با اثر طبقے کا ہی قبضہ ہے اور جانب داری کا عنصر ان تمام ستونوں میں سرایت کر چکا ہے۔ ایک آزاد اور جمہوری ملک کے طور پر نصف صدی سے زائد کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ایسا لگتا ہے کہ نہ تو آزادی کا مقصد ہی مکمل ہو پایا ہے اور نہ ہی جمہوریت کے ان ستونوں میں حقیقی استحکام پیدا ہو سکا ہے۔

### مسلمانوں کی سیاسی حکمت عملی:

جمہوری ہندوستان میں مسلمان تعداد کے لحاظ سے اقلیت میں ہیں تاہم ہندوستانی مسلمان اپنے مذہبی امور کی انجام دہی میں آزاد ہیں۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور قربانی کی ان کو اجازت ہے، تبلیغ اور اشاعت دین کی بھی ان کو آزادی حاصل ہے، وہ اپنے مدارس اور مساجد بھی قائم کر سکتے ہیں، تعلیم اور رفاہی ادارے بھی کھول سکتے ہیں۔ غیر سودی لین دین پر مبنی مالیاتی نظام بھی قائم کر سکتے ہیں۔ مسلم پرسنل لا یعنی عائلی قوانین پر عمل کر سکتے ہیں۔ اپنے مقدمات کے تصفیہ کے لیے دارالقضا بھی قائم کر سکتے ہیں اور سیاسی قوت حاصل کرنے کے لیے انتخابی سیاست میں بھی شرکت کر سکتے ہیں۔

اب اہم سوال یہ ہے کہ ہندوستانی آئین نے مسلمانوں کو سیاسی حقوق بھی عطا کیے ہیں اور انہیں نہ



بدترین سماجی اور اقتصادی صورت حال سے دوچار مسلمانوں کے مسائل کے تدارک میں ذرا سی بھی دلچسپی نہیں لے رہی ہیں اور مسلمان اپنے وٹوں کی طاقت کے باوجود بے دست و پا ہیں۔

ایسی نازک صورت حال میں مسلمانوں کی حکمت عملی یہ ہونی چاہیے کہ وہ اپنی صفوں سے اختلاف اور انتشار کو فراموش کر کے کلمہ کی بنیاد پر متحد و متفق ہو جائیں تاکہ ان کی بازگشت سیاسی گلیاروں میں ایک وزن اور اہمیت پیدا کر سکے۔

اسی اتحاد و اتفاق کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا اسرار الحق قاسمی لکھتے ہیں:

”سیاسی طور پر اس وقت کہا گیا کہ من موہن سنگھ کو اس لیے وزیر اعظم بنایا گیا تاکہ گولڈن ٹیمپل کی تلافی کی جاسکے اور سکھ فرقہ کی ناراضگی دور کی جاسکے، لیکن ایسا اشارہ کبھی نہیں دیا گیا جس سے یہ ظاہر ہو کہ بابر مسجد کی تلافی کرنے اور مسلمانوں کو قریب لانے کی کوئی سنجیدہ کوشش کی جارہی ہے۔ دو فیصد کی ناراضگی کا اتنا خیال مگر ۲۰ فیصد کی ناراضگی کی کوئی پرواہ نہیں۔ ایسا محض اس لیے ہوا کہ ۲۰ فیصد وہ اتحاد و اتفاق نہ پیدا کر سکے جو دو فیصد سکھوں میں پایا جاتا ہے۔ اگر بابر مسجد کی شہادت کے وقت تمام مسلم ممبران پارلیامنٹ اور ان کے قائدین ہر قسم کی سیاسی وابستگی سے اوپر اٹھ کر حکومت کے خلاف متحد ہو جاتے تو آج یہ صورت حال نہ ہوتی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمیں حادثات بھی متحد کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ غرضیکہ اتحاد و اتفاق کے سلسلے میں حکمت عملی ضروری ہے۔“ - ۷۷

مسلم نمائندوں کی مسلم مسائل سے عدم دلچسپی:

مسلمانوں کے لیے ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ایک تو ان کی لیڈر شپ متحد اور مخلص نہیں، دوسرے ان کا قومی و سیاسی ویژن اور مشن بھی بالکل دھندلا ہے۔ چودھویں پارلیامنٹ میں کسی مسلم ایم پی نے ڈیڑھ سال تک نہ کسی مسئلے پر سوال اٹھایا نہ تجویز رکھی نہ پندرہ نکاتی پروگرام یا مسلمانوں سے متعلق امور میں سے کسی معاملہ پر بحث کی۔ سچ پوچھیے تو آزاد ہندوستان میں ہماری صحیح صورت حال کو واقعی سیکولر ایماندار غیر مسلم دانشوروں نے پیش کیا، اس سلسلے میں مشہور کالم نویس برکھادت کا وہ مضمون پڑھنے کے لائق ہے جو روزنامہ ہندوستان ٹائمز نے اپنے شمارہ میں شائع کیا ہے، جس میں برکھادت نے مسلمانوں کو اس ملک کی تعمیر و ترقی اور آزادی میں برابر کا شریک قرار دیتے ہوئے کہا کہ مجھے حیرت ہوتی ہے جب لوگ مسلمانوں

سے ملک سے وفاداری پر ثبوت مانگتے ہیں۔ ۳۸

مسلمانوں نے اپنی ہزار سالہ تاریخ میں اس ملک کی تہذیب و ثقافت اور اخلاق و انسانی شرف کوئی بلندیاں عطا کی ہیں۔ اس سلسلے میں رام گڑھ کے انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس (۱۹۴۰ء) میں صدر آل انڈیا کانگریس کی حیثیت سے مولانا ابوالکلام آزاد نے فرمایا تھا کہ:

”ہندوستان کو اسلام نے جو کچھ عطا کیا ہے ان میں جمہوری افکار و نظریات سب سے

نمایاں ہیں۔“ ۳۹

مسلم نمائندوں کی یہ سیاسی بے حسی یقیناً ان مسلمانوں کے لمحہ فکریہ ہے جو بڑی تمناؤں اور توقعات کے ساتھ قانون ساز اداروں میں انھیں بھیجتے ہیں۔ ایسے میں مسلمانوں کو ان سیاسی رہنماؤں سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے اور ان کا احتساب کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ان میں احساس ذمہ داری اور فرض شناسی کا جذبہ پیدا ہو اور مسلمانوں کی دیرینہ آرزوؤں کی تکمیل ہو۔

خلاصہ:

ہندوستان کے باشندے کی حیثیت سے مسلمانوں کو دیگر برادران وطن کی طرح تمام طرح کے حقوق و مراعات حاصل ہیں، انہیں مذہبی آزادی حاصل ہے، اظہار رائے کی آزادی حاصل ہے اور سیاسی طور پر سرگرم ہونے کی آزادی حاصل ہے لہذا مسلم قوم کی دانش مندی اور عقل مندی اس بات میں ہے کہ وہ آپسی تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنی سیاسی قوت منوائیں اور مسلم قوم سے وابستہ جو سیاسی راہنما ہیں وہ ان امیدوں اور توقعات کے امین بنیں جو لوگوں نے ان کی ذات سے وابستہ کر رکھی ہیں۔ اگر مسلمان اور ان کے نمائندوں میں احساس ذمہ داری پیدا ہو جائے تو تمام مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے اور پھر کوئی مسلمانوں کے ملی مفادات پر گزند پہنچانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ان کے عقائد و شعائر کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہیں کر سکتا اور نہ ان کی زبان و تہذیب کو ان سے جدا کرنے کی حماقت کر سکتا ہے۔

سماجی مسائل:

غیر مسلم معاشرہ میں جہاں غیر مسلموں کی اکثریت ہو اور مسلمان اقلیت میں ہوں، وہاں ایسے بے شمار سماجی مسائل پیدا ہوتے ہیں جن کا شرعی حل ڈھونڈنا ضروری ہے۔ اسلام نے دیگر اقوام کے ساتھ باہمی رابطے سے نہ منع کیا ہے اور نہ ہی تعلقات رکھنے سے منع فرمایا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ رب

العزت ارشاد فرماتا ہے: ”لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ“۔ (الممتحنہ: ۸) یہ آیت کریمہ ہمارے ذہنوں کے ان شکوک و شبہات کو دور کر رہی ہے جو تکثیری معاشرہ میں غیر اقوام کے ساتھ ہمارے تعلقات اور برتاؤ کو لے کر پیدا ہوتے ہیں کہ کیا ہمارے لیے یہ درست ہے کہ ہم سماجی طور پر ان کے ساتھ میل جول رکھیں۔ اس آیت کریمہ کی روشنی میں واضح طور پر یہ اصول وضع کیا جاسکتا ہے کہ معاشرتی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے لازم ہے کہ اپنے دوست یا پڑوسی کو کوئی خوشی یا غم لاحق ہو تو ان کی خوشی یا دکھ درد میں دوسرا دوست یا پڑوسی شریک رہے، ہر ایک کے ساتھ اخلاق کا نمونہ پیش کرے، اگر ان کے گھر موت واقع ہو جائے یا وہ کسی پریشانی اور مصیبت میں مبتلا ہو جائیں تو ان کے گھر جا کر ان کی تعزیت کرے، تسلی کے الفاظ بولے بوقت ضرورت ان کا تعاون کرے اور خبر گیری کرتا رہے، ایسا کرنا اسلامی تعلیمات اور اس کے مزاج کے عین مطابق ہے، احادیث کی کتابوں میں اس طرح کے اخلاق برتنے اور پڑوسیوں کے حقوق ادا کرنے اور ان کے دکھ درد میں شریک ہونے کے متعدد واقعات ملتے ہیں اور خود نبی کریم ﷺ کی پوری زندگی اس کا عملی نمونہ ہے۔

### معاشرہ میں قیام امن:

غیر مسلم اقوام کے ساتھ معاشرہ میں رہتے ہوئے مسلمان کو بہت سارے سماجی مسائل درپیش آتے ہیں اور ان تمام کی بنیادی وجہ مذہب و تہذیب کا اختلاف ہے بایں وجہ سماج میں عدم اعتماد کی فضا قائم رہتی ہے اور انتشار و بد امنی کا اندیشہ ہمیشہ بنا رہتا ہے، ایسی صورت حال میں مسلمانوں کے لیے پریشانی یہ ہے کہ کیا وہ اس معاشرہ سے کنارہ کش ہو جائیں یا پھر اختلاف کی فضا قائم رہنے یا قیام امن کے لیے اور بد امنی کے خاتمے کے لیے غیر مسلموں کے ساتھ تعاون کریں اور عوامی فلاح و بہبود اور نیکی کے کاموں میں حصہ لیں۔ اس سلسلے میں نیل الأوطار کی یہ عبارت قابل ملاحظہ ہے:

”لا حرج فی الاسلام من قیام الدولة المسلمة مع المخلصین من غیر المسلمین سواء كانوا من اهل الكتاب أم من غیرهم أتباع الديانات الأخری وذلك من أجل تحقیق الخیر المشترك والدفاع عن المصالح العامة والتعاون علی اقامة العدل ونشر الأمن وصيانة الدماء أن تسفک وحماية

الحرمات أن تنهك ولو على شروط يبدو فيها بعض الأحجاف ، عملا بالمثل  
الرائع الذي وضعه لنا الرسول ﷺ في صلح الحديبية: والله لاتدعوني  
قريش الى خطة يسألوني فيها صلة الرحم ويعظمون فيها حرمت الله الا  
اعطيتهم اياه“۔ ۴۰

(اسلام میں کوئی حرج نہیں کہ اسلامی حکومت مخلص غیر مسلموں سے تعاون کرے، وہ غیر مسلم  
اہل کتاب ہوں یا دوسرے مذاہب کے ماننے والے ہوں، یہ اس لیے ضروری ہے کہ اس  
طرح مشترکہ بھلائی کے کام متحقق ہو سکتے ہیں اور مصالح عامہ کی تکمیل ہو سکتی ہے، عدل قائم  
کرنے میں تعاون ہو سکتا ہے، امن پھیل سکتا ہے، خون ریزی سے بچا جاسکتا ہے، عزتوں کی  
بربادی سے بھی بچا جاسکتا ہے، بلکہ ایسی شرطوں پر تعاون بھی ہو سکتا ہے جن میں بہ ظاہر  
مسلمانوں کی کمزوری کا اظہار ہوتا ہے، یہ حضور اکرم ﷺ کی شاندار مثال پر عمل ہوگا، جو آپ  
نے صلح حدیبیہ میں ہمارے لیے وضع فرمائی تھی۔ الفاظ تھے: بخدا قریش بھی مجھے جب ایسی  
بات کی طرف بلائیں گے جس میں وہ صلہ رحمی کے طالب ہوں گے اور اللہ کی حرمتوں کی تعظیم  
کریں گے تو میں وہ انھیں عطا کر دوں گا)

یہ ضابطے ان حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے بنائے گئے جب مسلمانوں کی حکومت ہو اور وہ اکثریت  
میں ہوں تو قیام امن کے لیے، عزت و ناموس کی حفاظت کے لیے اور عدل قائم کرنے کے لیے کسی بھی  
حد تک غیر مسلموں کے ساتھ تعاون کیا جاسکتا ہے حتیٰ کہ ان مقاصد کی تحصیل کے لیے مسلمانوں کو اگر شروط  
پر بھی آمادہ ہونا پڑے تو بھی ہر ممکنہ صورت میں تعاون کیا جائے گا۔ جب اکثریت کی صورت میں مسلم  
حکومت صلح حدیبیہ کو اپنے لیے نظیر بنا سکتی ہے تو جب مسلمان اقلیت میں ہوں اور تکثیری معاشرہ میں رہائش  
پذیر ہوں تو بدرجہ اولیٰ ان کی یہ سماجی ذمہ داری ہے کہ وہ معاشرتی زندگی کو خوش گوار بنانے کے لیے،  
خوف و ہراس کا ماحول ختم کرنے اور سکون کی فضا بحال کرنے کے لیے غیر مسلموں کے ساتھ تعاون کریں،  
ان کے ساتھ خیر کا معاملہ کریں، کیوں کہ اس امت کو اللہ نے قرآن کریم میں خیر امتہ کے لقب سے  
پکارا ہے، کنتم خیر امتہ (آل عمران: ۱۱۰)۔

قیام عدل و امن کے سلسلے میں علامہ زحیلی فرماتے ہیں:

”والخلاصة أن الاسلام لايتوانى لحظة واحدة عن سعيه لاقامة علاقات طيبة



مع غیر المسلمین لتحقيق التعاون البناء فی سبیل الخیر والعدل والبر والأمن  
وحماية الحرمات ونحو ذلك“۔ ۴۱

(خلاصہ کلام یہ ہے کہ یقیناً اسلام ایک لمحہ کے لیے اپنی اس تگ و دو میں سستی نہیں کرتا کہ غیر  
مسلموں کے ساتھ پاکیزہ رابطے رکھے تاکہ ایسے تعاون کا تحقق ہو سکے، جو خیر کے راستے،  
عدل، نیکی، امن اور عزتوں کے تحفظ پر مبنی ہو۔)

اسلام چونکہ سراپا سلامتی، عدل و انصاف، رواداری اور فلاح انسانیت کا مذہب ہے اس لیے  
غیر مسلم معاشرہ میں مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ پاکیزہ روابط اور تعلقات رکھنے کی اجازت ہے جیسا  
کہ ماقبل میں ذکر کردہ آیت کریمہ اور علامہ شوکانی و علامہ زحیلی کی عبارتوں کی روشنی سے واضح ہوا۔ یہاں  
یہ بات قابل لحاظ ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات اسی وقت تک رکھے جائیں گے جب تک ان کے  
ساتھ معاشرت مسلمانوں کے مذہبی امور پر اثر انداز نہ ہو اور اگر اثر انداز ہو تو پھر کسی صورت میں بھی ان  
کے ساتھ تعلقات بحال رکھنا درست نہ ہوگا کیوں کہ حضور اکرم ﷺ نے صلح حدیبیہ کے وقت جو ارشاد فرمایا  
تھا کہ جب تک اللہ کی حرمتوں کی تعظیم کریں گے میں انھیں عطا کروں گا۔

معاشرہ میں قیام امن کے لیے اجتماعی تنظیم کا قیام:

ماقبل میں یہ بات گذری کہ قیام امن و عدل و انصاف کے لیے غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات  
رکھنے میں کوئی قباحت نہیں ہے کیوں کہ امن و سلامتی کی فضا قائم کرنا امت مسلمہ کا شرعی فریضہ ہے چنانچہ  
اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اگر غیر مسلموں کے ساتھ اجتماعی طور پر کام کرنے کی ضرورت پیش آئے  
تو یہ تعاون علی البر والتقویٰ کے قبیل سے ہے جو شریعت کے نزدیک مطلوب و محمود ہے۔ خود نبی کریم  
ﷺ نے نبوت سے پہلے حلف الفضول میں شرکت کی تھی۔ یہ مشترکہ سماجی کاموں کی تکمیل کے لیے ایک  
روشن مثال ہے۔ ہوا یہ تھا کہ کپڑے کا ایک تاجر مکہ میں لٹ گیا تھا، وہ اپنی فریاد لے کر با اثر لوگوں کے  
پاس دوڑتا رہا مگر اس کو راحت نہیں ملی، یہ دیکھ کر مکہ کے غیرت مند نوجوانوں نے عبداللہ بن جدعان کے  
گھر پر ایک میٹنگ بلائی اور اس میں ایک ایسی انجمن بنائی جس کا منشور یہ تھا کہ آئندہ کوئی شخص باہر سے  
آئے تو ہم اس پر ظلم نہیں ہونے دیں گے، اس کی حفاظت کریں گے اور پُر امن ماحول فراہم کریں گے، اگر  
کوئی ظلم کرے گا تو ہم سب اس کا مقابلہ کریں گے۔ نبوت ملنے کے بعد رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے کہ آج

بھی اگر مجھ کو ایسی انجمن میں شرکت کے لیے بلایا جائے تو میں اس کو سرخ اونٹ حاصل کرنے پر ترجیح دوں گا۔ ۴۲۔ آپ کا یہ طرز عمل اس بات کی دلیل ہے کہ اجتماعی تنظیم قائم کرنا، سماجی انجمنیں بنانا، رفاہی ادارے کھولنا اور انسانی خدمت کے کام انجام دینا مشترکہ طور پر درست اور صحیح ہے۔ اجتماعی تنظیم یا ادارے قائم کرنے سے قبل چند چیزوں کا لحاظ ضروری ہے۔

(۱) سب سے پہلے دستور اور آئین مرتب کیے جائیں

(۲) دستور عدل و انصاف پر مبنی ہو

(۳) مسلم اور غیر مسلم سب اس کے قانون کی نظر میں برابر ہوں

(۴) تنظیم میں غیر مسلموں کی اکثریت نہ ہو

(۵) حتی الامکان اس کے اہم اور بڑے شعبے مسلمانوں کی نگرانی میں ہوں

(۶) غیر مسلموں سے بقدر ضرورت تعاون لیا جائے

(۷) اصل مقصد قیام امن و عدل و انصاف اور انسانیت کی خدمت بلا تفریق مذہب و

ملت ہو۔

غیر مسلموں سے ہدایا قبول کرنے کی شرعی حد:

مشترکہ سماج میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے ایک مسئلہ یہ ہے کہ چونکہ یہ عام معاشرتی مزاج ہے کہ آپسی تعلقات کو خوشگوار بنانے اور استوار رکھنے کے لیے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ تحفہ و ہدایا کا تبادلہ کرتے ہیں اور بسا اوقات اس کے مثبت اثرات دیکھے گئے ہیں ایسی صورت میں مسلمانوں کا کیا طرز عمل ہونا چاہیے، کیا انھیں تحفے تحائف قبول کرنے چاہیے اور کیا انھیں خود غیر مسلموں کو ہدایا بھیجنا چاہیے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر معاشرہ کی کچھ اقدار ہوتی ہیں، اگر وہ شرک نہیں ہیں تو اسلام ان سے کبھی منع نہیں کرتا۔ لہذا غیر مسلم کے تحفے اور تبرکات کو مسلمانوں کے لیے قبول کرنا اور کھانا درست ہے، اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، ترمذی کی روایت ہے کہ قبصہ بن ہلب نے آپؐ سے طعام و نصاریٰ کے بارے میں دریافت کیا، تو آپؐ نے فرمایا کہ تمہارے سینہ میں کوئی شک و شبہ نہ ہو (یعنی طعام نصاریٰ حلال ہے)۔ ”عن قبصة بن وهلب عن ابيه قال: سألت النبي عن طعام النصارى فقال لا يتخلجن في صدرك طعام ضارعت فيه النصرانية“۔ ۴۳۔ البتہ اگر یہ تبرکات اور تحفے بتوں پر چڑھائے

ہوئے ہوں تو پھر قبول کرنا شرعاً جائز نہیں۔ کیوں کہ یہ ماذبح علی النصب کے مترادف ہے جس سے قرآن کریم میں منع کیا گیا ہے، ارشاد ہے: ”وَمَا ذُبَحَ عَلَى النُّصْبِ“ (المائدہ: ۳) تم پر حرام کیا گیا ہے مردار اور جو جانور پرستش گاہوں پر ذبح کیا جائے۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ”أَهْلُ لَغَيْرِ اللَّهِ بِهِ“ (المائدہ: ۳) پرشاد اور چڑھاوا بھی اسی حکم میں ہے، کیوں کہ وہ غیر اللہ کے نام پر چڑھایا ہوا ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ شرک کی تعظیم لازمی آتی ہے، امام ابو بکر جصاص آیت مذکور کی تفسیر کرتے ہوئے کہتے ہیں: ”یوجب تحریمها اذا سمی علیہا باسم غیر اللہ“۔ ۴۴ مزید جزئیات کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں: ”وقال ابو حنیفہ وأبو یوسف ومحمد وزفر ومالک والشافعی لا تؤکل ذبائحهم اذا سموا علیہا باسم المسیح“۔ ۴۵ (امام ابو حنیفہ، محمد، مالک، زفر اور شافعی علیہم الرحمہ فرماتے ہیں کہ اگر ذبیحہ پر حضرت عیسیٰ مسیح کا نام لیا جائے تو یہ کھانا جائز نہیں ہوگا)

بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ کسی مشرک نے آپ کی دعوت کی، اس کے گھر آپ تشریف لے گئے تو دسترخوان پر بتوں پر چڑھایا ہوا جانور کا گوشت دیکھ کر صاحب خانہ سے سے فرمایا کہ بتوں کا چڑھاوا ہمارے لیے جائز نہیں۔ ۴۶

ہاں اگر غیر مسلموں کا تحفہ بتوں کا چڑھاوا نہ ہو تو اس کو قبول کر سکتے ہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ اپنی تصنیف اقتضاء الصراط المستقیم میں متعدد آثار کے ذریعہ عدم قباحت کو ثابت کرتے ہیں۔ وہ حضرت علیؓ کا واقعہ ذکر کرتے ہیں کہ کسی غیر مسلم نے ان کی خدمت میں فیروز کا ہدیہ پیش کیا تو آپ نے قبول کر لیا۔

حضرت عائشہؓ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک عورت نے حضرت عائشہؓ سے عرض کیا کہ مجوسیوں سے ہمارے تعلقات ہیں اور اس کی وجہ سے وہ اپنے تہوار کے موقع پر ہمیں ہدیہ دیتے ہیں، حضرت عائشہؓ نے فرمایا: اس دن جو ذبیحے ہوتے ہیں ان میں اگر گوشت وغیرہ دیں تو نہ کھاؤ، البتہ پھل وغیرہ کھا سکتی ہو۔

ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

”ان آثار سے ثابت ہوتا ہے کہ ہدایا اور تحائف کے باب میں تہوار سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اور نہ ہی اس سے غیر مسلموں کی اعانت لازم آتی ہے، اس لیے غیر حربی کافروں کا ہدیہ

قبول کرنا جائز ہے، خواہ وہ تہوار کے موقع پر ہو یا کسی اور موقع پر۔ ۴۷

خلاصہ یہ ہے کہ یہ تحفے اگر پاک ہوں تو خواہ مذہبی تقریب کے ہوں یا غیر مذہبی تقریب کے مسلمانوں کے لیے قبول کرنا اور استعمال کرنا دونوں جائز ہیں، ورنہ بصورت دیگر یہ تحفے ممنوع ہوں گے، یہاں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر تحفہ قبول نہ کرنے کی صورت میں کسی فتنہ کا اندیشہ ہو تو اس کو قبول کرے لیکن استعمال نہ کرے بلکہ کسی اور غیر مسلم کو ہدیہ بھیج دے، اس کے دو فائدے ہوں گے، ایک تو یہ کہ جس نے آپ کو تحفہ اور ہدیہ بھیجا ہے اس کو قبول کرنے کی وجہ سے بھیجنے والے کی دل شکنی نہیں ہوگی اور دوسرے یہ کہ جس کو آپ ہدیہ دیں گے وہ اپنے لیے باعث عزت سمجھے گا اور اسے خوشی ہوگی۔

غیر مسلموں کی امداد اور خدمت خلق:

تکثیری معاشرہ میں متعدد مواقع ایسے آتے ہیں جہاں انسان ایک دوسرے کی اعانت اور امداد کا محتاج ہوتا ہے، سماج میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں، معاشی طور پر مستحکم اور مضبوط لوگ بھی ہوتے ہیں اور کمزور بھی، جنہیں اپنی زندگی کی بیش تر ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے امیر اور مالدار لوگوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے اور ان کے سامنے دست سوال دراز کرنا پڑتا ہے، ایک مسلمان جو اس مخلوط معاشرہ کا فرد ہے اللہ نے اسے بے شمار نعمتیں اور وسائل عطا کیے ہیں، اسی معاشرہ میں دیگر قوموں سے تعلق رکھنے والے اس کی اعانت اور مدد کے محتاج ہیں تو کیا اس مسلمان کو مذہب کی تفریق کے بغیر اس مجبور و ضرورت مند شخص کی مدد کرنی چاہیے اور شرعی طور پر اس میں کوئی قباحت تو نہیں ہے اور کیا وہ لوگ جو اس بات کے مستحق ہیں ان کی خدمت کی جائے تو ایسی صورت میں ایک مسلمان کا کیا برتاؤ ہونا چاہیے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام میں خدمت خلق کی بڑی اہمیت ہے اور انسانیت کے ناطے اسلام ہر ایک کی خدمت کرنے کا حکم دیتا ہے، انسان تو انسان جانوروں کی خدمت کو بھی باعث اجر قرار دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا: ”ان لنا فی البہائم اجر؟“ (چوپایوں میں بھی ہمیں اجر ملے گا؟) حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”فی کل ذات کبد رطبة اجر“ (ہر زندہ جگر والی مخلوق میں اجر ہے)۔ ۴۸

اسلام حسب توفیق ساری انسانیت کی خدمت کا حکم دیتا ہے اور انسانی بنیاد پر غیر مسلموں کی نصرت و اعانت کی اجازت ہی نہیں بلکہ ترغیب دیتا ہے۔ حضرت اسماء فرماتی ہیں کہ میرے پاس میری ماں آئیں جب کہ وہ مشرک تھیں، قریش سے معاہدہ کا زمانہ تھا، میں نے حضور اکرم ﷺ کو اس کی

اطلاع دی اور عرض کیا کہ میں ان کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی مدد کر سکتی ہوں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ”ہاں کرو“۔ ۴۹

مظلوم خواہ مسلم ہو یا کافر ان کا تعاون کرنا مسلمانوں کا مذہبی فریضہ اور ان کے اخلاق کریمانہ کا تقاضا ہے، خواہ حکومت کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو یا نہ ہو۔ رسول اکرم ﷺ نے غیر مسلموں کا تعاون کیا ہے۔ سیرت رسول اللہ ﷺ کے مطالعہ سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جنگ بندی کا معاہدہ ہوا تو اس معاہدہ کی ایک شق یہ تھی کہ جو قبیلہ جس فریق کا چاہے حلیف بن سکتا ہے۔ چنانچہ اس شق کے تحت بنو خزاعہ مسلمانوں کے اور بنو مکہ قریش کے حلیف بنے۔

لیکن جلد ہی بنو مکہ نے بنو خزاعہ پر یورش کر دی۔ قریش نے اسلحہ اور افراد کے ذریعہ پشت پناہی کی اور معاہدہ کو توڑ کر بنو خزاعہ کے ساتھ ظلم و زیادتی میں شریک ہو گئے۔ اس موقع پر رسول کریم ﷺ نے بنو خزاعہ کا تعاون کیا تھا جن کو غیر مسلموں کا ایک بڑا طبقہ ظلم و زیادتی اور استحصال کا شکار بنائے ہوا تھا۔ ۵۰

باہمی امداد و معاونت کا دائرہ بہت وسیع ہے مثلاً جب کوئی قدرتی آفت آتی ہے تو بلا تفریق سماج کے تمام افراد اس کے شکار ہوتے ہیں اور سبھی لوگ مدد کے محتاج ہوتے ہیں، ایسے وقت میں مسلم ریلیف تنظیموں کو صرف انسانیت کی بنیاد پر رفاہی کام انجام دینا چاہیے، مذہبی تعصب کی اجازت نہیں ہے، خواہ غیر مسلم تنظیمیں مسلمانوں کے ساتھ عصبيت کا معاملہ کریں، اس لیے کہ عوض میں احسان کرنے کا نام صلہ رحمی نہیں ہے، سامنے والا چاہے اخلاق کے اعتبار سے مذہب کے اعتبار سے اور عقائد کے اعتبار سے جیسا بھی ہو، اس کے ساتھ نرم مزاجی اور حسن گفتار کا حکم دیا گیا ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”لیس الواصل بالمکافی ولكن الواصل الذی اذا انقعت رحمہ وصلہا“۔ ۵۱

حضرت عمر فاروقؓ ایک روز مسجد سے نکل رہے تھے کہ ایک نصرانی فقیر کو دیکھا، بھیک مانگ رہا ہے، فاروق اعظم اس کے پاس گئے اور حال دریافت کرنے کے بعد فرمایا: ”یہ تو کوئی انصاف نہ ہوا کہ تیری جوانی اور قوت کے زمانہ میں ہم نے تجھ سے ٹیکس وصول کیا اور جب تو بوڑھا ہو گیا تو اب ہم تیری امداد نہ کریں“ اسی وقت حکم دیا کہ بیت المال سے اس کو تاحیات گزارہ دے دیا جائے۔ ۵۲

علامہ زحلی اپنی تالیف الفقہ الاسلامی میں فرماتے ہیں کہ مظلوم قوم کوئی بھی ہو خواہ وہ بت پرست

ہی کیوں نہ ہو اس کی مدد ضروری ہے۔ ۵۳

ان تمام احادیث، آثار اور اقوال سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام انسانوں کی خواہ ان کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو، اگر وہ معاشی طور پر کمزور ہیں تو ان کی مدد کی جائے گی، اگر مظلوم ہیں تو مدد کی جائے گی، اگر قدرتی آفات کے شکار ہیں تو ان کی مدد کی جائے گی، کیوں کہ اسلام سرپا انسانیت نواز مذہب ہے جو اپنے پیروکاروں کو اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ انسانوں کی خدمت کی راہ میں عقیدہ و خیال اور دین و مذہب کے اختلاف کو حائل نہ ہونے دیں، جو شخص ضرورت مند ہے اس کی مدد کرنا دینی اور اخلاقی فریضہ ہے، چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، مشرک ہو یا اہل کتاب، رشتہ دار ہو یا غیر رشتہ دار ہر ایک کی مدد کی جائے اور ہر ایک کے ساتھ حسن سلوک اور اخلاق کریمانہ کا برتاؤ کیا جائے گا۔ یہ شریعت کے نزدیک مذموم نہیں بلکہ محمود اور مطلوب عمل ہے اور اس میں سماجی طور پر کوئی قباحت نہیں ہے۔

غیر مسلموں کی خوشی و غم میں شرکت:

جو واقعات کثرت سے وقوع پذیر ہوں وہاں شریعت رعایت دیتی ہے اور عام حالات میں ضرورت کی بنا پر ممنوع چیز کی اجازت دیتی ہے الضرورة تبيح المحظورات۔ ۵۴ تکثیری معاشرہ میں اگر غیر مسلم قوم آپ کے غم و خوشی میں شریک ہوتی ہے تو جواباً آپ کو اپنا شخص برقرار رکھتے ہوئے ان کے غم اور خوشی میں شریک ہونا چاہیے کیوں کہ انسانی تعلقات کی بنیاد پر ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں شریک ہونا ایک سماجی ضرورت ہے اور اسلام اس کی اجازت بھی دیتا ہے، ہاں اس بات کا لحاظ ضروری ہے کہ خوشی و غم میں شرکت سے کوئی خلاف شرع امر پیش نہ آنے پائے، بخاری کی روایت ہے:

”عن انس قال كان غلام يهودي يخدم رسول الله ﷺ فمرض فأتاه النبي

ﷺ يعوده فقعد عند رأسه فقال له: أسلم فنظر إلى أبيه، وهو عنده فقال له

أطع أبا القاسم، فأسلم فخرج النبي ﷺ وهو يقول الحمد لله الذي أنقذه بي

من النار“۔ ۵۵

(ایک یہودی لڑکا حضور اکرم ﷺ کی خدمت کرتا تھا، وہ بیمار ہوا تو رسول اللہ ﷺ اس کی

عیادت کے لیے تشریف لے گئے، اور اس کے سر ہانے میں تشریف فرما ہوئے، پھر آپ نے

اس سے کہا، مسلمان ہو جا، وہ اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگا جو وہیں پر موجود تھا، اس کے باپ

نے کہا: ابوالقاسم کی بات مان لے، چنانچہ وہ مسلمان ہو گیا، حضور اکرم ﷺ اس کے پاس سے یہ کہتے ہوئے نکلے کہ اللہ کا شکر ہے جس نے میرے ذریعہ اس کو آگ سے نجات مرحمت فرمائی)

ہدایہ میں ہے:

”ولا باس بعبادة اليهودى والنصرانى لانه نوع بر فى حقهم ومانهينا من ذلك وصح ان النبى ﷺ عاد يهوديا مرض بجواره“۔ ۵۶

(یہودی اور نصرانی کی عبادت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اس لیے کہ یہ ایک طرح کی بھلائی ہے ان کے ساتھ اور نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے اپنے پڑوس میں بیمار ہونے والے یہودی کی عبادت کی۔)

ان روایات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ تکلیف یا پریشانی کا موقع ہو تو اپنے پڑوسیوں کی خواہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں ان کا ساتھ دینا چاہیے اگر غم کی کیفیت میں ہوں تو ان کی ہمت رانی کرنی چاہیے تاکہ اس کے اثرات کم ہو سکیں اور زخم مندمل ہو سکے۔

اسی طرح سماجی اخلاقیات کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اگر ہمارے تیوہاروں میں ہم کو ہماری خوشی کے قے پر مبارک باد دیتے ہیں تو ہم بھی ان کی مبارک باد ان کے تیوہاروں پر لوٹا دیں کہ جس کو وہ خوشی کی چیز فہتے ہیں وہ ان کو مبارک ہو جب کہ مسلمان خود اس تیوہار کی صداقت پر یقین نہ رکھتا ہو کیوں کہ یہ تیوہار مسلمانوں کے مذہب کا ایک خاص حصہ ہے۔ مبارک باد دینے کے سلسلے میں قرآن مجید کی اس آیت کو نظر رکھا جاسکتا ہے اور مسئلہ مذکور کو اس کے عموم میں داخل کر سکتے ہیں: ”وَإِذَا حُيِّتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا عَسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوْهَا“ (النساء: ۸۶)۔

خلاصہ یہ ہے کہ مخلوط معاشرہ میں موقع خوشی کا ہو یا غم کا، سماجی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ایک مرے کی خوشی و غم اور پریشانی کے موقع پر ساتھ دینا اور تعاون کرنا قابل تحسین ہے بلکہ بسا اوقات لمانوں کا یہ طرز عمل اسلام کی طرف دعوت کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے جیسا کہ ماقبل میں مذکور بخاری کی بیت سے معلوم ہوا۔

غیر مسلموں کی تجہیز و تکفین اور جنازے میں شرکت اور استغفار:

مکثیری معاشرہ میں مسلمانوں کے لیے ایک سماجی مسئلہ یہ بھی ہے کہ غیر مسلم قوم کے کسی فرد کے انتقال ہونے پر اس کی تجہیز و تکفین اور جنازہ کے جلوس میں شرکت کرنا کیسا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ غیر مسلموں کے جلوس جنازہ اور آخری رسومات میں شرکیہ نعرے بلند ہوتے ہیں اور مختلف دیوی دیوتاؤں کی جئے وغیرہ بولی جاتی ہے، نیز ان کی تدفین یا ان کو غیر شرعی طریقے پر جلا کر خاکستر کرتے ہیں ایسی مجلس میں شرکت کرنا یہ تعاون علی الائم کے قیل سے ہے۔ اور تائید معلوم ہوتی ہے جب کہ قرآن کریم میں صاف طور پر اس کی ممانعت دار ہوئی ہے:

”وَلَا تُصَلِّ عَلَى أَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّا تَأْتِيهِمْ عَلَيْهِ وَلَا تَقُمْ عَلَيْهِ قَبْرِهِ إِنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَمَاتُوا وَهُمْ فَاسِقُونَ“۔ (التوبہ: ۸۴)

(آپؐ ان میں سے کسی کی نماز جنازہ مت پڑھیے جس کی موت کفر پر ہوئی ہو اور اس کی قبر پر مت کھڑے ہوئیے، انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا ہے اور ان کی موت فسق کی حالت میں ہوئی ہے۔)

علامہ قرطبی ”ولا تصل علی احد منهم“ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”قال علماؤنا لهذا

نص فی الامتناع الصلوات علی الکفار“۔ ۵۷

عام حالات میں غیر مسلموں کے جنازہ میں شرکت کرنا ممنوع ہے تاہم کچھ احوال مستثنیٰ ہیں مثلاً اگر مرنے والا غیر مسلم کسی مسلمان کا قریبی رشتہ دار ہو اور اس سے زیادہ کوئی قریب ترین اہل تعلق موجود نہ ہو جو اس کی تجہیز و تکفین کی ذمہ داری اٹھا سکے، تو ایسے شخص کے لیے اپنے غیر مسلم رشتہ دار کی تجہیز و تکفین میں شرکت اور اس کی ذمہ داری کو ادا کرنا جائز ہے جیسا کہ نصب الرایۃ میں مذکور ہے ”حضرت ابوطالب کا انتقال ہوا اور حضرت علیؑ نے رسول اکرم ﷺ کو بچا کی موت کی خبر دی تو آپؐ نے حضرت علیؑ کو ان کی تجہیز و تکفین کا حکم دیا، اس لیے کہ حضرت علیؑ بحیثیت بیٹا ان سے زیادہ قریب تھے“۔ ۵۸

اسی طرح غیر مسلم کے جنازہ میں شرکت جب کہ وہ گاؤں، پاس پڑوس کا رہنے والا ہو، کوئی بڑا سیاسی، یا عہدہ دار ہو اور مسلمانوں کے شرکت نہ کرنے سے ایک منفی پیغام جاتا ہو اور اس سے سماجی انتشار اور باہمی فاصلے کا خطرہ ہو تو سماجی ضرورت کی بنا پر شرکت کر سکتے ہیں۔ علامہ سیوطی کہتے ہیں کہ اگرچہ غیر



مسلم جنازہ کی زیارت بھی درست نہیں ہے لیکن غیر مسلم اقوام کے ساتھ رہتے ہوئے سماجی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے مصلحتاً اس کی گنجائش نکل سکتی ہے، ہر غیر مسلم کے جنازے کی زیارت کی عادت بنانا درست نہیں، جیسا کہ علماء نے غیر مسلم کے ساتھ کھانے کو جائز مگر عادت بنانے کو مکروہ لکھا ہے: ”ان کان ذلک مرة أو مرتین یجوز، لان النبی ﷺ اکل مع کافرة فحملناه علی ذلک ولكن یکره المداومة علیه“۔ ۵۹ جس طرح غیر مسلموں کے جنازے میں شرکت اور اس کی زیارت عام حالات میں ممنوع ہے، اسی طرح ان کے لیے دعاء مغفرت کرنا بھی ممنوع ہے۔ رسول پاک ﷺ کے چچا محترم کا جب وصال ہوا تو آپؐ نے ان کے لیے فرط محبت اور ادائے حق کے طور پر استغفار کرنا شروع کر دیا تو اللہ جل جلالہ نے آپؐ سے منع فرمایا: ”مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولَىٰ قُرْبَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ“۔ (التوبة: ۱۱۳) (نبی اور ایمان والوں کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ مشرکوں کے لیے استغفار کریں، خواہ وہ ان کے رشتہ دار ہوں جب کہ ان کے سامنے یہ واضح ہو چکا ہو کہ وہ دوزخی ہیں)۔ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں علامہ شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں کہ مومنین جب جان و مال سے خدا کے ہاتھ بچ ہو چکے تو ضروری ہے کہ تنہا اسی کے ہو کر رہیں۔ اعداء اللہ سے جن کا دشمن خدا اور جہنمی ہونا معلوم ہو چکا ہو، محبت و مہربانی کا واسطہ نہ رکھیں۔ خواہ دشمنان خدا ان کے ماں باپ، چچا، تایا اور خاص بھائی بہن کیوں نہ ہوں۔ جو خدا کا باغی اور دشمن ہے وہ ان کا دوست کیسے ہو سکتا ہے لیکن جس شخص کی بابت پتہ چل جائے کہ بالیقین دوزخی ہے خواہ وحی الہی کے ذریعہ سے یا اس طرح کہ اعلانیہ کفر و شکر پر اس کی موت آچکی ہو، اس کے حق میں استغفار کرنا اور بخشش مانگنا ممنوع ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ یہ آیت آں حضرت ﷺ کی والدہ حضرت آمنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ بعض احادیث میں مذکور ہے کہ آپؐ کے چچا ابوطالب کے حق میں اتری۔ ۶۰

قرآن کریم میں اللہ دوسری جگہ ارشاد فرماتا ہے:

”وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ“ (التوبة: ۱۱۴)

(اور ابراہیم کا اپنے باپ کے حق میں دعا مغفرت کرنا تو محض وعدہ کے سبب سے تھا جو انھوں نے اس سے کر لیا تھا، پھر جب ان پر ظاہر ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس سے بے تعلق ہو گئے)۔

خلاصہ یہ ہے کہ غیر مسلموں کے جلوس جنازہ میں شرکت کرنے، ان کے آخری رسومات ادا کرنے میت کو کندھا دینے اور ان کے لیے دعاء مغفرت کرنے کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

غیر مسلموں کے ساتھ تجارتی معاملات:

تکثیری معاشرہ میں غیر مسلموں کے ساتھ تجارتی اور مالی معاملات جیسے بیع و شراء، کرایہ داری و رہن وغیرہ میں شرکت ایک مباح اور رائج عمل ہے، آپؐ کے زمانے سے مروج اور مسلمانوں کے درمیان معمول بہ ہے، ان معاملات میں وہی ممنوع ہیں جو حرام ہیں، جیسے سود، منشیات، شراب اور سور کا گوشت اور ایسی ہی چیزیں، غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کی کچھ اور بھی قسمیں ہیں، مثال کے طور پر آپؐ نے یوم حنین کے موقع پر صفوان سے ایک ڈھال عاریتاً لیا تھا، صفوان نے کہا کہ اے محمدؐ! کیا اس پر آپؐ کا قبضہ دائمی رہے گا؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: نہیں، بلکہ عاریتہً لے رہا ہوں اور واپسی کی ضمانت ہے۔ ۱۱

اسی طرح اگر کسی غیر مسلم کے پاس امانت رکھنے کی ضرورت پیش آئے تو امانت رکھوانا

جائز ہے۔ ۱۲

خلاصہ یہ ہے کہ تکثیری معاشرہ میں اکثر و بیش تر غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کو طرح طرح کے معاملات کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے، اس میں بیع و شراء بنیادی طور پر شامل ہیں اس لیے بلا کراہت مسلمانوں کے لیے تمام طرح کے معاملات غیر مسلموں کے ساتھ کرنے کی اجازت ہوگی کیوں کہ معاملات کے تعلق سے اصل چیز اباحت اور اجازت ہے ہاں اگر ان معاملات کی حرمت پر کوئی دلیل موجود ہے تو پھر اس کی اجازت نہیں ہوگی۔

خلاصہ:

جہاں تک غیر مسلموں سے سماجی تعلقات، ایک دوسرے کی خوشی و غم میں شرکت اور مدد اور لین دین کے مسائل کا تعلق ہے، تو اسلام اس سے منع نہیں کرتا، اسلام ایک انسانیت دوست، انسانیت نواز اور امن پرست مذہب ہے، وہ مذہبی مسائل میں جبر کا قائل نہیں ہے، اور اسی لیے جو لوگ اسلام قبول نہیں کرتے ہیں، ان سے تعلقات ختم کرنے کو نہیں کہتا اور نہ ہی ان سے عداوت و دشمنی پر بھڑکتا ہے، نہ ان کی حلق تلفی کی اجازت دیتا ہے، بلکہ وہ تمام انسانی اور شہری حقوق جو کسی انسان کو مل سکتے ہیں ان کو عطا کرتا ہے۔

اسلام ساری انسانیت کا دوست ہے اور ہر ایک سے اس کے حدود کے مطابق تعلقات رکھنے کی اجازت دیتا ہے، البتہ ہر تعلق میں یہ لحاظ ضروری ہوگا کہ اسلام اور مسلمانوں کی غیرت و وقار پر سوالیہ نشان نہ لگے اور ان کے مذہبی تشخص پر کوئی آنچ نہ آئے نیز وہ اسلام کے مزاج یا اس کے بنیادی اصولوں میں سے کسی اصول سے متصادم نہ ہو، جیسا کہ غیر مسلموں کے جنازہ میں شرکت اور ان کے لیے ایصال ثواب کی بحث میں یہ مسئلہ تفصیل سے گذرا۔

### غیر مسلم معاشرہ میں مسلمانوں کے دینی مسائل:

غیر مسلم معاشرہ میں مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا دینی مسئلہ یہ ہے کہ مختلف مذاہب اور تہذیب کے لوگوں کے ساتھ تعلقات اور معاملات رکھنے کے باوجود ان کا دینی تشخص کس طرح برقرار رہے اور دیگر تہذیبوں میں اسلامی تہذیب خلط ملط نہ ہونے پائے کیوں کہ آج مخلوط معاشرہ میں قیام امن اور آپسی رشتے کو خوش گوار بنانے کے لیے وحدت ادیان کا نعرہ بڑے زور و شور کے ساتھ لگایا جا رہا ہے، اس نعرہ کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تہذیبی و ثقافتی ہم آہنگی کی کوشش میں مذہب کو عصر حاضر میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے خاص طور پر مغرب کی کوشش یہ ہے کہ انسان کو عملی زندگی سے علیحدہ کر دیا جائے اور کچھ عباداتی رسوم کے دائرے میں ہی انسان کی مذہبی زندگی کو محدود کر دیا جائے۔ مذہب بیزار لوگ مذہب کو مزید بے اثر کرنے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ راستے الگ الگ ہیں لیکن منزل ایک ہی ہے اور ان مذاہب کی حیثیت ایک ہی منزل تک جانے والے مختلف راستوں کی ہے۔ بہت سے مسلم دانش ور بھی اس فکر کے اسیر ہوتے جا رہے ہیں اور بڑی شد و مد کے ساتھ وحدت ادیان کا نعرہ بلند کر رہے ہیں۔ یہ فکر ایک غیر اسلامی تصور اور شریعت کے مزاج سے متصادم ہے اور غیر مسلم معاشرہ میں رہنے والے مسلمانوں کے عقائد کے ساتھ باہمی ہم آہنگی کے نام پر چھیڑ چھاڑ کرنے کا باعث بھی، ایسی نازک صورت حال میں مسلمانوں کے لیے ایک چیلنج اور دینی مسئلہ ہے کہ وہ کس طرح اپنے دین، عقیدے اور تہذیب و تشخص کی حفاظت کریں۔ قرآن کریم اس باطل خیال اور فکر کی تردید کرتا ہے اور علی الاعلان کہتا ہے: ”إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ“ (آل عمران: ۱۹)۔ اسلام وحدت دین کا قائل ہے نہ کہ ادیان کا۔ ایک دوسری جگہ ارشاد باری ہے:

”وَأَنَّ هَذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ

سَبِيلِهِ“ (الانعام: ۱۵۳)

(یہ سیدھا راستہ ہے تم لوگ اسی کی اتباع کرو اور دوسری راہوں کی اتباع نہ کرو ورنہ تم راہ حق سے بھٹک جاؤ گے)۔

مخلوط اور غیر مسلم معاشرہ میں وحدت ادیان کا نعرہ درحقیقت اسلام کو غیر اسلام سے خلط ملط کرنے اور اسلام کی امتیازی حیثیت اور اس کے تشخص کے استیصال کی ناپاک کوشش ہے۔ نوع انسانی سے اسلام کا مطالبہ محض اسلامی عقیدہ توحید و رسالت اور اس کے دیگر لوازمات کو تسلیم کرنے کا نہیں، بلکہ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ دیگر ادیان و مذاہب پر اسلامی عقائد اور اسلامی شریعت کی بالادستی اور فوقیت تسلیم کی جائے اور اسلام کے آخری اور مکمل دین اور مستقل تہذیب ہونے کا اعتقاد رکھا جائے۔ قرآن میں ہے: ”الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا“ (المائدہ: ۳) (آج میں پورا کر چکا تمہارے لیے دین تمہارا اور پورا کیا تم پر میں نے احسان اپنا اور پسند کیا میں نے تمہارے واسطے اسلام کو دین)۔ نیز اسلام کو دین حق اور دیگر تمام ادیان کو باطل سمجھا جائے کیوں کہ اسلام تمام ادیان باطل کی تردید کے لیے آیا تھا: ”وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا“ (بنی اسرائیل: ۸۱) (کہہ دیجیے کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا، بلاشبہ باطل مٹنے والا ہے)۔ ایک دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے: ”وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ“ (آل عمران: ۸۵) (اور جو کوئی چاہے سوا دین اسلام کے کوئی اور دین، سو اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا)۔ ایک جگہ اور قرآن کہتا ہے: ”وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَ ثَمَرُ الْمَصِيرِ“ (النساء: ۱۱۵) (اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے ہدایت کے اس کے سامنے واضح ہو جانے کے بعد اور مسلمانوں کے علاوہ کوئی اور راستہ اختیار کرے تو ہم اس کو اسی طرف کر دیں گے جس طرف وہ گیا ہے اور ہم اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور جہنم برا ٹھکانہ ہے)۔ ان تمام آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام ہی دین قیم اور حنیف ہے اور اللہ کے نزدیک دین صرف دین اسلام ہے اور یہی اللہ کو محبوب ہے اور باقی مذاہب باطل ہیں لہذا وحدت ادیان کے لیے کوشش کرنا اور معاشرتی تعلقات کی بہتری کے لیے وحدت ادیان کا نعرہ بلند کرنا اللہ کے بندوں کو صحیح راستے سے بھٹکانا ہے اور یہ نظریہ خالص کافرانہ اور مغربی نظریہ ہے، اگر کوئی

مسلمان تمام مذاہب کو برحق سمجھے اور وحدت ادیان کا قائل ہو جائے تو وہ مسلمان ہی باقی نہیں رہے گا، کیوں کہ وہ نص قرآنی ان الدین عند اللہ الاسلام کا انکار کر رہا ہے۔

مولانا تقی امینی صاحب اپنی کتاب میں مفاہمت بین المذاہب کی بابت یوں رقم طراز ہیں:

”موجودہ دور میں ’وحدت ادیان‘ کے نام سے مفاہمت کی جو شکل نکالی گئی ہے وہ دراصل مذہب کے خلاف زبردست سازش اور چال ہے، مذہبی لحاظ سے اس کو قبول کرنا خود مذہب کے ’دیوالیہ‘ ہونے کا اعلان ہے، اسلام اس کی موجودہ شکل کو ہرگز قبول کرنے کو تیار نہیں ہے۔“ ۶۳

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام سب سے منفرد، انسانیت کا نجات دہندہ اور برحق مذہب ہے، دوسرے مذاہب باطل اور اللہ کے نزدیک نامقبول ہیں، اسلام کا راستہ جنت کی طرف لے جانے والا اور اللہ تک پہنچانے والا ہے، دوسرے مذاہب کے راستے جہنم کی طرف جانے والے اور شیطان تک پہنچانے والے ہیں، اس بارے میں قرآن وحدیث کے ارشادات بالکل واضح ہیں۔

غیر مسلم معاشرہ میں شرعی عدالت کا قیام اور اس کی ضرورت:

غیر مسلم معاشرہ میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے ایک پریشانی یہ بھی ہے کہ انہیں اکثر مختلف نزاعات اور معاملات کے حل اور تصفیہ کے لیے سرکاری عدالتوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، جہاں ملکی آئین وقوانین کو بنیاد بنا کر فیصلے کیے جاتے ہیں۔ یہ فیصلے اکثر ہمیشہ تر مسلمانوں کے مذہبی اور عائلی قوانین سے متصادم ہو جاتے ہیں اور غیر شرعی فیصلہ ہونے کی وجہ سے مسلمان عجیب کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اگر عدالتی فیصلہ سے احتراز کریں تو عدالت کی توہین اور قانون شکنی لازم آتی ہے جو کہ موجب سزا ہے اور اگر ان فیصلوں پر عمل کرتے ہیں تو غیر شرعی فیصلہ ہونے کی وجہ سے فسق کا ارتکاب لازم آتا ہے جو کہ آخرت میں سزا کا موجب ہے۔ مثلاً ہندوستانی عدالتوں کے فیصلوں پر اگر غور کریں تو ہمیں کئی ایسے معاملات اور فیصلے ملیں گے جن کے ذریعے براہ راست اور بالواسطہ مسلمانوں کے مذہبی امور میں مداخلت کی کوشش کی گئی، چنانچہ ۱۹۷۲ء میں متنی بل پیش ہوا۔ ۶۴ اس بل کا مقصد یہ تھا کہ بلا تفریق مذہب ملک کی تمام قوموں کے لیے متنی کو اولاد کا درجہ دیا جائے اور ان کو لے پالک لینے والے مرد و عورت کے ترکہ میں وارث قرار دیا جائے: ظاہر ہے کہ یہ قانون نہ صرف اسلام کے خلاف تھا بلکہ عقل کے بھی خلاف تھا،

کیوں کہ والدین اور اولاد کا رشتہ ایسا نہیں ہے کہ صرف زبان سے وجود میں آجائے بلکہ یہ ایک فطری رشتہ ہے اور ایک فطری محبت جو والدین اور اولاد میں ہوا کرتی ہے اس مصنوعی رشتے کی وجہ سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ (علماء اور دانشوروں کی جدوجہد سے ۱۹۷۸ء میں) بل واپس لے لیا گیا۔ ۶۵۔ اسی طرح ۱۹۸۰ء میں سپریم کورٹ نے قرآن کریم کے خلاف نفقہ مطلقہ کا فیصلہ صادر کیا۔ ۶۶۔ یہ بھی اسلام کی روح پر ایک حملہ اور مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت کی ایک ناپاک کوشش تھی، کیوں کہ اسلام میں مطلقہ عورت کے نفقہ سے متعلق حکم یہ ہے کہ طلاق کے بعد عدت کی مدت کا نفقہ شوہر پر لازم ہوگا، مدت گزر جانے کے بعد کوئی نفقہ عورت کے لیے شوہر پر لازم نہ ہوگا کیوں کہ نفقہ کے لزوم کی اصل وجہ اور عقلی وجہ یہ تھی کہ عدت میں بھی وہ عورت اس مرد کی بیوی کے حکم میں تھی، عدت گزر جانے کے بعد یہ رشتہ بالکلیہ ختم ہو گیا لہذا نفقہ واجب نہیں ہوگا۔ ۶۷۔

بعض اوقات عدالتوں کے ذریعے کیے گئے فیصلوں سے نہ صرف اسلامی شعائر پر حملہ ہوتا ہے بلکہ اس کے تشخص اور شناخت کو بھی مٹانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ ۲۰۰۹ء میں مدھیہ پردیش کے طالب علم سلیم کے معاملہ میں پیش آیا، اس نے سپریم کورٹ میں عرضی دائر کر کے ڈاڑھی کے ساتھ اسکول آنے کی اجازت طلب کی تھی، سپریم کورٹ نے اس کی عرضی ٹھکرا دی اور مقدمہ کی سماعت کرتے ہوئے جسٹس مارکنڈے کاٹجو نے کہا: ”سیکولرازم کے یہ معنی نہیں ہیں۔ ہم ملک میں طالبان نہیں چاہتے، ہو سکتا ہے کل کوئی لڑکی سامنے آ کر کہے کہ وہ برقعہ پہننا چاہتی ہے، کیا ہم اس کی اجازت دیں گے۔ انھوں نے کہا کہ وہ دل و جان سے سیکولر ہیں مگر مذہبی عقائد کو اس حد تک آگے نہیں بڑھایا جاسکتا۔ میں سیکولر ہوں ہمیں اپنے حقوق اور ذاتی عقائد میں توازن رکھنا چاہیے۔ ۶۸۔

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنے ایک خطبہ میں بڑی صراحت کے ساتھ یہ کہا تھا:

”ملک (ہندوستان) کے باشندے کی حیثیت سے ہمیں یہاں آزادی اور عزت کے ساتھ رہنے کا پورا حق حاصل ہے، یہ اس ملک کی جمہوریت اور دستور و آئین کا بھی فیصلہ ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ ہم اپنی خصوصیات، قانون شریعت، احکام دین، اپنے عقائد و شعائر، اپنی زبان و تہذیب اور اپنی ان چیزوں کو چھوڑ کر جو ہمیں عزیز ہیں، اس ملک میں رہیں، اس طرح رہنے سے یہ وطن نہیں بلکہ ایک جیل خانہ اور قفس بن جاتا ہے، جس میں گویا

پوری قوم کو زندگی کی عزتوں اور لذتوں سے محروم رکھ کر سزا دی جاتی ہے۔ ہمارا خمیر ضرور اس ملک سے تیار ہوا ہے اور یہ خاک ہم کو بہت عزیز ہے، لیکن ہماری تہذیب ابراہیمی ہے، اور مسلمان جس ملک میں رہے گا اس کی وطنیت خواہ کچھ بھی ہو اس کی تہذیب ابراہیمی ہوگی، ہم یہاں زندہ اور باعزت انسانوں کی طرح رہنا چاہتے ہیں، ہم اس ملک میں آزاد ہیں، اس کی تعمیر و ترقی اور دستور سازی میں شریک ہیں، اس لیے اس کا کوئی سوال نہیں کہ ہم دوسرے درجے کے شہریوں کی طرح زندگی بسر کریں، اپنے ملک میں آزادی کے ساتھ زندگی گزارنا ہر شخص کا فطری، انسانی، اخلاقی اور قانونی حق ہے اور اس حق کو جب بھی چھیننے کی کوشش کی گئی تو اس کے ہمیشہ سنگین نتائج نکلے۔“ ۶۹۔

یہ تقریر حکومتی اداروں کے مسلمانوں کے مذہبی امور میں بے جا مداخلتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے کی گئی کہ ہماری حیثیت اس ملک کے باعزت شہری کی ہے اور ہمیں اپنے وطن سے بہت محبت ہے لیکن ہم اپنے ایمان، عقائد اور مذہبی شعائر پر کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتے اور نہ ہی ان چیزوں پر کوئی حملہ برداشت کر سکتے ہیں۔ ماقبل میں مذکور واقعات و عدالتی فیصلوں کے علاوہ بھی ایسے بہت سے فیصلے ہیں جن سے شریعت محمدیؐ کے اصول و ضوابط سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایسی نازک صورت حال میں جب کہ دین پر حملے ہو رہے ہوں اور اس کے شعائر کو مٹانے کی کوشش ہو رہی ہو، مسلمانوں کی یہ دینی ضرورت ہے کہ وہ ان عدالتوں سے رجوع کرنے کے بجائے ایسے ادارے قائم کریں جہاں مسلمان کے آپسی نزاعات اور عائلی مسائل کا حل شریعت کی روشنی میں ڈھونڈا جائے اور غیر شرعی عدالتوں سے گریز کیا جائے۔ اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ مسلمانوں میں علماء اور اصحاب ذی رائے اور تمام حالات پر گہری نظر رکھنے والے لوگ کسی جید اور مستند شخص کو مسلمانوں کے امیر کے طور پر منتخب کریں اور وہ امیر مسلمانوں کے لیے قاضی مقرر کر دے جو شریعت کے مطابق فیصلہ کرے، ایسا کرنا اس لیے ضروری ہے کہ شریعت میں مداخلت کے تمام راستے بند ہو جائیں اور بقول علامہ کاسانی کے ”کافر کو مسلمانوں پر ولایت حاصل نہیں ہے“ اس لیے بھی ان کے پاس جانے سے احتراز کرنا ضروری ہے۔ علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

”ومنها الاسلام الى قوله لان القضاء من باب الولاية بل هو اعظم الولايات

وهولاء ليست لهم اهلوية اذنى الولايات وهى الشهادة فلان لا يكون لهم اهلوية

اعلاها اولی“۔ ۷۰

(آداب قاضی میں سے یہ ہے کہ قاضی مسلمان ہو، کیوں کہ قضا باب الولايات میں بڑی ولایت ہے اور بچے اور کافر ادنیٰ ولایت کے بھی اہل نہیں اور ادنیٰ ولایت شہادت کا درجہ ہے، پس یہ لوگ اعلیٰ درجہ کی ولایت کے بدرجہ اولیٰ اہل نہیں)۔

عبارت بالا سے معلوم ہوا کہ قاضی کو مسلمانوں پر ولایت عامہ حاصل ہے اور کافر کو مسلمانوں پر ولایت حاصل نہیں۔ اس لیے اپنے شرعی معاملات کے لیے دارالقضا کی طرف رجوع کرنا چاہیے نہ کہ غیر مسلم عدالتوں کی طرف۔ قرآن کریم میں ہے:

”الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا نُزِّلَ إِلَيْكَ وَمَا نُزِّلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا“۔ (النساء: ۶۰)

(کیا تو نے نہ دیکھا ان کو جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ایمان لائے ہیں اس پر جو اتراتی تیری طرف اور جو اتراتی تھی سے پہلے، چاہتے ہیں کہ قضیہ لے جائیں شیطان کی طرف اور حکم ہو چکا ہے ان کو کہ اس کو نہ مانیں اور چاہتا ہے شیطان کہ ان کو بہکا کر دور جا ڈالے)

قرآن کریم نے اس بات کا بھی حکم دیا ہے کہ مسلمان اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں، ایسی کسی عدالت یا حکم کے پاس معاملہ ہی نہ لے جائیں جو اللہ اور رسول کی مرضی کے خلاف فیصلہ کرے۔ ارشاد ہے:

”قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ“۔ (آل عمران: ۳۲)

(آپ کہہ دیجیے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر وہ اعراض کریں تو اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا)

ایک جگہ اور ارشاد ربانی ہے:

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ“۔ (النساء: ۵۹)

(اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور حاکموں کی جو تم میں سے ہوں، پھر اگر جھگڑ پڑو کسی چیز میں تو اس کو لوٹا دو اللہ اور رسول کی طرف، اگر یقین رکھتے ہو تم اللہ



پراور یوم آخرت پر)

ان آیات کے علاوہ اور بھی بہت سی آیتیں اس پر دلیل ہیں کہ مسلمانوں کو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اپنی زندگی کے تمام گوشوں میں کرنا چاہیے۔ باہمی نزاعات کا حل شریعت کی روشنی میں تلاش کرنا چاہیے اور تمام مسائل کے تصفیہ کے لیے دارالقضا مختلف علاقوں میں قائم کرنا چاہیے اور وہاں اپنے معاملات طے کرانے چاہیے اور باطل طاقتوں کے پاس جانے سے بچنا چاہیے۔

شرعی عدالت میں قاضی کے تقرر کا طریقہ کار:

ہندوستان کے مختلف علاقوں میں دارالقضا قائم ہیں خاص طور پر امارت شرعیہ بہار جس کے قیام کو ۷۵ سال ہو گئے، بڑی سرگرمی کے ساتھ، بڑے علماء و فقہاء کی نگرانی میں اپنا کام کر رہی ہے۔ وہاں قاضی کے تقرر سے پہلے مسلمانوں میں سے کسی شخصیت کا انتخاب بطور امیر ہوتا ہے اور اس کا کردار دقیق معنوں میں شیخ الاسلام کا کردار ہوتا ہے، اس کی قوت کا مدار اس پر ہے کہ اس کا انتخاب اعیان شہر، ارباب حل و عقد یا مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت نے کیا ہے، اس کے انتخاب اور اس منصب پر اس کی تقرری کے بعد اس کا کردار اور عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے معاملات کو سیاسی حساسیت سے دور رہتے ہوئے غیر مسلم حکومت کے ساتھ مل کر منظم کرتا ہے اور ان معاملات کو چھیڑنے سے گریز کرتا ہے جو ملک کے داخلی امن و سلامتی یا ان امور سے تعلق رکھتے ہیں یا دستور ملک کے شہری قوانین کے تحت آتے ہیں، بلکہ منتخب امیر کا کام مسلمانوں کے تشخص کی حفاظت کرنا ہوتا ہے، وہ حکومتی اداروں یا اہل کاروں کو اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ وہ مسلمانوں کے شخصی یا عائلی قوانین میں مداخلت کرے، اس منصب پر تقرری کے بعد اسے قاضیوں کی تقرری کا اختیار ہوتا ہے امیر کے معین کردہ قضاۃ ہی بنیادی طور پر عائلی مسائل جیسے: نکاح، طلاق، فسخ اور تفریق بین الزوجین وغیرہ کو ضروری شرائط کی موجودگی میں دقیق فقہی معیار کے مطابق حل کرنے کی ذمہ داری اٹھاتے ہیں، ان مسائل کی کارروائی سول کورٹ کے ہی طریقہ پر انجام پاتی ہے، یہ کارروائیاں تقریباً مفت یا دوسری عدالتوں کی بہ نسبت بہت کم خرچ پر انجام پاتی ہیں، مسلمانوں کی زندگی میں اس قسم کی داخلی تنظیم نے ہندوستان کے دو صوبوں بہار و اڑیسہ میں زبردست کامیابی حاصل کی ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات غیر مسلم حکومت اس بات پر مجبور ہوئی کہ وہ ان مسلم قاضیوں کے فیصلوں کا احترام کرے، اس لیے وہ مسلمانوں کے دلوں میں عظمت کا مقام رکھتے ہیں۔ اے

خلاصہ یہ ہے کہ غیر مسلم ممالک میں ہندوستانی دارالقضا کو نمونہ بنا کر مسلمان دارالقضا اور امارت شرعیہ جیسے ادارے قائم کر سکتے ہیں تاکہ ان اداروں سے صادر ہونے والے فیصلوں پر عمل کر کے مسلمان قرآن و سنت سے اپنا رشتہ قائم اور مضبوط کر سکتے ہیں جو کہ ان کے لیے دنیا و آخرت دونوں جہاں کی فلاح و بہبود کا ضامن ہے اور غیر شرعی فیصلوں سے پیدا ہونے والے مسائل سے بچنے کا ذریعہ بھی۔

غیر مسلم معاشرہ میں مساجد کی تعمیر:

مسلمانوں کو تکثیری معاشرہ میں اپنے مذہبی ارکان پر عمل آوری کے لیے ایک مرکز یعنی مسجد کی ضرورت پیش آتی ہے جہاں مسلمان جمع ہو کر اپنی اجتماعیت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور روزانہ پانچوں وقت کی نماز ادا کرتے ہیں۔ مساجد کی تعمیر مسلمان باہمی طور پر چندہ جمع کر کے کرتے ہیں کیوں کہ حدیث میں مسجد تعمیر کرنے والوں کے لیے ایک بڑے انعام کا وعدہ ہے، حدیث شریف میں ہے: ”مَنْ بَنَى مَسْجِدًا لِلَّهِ بَنَى اللَّهُ لَهُ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ“۔ ۲ (جس نے اللہ کے لیے مسجد تعمیر کی اللہ اس کے لیے جنت میں گھر بنائے گا)۔ اب اہم سوال یہ ہے کہ چونکہ معاشرہ میں غیر مسلم بھی رہتے ہیں اور وہ بھی چندہ دینا چاہتے ہیں تو کیا ان کے چندہ کو مسجد کی تعمیر کے لیے لیا جاسکتا ہے جب کہ مسجد خالص اللہ کی عبادت کے لیے بنائی جا رہی ہے، تو شرعی طور پر اس کا کیا حکم ہے؟ اور کیا ان کے پیسوں سے مسجد تعمیر کی جاسکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تکثیری معاشرہ میں مسلمانوں کو سماجی تعلقات رکھنے کی اجازت ہے لیکن کچھ قیود اور حد بندی کے ساتھ بالکل انھیں آزاد نہیں چھوڑا گیا ہے، جہاں تک مسجد کی تعمیر میں غیر مسلموں سے چندہ لینے کی بات ہے تو قرآن مجید صاف طور پر کہتا ہے کہ مسجد وہ لوگ تعمیر کرتے ہیں جو لوگ اللہ اور قیامت کے دن پر یقین رکھتے ہیں: ”إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ“ (التوبہ: ۱۸)۔ اس آیت کریمہ میں کہا گیا کہ مسجد بنانے والے لوگ اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتے ہیں، لہذا اس آیت کی روشنی میں غیر مسلموں سے مسجد کی تعمیر کے لیے چندہ لینا درست نہیں ہوگا۔ ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَنْ يَعْمُرُوا مَسَاجِدَ اللَّهِ شَاهِدِينَ عَلَى أَنْفُسِهِمْ بِالْكَفْرِ أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ“۔ (التوبہ: ۱۷) (مشرکوں کا یہ کام نہیں کہ وہ آباد کریں اللہ کی مسجدیں اور تسلیم کر رہے ہوں اپنے اوپر کفر کو وہ لوگ خراب گئے ان کے عمل)۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ غیر مسلم اگر ثواب اور عقیدت کے ساتھ مسجد کی تعمیر کے لیے چندہ دیں تو ان کا چندہ قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، یہ آیت کریمہ ان لوگوں

کے قول کی سختی کے ساتھ تردید کر رہی ہے کیوں کہ اس آیت میں کہا گیا کہ مشرکین اگر اپنے کفر پر قائم ہیں اور مسجد کو آباد کرنا اور اس کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو یہ عمل ان کے لیے بے سود ہوگا اس لیے غیر مسلموں کا چندہ مسجد کی تعمیر کے لیے قبول کرنا صحیح نہیں ہوگا۔

غیر مسلموں کے مذہبی تقریبات اور عبادت گاہوں کے لیے چندہ:

غیر مسلموں کی مذہبی تقریبات اور عبادت گاہوں کی تعمیر کے لیے مسلمانوں کا تعاون کرنا اور چندہ دینا درست نہیں ہے اور ایسا کرنا تعاون علی الاثم کے قبیل سے ہے جس کی ممانعت قرآن کریم میں وارد ہوئی ہے ”وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ“ (المائدہ: ۲)۔ البتہ اگر فساد اور ضرر کا اندیشہ ہو اور جان و مال، عزت و آبرو اور ملازمت چلے جانے کا خطرہ ہو تو بہ کراہت اور اضطرار تعاون کرنا درست ہوگا و قلبہ مطمئن بالا یمن کی قید کے ساتھ اور بہتر شکل یہ ہے کہ مالک بنانے کی نیت سے اسے چندہ دے دیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ تم اسے جہاں چاہو خرچ کرو۔ ۳۷

خلاصہ:

اس باب میں غیر مسلم معاشرہ میں مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ سماجی تعلقات کی بنیاد پر پیش آنے والے چند مسائل کا احاطہ کیا گیا اور قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کا حل پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان تمام بحثوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نفسیاتی رکاوٹوں اور پابندیوں کو روا نہیں رکھتا، اس لیے کہ وہ ایک آسمانی دین ہے اور تمام نوع انسانی کی ہدایت اور عدل و انصاف اور طہارت و پاکیزگی کی بنیاد پر قائم تہذیب و تمدن کو وجود بخشنے آیا ہے، لہذا اس میں اعتراض کی کوئی بات نہیں ہے کہ مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ ایک مشترک معاشرہ میں قیام پذیر ہوں بشرطیکہ مسلمان اپنے اسلامی عقائد و اخلاق اور آداب و اطوار پر کاربند ہوں، تاکہ ان بہت سے لوگوں کے لیے امن و امان، خیر و عافیت اور رشد و ہدایت کا سبب بنیں جو طبقاتی اور رنگ و نسل کی بنیاد پر مبنی امتیاز اور بھید و بھاؤ کی مصیبت میں گرفتار ہیں اور انتہائی مشکل اور صبر آزما معاشرتی مسائل کا سامنا کر رہے ہیں، اس لیے کہ یہ تو اسلام کے مقاصد و اغراض کا ایک جز ہے کہ وہ محنت کش، پریشان حال اور کمزور لوگوں کی مصیبتوں کو دور کرے، مسلمانوں کو غیروں کے ساتھ زندگی گزارنے کی ممانعت صرف وہاں ہے جہاں مسلمانوں کے خاندان اور مسلم بچوں میں اعتقادی و اخلاقی برائیوں کے سرایت کر جانے کا اندیشہ ہو، لیکن اگر مسلم

خاندان غیر مسلموں کے ساتھ اپنی اخلاقیات کو محفوظ رکھتے ہوئے، اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا رہتے ہوئے اور اسلامی عقائد و تشخصات کی حفاظت کرتے ہوئے رہائش اختیار کریں، ان کے سماج کا ایک حصہ بنیں، ان کے ساتھ سماجی تعلقات خوشگوار بنائیں، ان کو اپنے اخلاق و کردار سے متاثر کریں، ان کی خوشی و غم میں شرکت کریں اور خوشی کے موقع پر مبارک باد پیش کریں تو اسلام اس سے منع نہیں کرتا بلکہ پوری آزادی اور حریت فراہم کرتا ہے تاکہ غیر مسلموں کے درمیان مسلمانوں کے کردار و عمل سے یہ پیغام دینا ممکن ہو کہ اسلام ایک تنگ دل مذہب نہیں بلکہ فراخ دل مذہب ہے، اس کے دامن میں انسانیت کے لیے بہت وسعت ہے۔

## حواشی و مراجع

- ۱۔ الصحیح البخاری، باب اخاء النبی ﷺ بین المهاجرین والانصار
- ۲۔ ابو محمد عبد الملک ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، دار الفکر، قاہرہ، ۱۹۵۵ء، ج ۲، ص ۵۲۷-۵۳۰
- ۳۔ الاقلیات المسلمۃ، بدر الحسن قاسمی، کویت، سن اشاعت غیر مرقوم، ص ۷
- ۴۔ ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب النہی عن قتل من اعتصم بالحدود
- ۵۔ خطابی، معالم السنن، مع تہذیب ابن قیم، ج ۳، ص ۴۳۷
- ۶۔ علامہ جلال الدین سیوطی، شرحہ علی النسائی، ج ۸، ص ۳۶
- ۷۔ ابن قیم، زاد المعاد، مطبعہ میمیہ، مصر، سن اشاعت غیر مرقوم، ج ۱، ص ۳۲۶
- ۸۔ مسند احمد، دار الحدیث قاہرہ، ۱۴۱۶ھ/۱۹۹۵ء، ج ۱، ص ۲۵۲
- ۹۔ فتاویٰ عالمگیری، دالکتاب دیوبند، سن اشاعت غیر مرقوم، ج ۲، ص ۲۵۲
- ۱۰۔ ابوالحسن علی ندوی، کاروان زندگی، مکتبہ اسلام، لکھنؤ، ۱۴۲۲ھ، ج ۷، ص ۲۶۰-۲۶۱
- ۱۱۔ ابن نجیم، الاشباہ والنظائر، ادارہ نشر و اشاعت دارالعلوم دیوبند، ۱۴۰۶ھ، ص ۱۴۷
- ۱۲۔ رشید احمد گنگوہی، فتاویٰ رشیدیہ، گلستاں کتاب گھر، دیوبند، ۱۹۸۷ء، ص ۵۷
- ۱۳۔ غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل، ایفا پیلی کیشنز، نئی دہلی، مارچ ۲۰۰۶ء، ص ۵۰
- ۱۴۔ الصحیح البخاری، کتاب الاحکام، باب ما یکرہ من الحرص علی الامارۃ
- ۱۵۔ الصحیح البخاری، کتاب الاحکام، باب من سأل الامارۃ وکل رلیہا
- ۱۶۔ الصحیح المسلم، کتاب الاقصیۃ، باب بیان خیر الشہود
- ۱۷۔ پروفیسر سعود عالم قاسمی، موجودہ سیاست میں مسلمانوں کی شرکت اور شرعی حدود، مقالہ: سیمینار منعقدہ ۲۵ اپریل، ۲۰۱۰ء، بہ مقام، بنگلور، ص ۵
- ۱۸۔ ڈاکٹر قاسم رسول الیاس، مسلمانوں کے لیے سیاسی پارٹی کا جواز، راشنریہ سہارا (اردو) نئی دہلی، ۲۷ فروری ۲۰۰۹ء، ص ۷
- ۱۹۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: مقالہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مجلہ بحث و نظر، شمارہ ۵۱، پھلواری شریف پٹنہ
- ۲۰۔ ابو محمد عبد الملک ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، ج ۲، ص ۱۲۱

- ۲۱ ابن نجیم، الاشباہ والنظائر، ص ۱۴۵
- ۲۲ ایضاً، ص ۱۴۷
- ۲۳ نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے، ایفا پبلی کیشنز، نئی دہلی، اپریل ۲۰۰۹ء، ص ۱۰۸
- ۲۴ ابن نجیم، الاشباہ والنظائر، ص ۱۰۰
- ۲۵ پروفیسر سعود عالم قاسمی، موجودہ سیاست میں مسلمانوں کی شرکت اور شرعی حدود، ص ۷
- ۲۶ الصحیح البخاری، کتاب الادب، باب لایلدغ المؤمن من جحر مرتین
- ۲۷ ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب ما یقول اذا خاف قوماً
- ۲۸ مسلمانوں کو درپیش مسائل کی تحقیق اور شرعی رہنمائی کے لیے قاضی مجاہد الاسلام قاسمی نے ۱۹۸۹ء میں اسلامک فقہ اکیڈمی کی بنیاد رکھی جس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے پورے خطے میں ایک نئی علمی امنگ، ذوق تحقیق، اعتدال فکر اور فقہی تحریک کو وجود بخشا۔ (اکیڈمی کے تفصیلی تعارف کے لیے ملاحظہ کریں: اکیڈمی کا کارواں-منزل بہ منزل، از: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی)
- ۲۹ نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے، ص ۱۰۸
- ۳۰ مبادی سیاسیات، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۵ء، ص ۱۷۴-۱۷۵
- ۳۱ ایضاً، ص ۲۰۹
- ۳۲ تفصیل کے لیے دیکھیے: جسونت سنگھ، اتحاد سے تقسیم تک (اردو ترجمہ فرحت احساس)، روپا اینڈ کو، ۲۰۰۹ء
- ۳۳ مبادی سیاسیات، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، ۲۰۹-۲۱۱
- ۳۴ ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی، متزلزل ستون پرنگی جمہوریت، راشٹریہ سہارا (اردو) نئی دہلی، ۲۷ جنوری، ۲۰۰۸ء، ص ۱
- ۳۵ ایضاً، ص ۱
- ۳۶ ڈاکٹر خاور ہاشمی، عام انتخابات اور مسلمان، روزنامہ جدید خبر اردو، نئی دہلی، ۱۱ اپریل، ۲۰۰۹ء، ص ۳
- ۳۷ مولانا اسرار الحق قاسمی، اب آپ بھی احتساب کریں تو بات بنے، راشٹریہ سہارا (اردو) نئی دہلی، ۳ مارچ، ۲۰۰۹ء، ص ۵
- ۳۸ Why We need that Extra Proof Loyalty from Indian Muslim

برکھادت، روزنامہ ہندوستان ٹائمز دہلی، ۱۴ مارچ، ۲۰۰۶ء

۳۹ پروفیسر احمد سجاد، موجودہ سیاست اور اقتدار کے بیچ پتلا سماج، سہ روزہ دعوت، نئی دہلی، ۲۲ جون، ۲۰۱۰ء، ص ۴

۴۰ علامہ شوکانی، نیل الاوطار، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۹ء، ج ۱۸، ص ۳۴

۴۱ ڈاکٹر وہبہ الزحیلی، الفقہ الاسلامیہ وادلتہ، دار الفکر بیروت، ۲۰۰۲ء، ج ۸، ص ۶۴۲۱

۴۲ ابوالحسن علی ندوی، سیرت رسول اکرم ﷺ، سید احمد شہید اکیڈمی، رائے بریلی، ۲۰۰۲ء، ص ۲۶

۴۳ ترمذی، ابواب السیر، باب ماجاء فی طعام المشرکین

۴۴ ابوبکر بھصا، احکام القرآن، دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۰۵ھ، ج ۱، ص ۱۵۵

۴۵ ایضاً، ص ۱۵۴

۴۶ الصحیح البخاری، کتاب الذبائح والصيد، باب ما ذبح علی النصب، والا ضنام

۴۷ ابن تیمیہ، اقتضاء الصراط المستقیم، مطابع المجد التجاریہ، سن اشاعت غیر مرقوم، ص ۲۵۰

۴۸ الصحیح البخاری، کتاب الادب، باب رحمة الناس والیہائم

۴۹ الصحیح البخاری، کتاب الادب، باب صلة الوالد المشرک

۵۰ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج ۳، ص ۳۶۶

۵۱ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی صلة الرحم؛ بخاری، کتاب الادب، لیس الواصل بالمکافی

۵۲ جواہر الفقہ، ج ۵، ص ۷۰

۵۳ ڈاکٹر وہبہ الزحیلی، الفقہ الاسلامیہ وادلتہ، ج ۸، ص ۶۴۱۸

۵۴ ابن نجیم، الاشباہ والنظائر، ص ۱۴۰

۵۵ ابوداؤد، کتاب الجنائز، فی عیادۃ الذمی

۵۶ ابوالحسن علی ابن ابی بکر الفرغانی، ہدایہ، شرکت علمیہ، ملتان، سن اشاعت غیر مرقوم، ج ۴، ص ۴۷۲

۵۷ علامہ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، دار الکتب العربی بیروت، ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء، ج ۸، ص ۲۰۳

۵۸ ابن یوسف زیلعی، نصب الرایۃ، دار المامون شبرا، ۱۳۵۷ھ، ۱۹۳۱ء، ج ۲، ص ۲۸۱

۵۹ عمر بن محمد عوض السامی، نصاب الاحتساب، مکتبہ الطالب الجامعی، مکہ، سن اشاعت غیر مرقوم، ج ۱، ص ۱۱۲

۶۰ علامہ شبیر احمد عثمانی، تفسیر عثمانی، ص ۲۷۱

- ۶۱ ابوداؤد، کتاب البیوع، باب فی تضمین العاریۃ
- ۶۲ ابو عبد اللہ محمد بن مفلح، الآداب الشرعیۃ، موسسة الرسالة بیروت، ۱۴۱۷ھ، ج ۲، ص ۴۲۸-۴۲۹
- ۶۳ مولانا تقی امینی، اسلام اور جدید دور کے مسائل، مکتبہ فیض دیوبند، سن اشاعت غیر مرقوم، ص ۳۳۵
- ۶۴ مسلم پرسنل لا بورڈ - پس منظر، قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، تعمیر حیات، لکھنؤ، ۱۰ مارچ، ۲۰۱۰ء، ص ۲۲
- ۶۵ مسلم پرسنل لا بورڈ - کارکردگی کے چند روشن نقوش، مولانا نظام الدین قاسمی، تعمیر حیات، لکھنؤ، ۱۰ مارچ، ۱۴۰۹ھ، ص ۲۳
- ۶۶ موجودہ سیاست میں مسلمانوں کی شرکت اور شرعی حدود، پروفیسر سعود عالم قاسمی، بنگلور، ۲۵ اپریل، ۲۰۱۰ء، ص ۴
- ۶۷ ہدایہ ثانی، کتاب الطلاق، باب النفقة، اشرفی بک ڈپو، دیوبند، ج ۲، ص ۴۴۰
- ۶۸ روزنامہ راشٹریہ سہارا، نئی دہلی، یکم اپریل، ۲۰۰۹ء، ص ۹
- ۶۹ ابوالحسن علی ندوی، کاروان زندگی، مکتبہ اسلام، لکھنؤ، ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء، ج ۸، ص ۳۴۲-۳۵۳
- ۷۰ علامہ کاسانی، بدائع الصنائع، مطبع جمالیہ مصر، ۱۳۲۶ھ/۱۹۱۰ء، ج ۷، ص ۳
- ۷۱ بدر الحسن قاسمی، مقالہ بعنوان: غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کے حدود اور سیاسی سرگرمیوں میں شرکت کا حکم، غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے مسائل، ایفاپبلی کیشنز، نئی دہلی، ص ۲۳۵-۲۳۷
- ۷۲ الصحیح البخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب من بنی مسجداً
- ۷۳ فتاویٰ محمودیہ، ادارہ صدیق ڈابھیل، گجرات، ۲۰۰۷ء، ج ۱۵، ص ۱۴۲-۱۴۳





## باب چہارم

غیر مسلم معاشرہ میں مسلمانوں کی ذمہ داریاں

موجودہ زمانہ میں انسانی معاشروں میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہو گئی ہیں، سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقیوں نے دنیا کو بدل کر رکھ دیا ہے، نئے نئے آلات و وسائل اور مواصلات کے تیز رفتار ذرائع نے دنیا کو ایک چھوٹے سے گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے۔ معاش، معاشرت، اقتصاد و تجارت اور زندگی کے دوسرے تمام میدانوں میں نئے نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔

غیر مسلم معاشروں میں مسلمانوں کی ذمہ داریوں کا سوال اس لیے اہم ہے کہ آج دنیا بھر میں ۴۰ فیصد مسلمان ان ممالک میں رہتے ہیں جہاں اکثریت غیر مسلموں کی ہے، جہاں اقتدار غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہے اور جہاں سیکولر جمہوری نظام حکومت چل رہا ہے، ایسے ممالک میں رہنے والے مسلمان مسلم اقلیت کہلاتے ہیں۔ ان کے بارے میں اسلام کے بین الاقوامی قوانین کے ماہر اور عظیم اسکالر ڈاکٹر محمود احمد غازی کہتے ہیں:

”اس گفتگو سے یہ نہ سمجھئے گا کہ مسلم اقلیتوں کا کردار کوئی مشکل کردار ہے یا آج مسلمانوں کے وجود سے فائدہ اٹھانے کی کوئی ایسی دعوت دی جا رہی ہے جو کوئی انہونی چیز ہے۔ یا ماضی میں یہ تصور ناپید تھا، اس کے برعکس مسلم اقلیتیں ہمیشہ سے موجود رہی ہیں اور ہر دور میں اسی قسم کا کردار ادا کرتی رہی ہیں۔“

جو مسلمان غیر مسلم ممالک میں رہتے ہیں، ان کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، یہ تین حصے مختلف تاریخی پس منظر سے آتے ہیں:

(۱) ان میں ایک اقلیت تو وہ ہیں جن کے علاقے بہت پہلے آزاد مسلم مملکتوں کی حیثیت رکھتے تھے اور اب وہ کسی غیر مسلم طاقت کے مقبوضات میں شامل ہیں۔ مثلاً مشرقی یورپ میں آباد بلغاریہ، یونان اور کروشیا کے مسلمان جو پہلے سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھے اور اب ان علاقوں میں مسلمان اقلیت کے طور پر رہ رہے ہیں، اسی طرح جنوبی فلپائن کے مسلمان ہیں جن کی کبھی آزاد ریاست تھی۔

(۲) دوسرا بڑا حصہ ان مسلمانوں کا ہے جو مسلمان علاقوں اور ریاستوں سے نقل مکانی کر کے غیر مسلم

ملکوں میں جا کر آباد ہو گئے ہیں۔ ان میں اکثر تو یورپ میں ہیں اور کچھ جنوبی افریقہ اور امریکہ میں جا بسے ہیں اور کچھ آسٹریلیا، جزائرِ غرب الہند اور جزائرِ مشرق الہند میں آباد ہوئے۔ ۴

(۳) تیسرے مسلمان وہ ہیں جو مقامی طور پر اسلام قبول کر کے نئی آبادیوں میں پیدا ہوئے۔ دنیا کے تمام خطوں میں آج بھی لوگ بڑی تیزی سے اسلام میں داخل رہے ہیں۔ ۵

جہاں تک ایسے معاشروں میں مسلمانوں کی ذمہ داریوں کی بات ہے تو سب سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ ایک مسلم اقلیت کے فرائض و واجبات مسلم اکثریت کے فرائض و واجبات سے الگ ہیں یا دونوں کے فرائض اور ذمہ داریاں یکساں ہیں۔ فقہ اسلامی کی رو سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم اقلیت و اکثریت دونوں کے فرائض و واجبات اور ذمہ داریوں میں نمایاں فرق ہے۔ البتہ دین کے وہ مطالبات جو اصلی اور اساسی ہیں اور جو ہر مسلمان سے فرداً فرداً اور علی الاطلاق مطلوب ہیں جیسے ارکانِ دین، عقائد، اخلاقی تعلیمات، عبادات اور وہ معاملات جن کے لیے اقتدار کی کوئی ضرورت نہیں ہے وہ ہر حال میں مطلوب رہتے ہیں مگر اسلام کے فوجداری قوانین اور اجتماعی تعلیمات جن کے نفاذ کے لیے حکومت و اقتدار کی شرط ہوتی ہے وہ اقلیتی مسلمانوں سے مطلوب نہیں ہوتے ہیں۔ عصر حاضر کی بعض دینی جماعتوں نے اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھا ہے اور انھوں نے دینی فرائض و ذمہ داریوں کو مطلق انداز میں بیان کیا ہے جس سے مسلم دنیا کے بہت سے علاقوں میں جلد باز اور جو شیلے نوجوان طبقوں سے حالات کو نظر انداز کرنے کی غلطیاں ہوئیں اور بعض جگہوں پر اس کے خطرناک اثرات بھی مرتب ہوئے۔ اس لیے اکثریت و اقلیت کے فرق کو ملحوظ رکھنا بہت اہم ہے۔ ۶۔ ڈاکٹر غازی لکھتے ہیں:

”رسول اللہ ﷺ نے مدینہ تشریف لا کر کسی سے نہیں کہا کہ نکلو اور بلا وجہ بیٹھے بٹھائے دنیا سے لڑ جاؤ، غزوہ بدر میں بھی آپ نے جب تک بار بار انصار سے استمراج نہ فرمایا، مقابلہ کا فیصلہ نہیں فرمایا آپ نے مکہ مکرمہ میں کسی سے نہیں کہا کہ چلو اسلامی انقلاب لانا ہے۔ کسی قبیلہ کو دعوت نہیں دی کہ اٹھو اور اسلام کی خاطر لڑ جاؤ، آپ نے خاموشی سے مدینہ جا کر تعلیم و تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا۔ ساتھ ساتھ مدینہ منورہ کے چاروں طرف ہمدرد قبائل سے معاہدے کیے اور یوں آپ نے چاروں طرف ہمدرد قبائل کا ایک سلسلہ قائم کر لیا۔ ۷

یہ مسئلہ طے ہو جانے کے بعد کہ مسلمان اکثریتوں اور مسلم اقلیتوں کے فرائض و واجبات اور دینی

ذمہ داریاں الگ الگ ہوں گی، اب غیر مسلم معاشرہ میں مسلمانوں کی ذمہ داریوں کو چار حصوں میں تقسیم کر کے ان پر گفتگو کی جائے گی۔ سب سے پہلے سیاسی ذمہ داریوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

### ۱۔ مسلمانوں کی سیاسی ذمہ داریاں:

سیاست زندگی کا اہم اور لازمی جز ہے اس سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا، ہر فرد، قوم اور گروہ کی زندگی میں اس کی اہمیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی ملکوں یا ہندوستان جیسے ممالک میں کسی مسلمان اقلیت کو سیاست سے کلی طور پر منقطع ہونے کا مشورہ دینا درست نہ ہوگا۔ چند علماء اور جماعتیں جو پہلے اسی رائے کی حامل تھیں وہ بھی اب حالات کے تقاضوں کے تحت اپنی رائے پر نظر ثانی کر رہے ہیں اور سیاست میں منفرد کردار ادا کرنے کے لیے پرتول رہے ہیں۔ ۸۔ البتہ اصولی طور پر اقلیت کی سیاست اکثریت کی سیاست سے یکسر الگ اور ممتاز ہوگی۔ مثال کے طور پر کسی اقلیتی مسلمان جماعت کے لیے شرعی طور پر اس بات کو صحیح قرار نہیں دیا جاسکتا کہ وہ حکومت و اقتدار پر غاصبانہ قبضہ کرنے کی کوشش کرے اور اسلامی انقلاب لانے کے لیے کوئی سورش برپا کرے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ:

”مسلم اقلیتوں کی نہ یہ دینی ذمہ داری ہے اور نہ ان کے لیے سیاسی طور پر یہ ممکن ہے کہ وہ کسی مسلم ملک کے قائم شدہ نظام کو بدل کر وہاں اسلامی حکومت قائم کریں، اللہ تعالیٰ کی شریعت نے یہ ذمہ داری دارالاسلام کے باشندوں پر عائد کی ہے۔ غیر مسلم معاشرہ میں بسنے والے مسلمانوں پر عائد نہیں کی“۔ ۹۔

اصولی طور پر اس کی بنیاد ہمیں اسوۂ رسول میں ملتی ہے اور شریعت یا فقہ اسلامی کے عمومی تعارف میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ شریعت کے آٹھ آٹھ بڑے بڑے شعبے ہیں۔ یعنی عبادات مناکات، معاملات، الحظر والاباحۃ، الاحکام السلطانیہ، جنایات، ادب القاضی اور سیر، ان میں سے اول الذکر چار شعبے وہ ہیں جو ہر مسلمان پر شخصی طور پر ہر وقت اور ہر جگہ واجب ہوں گے یعنی ان کا دائرہ شخصی ہے۔ اس کے برعکس آخر الذکر چار شعبوں کے احکام پر عمل درآمد کے لیے سیاسی اقتدار اور حکومت کی ضرورت ہے، جہاں مسلمانوں کو سیاسی اقتدار حاصل ہوگا وہاں ان شعبوں کے احکام پر عمل ہوگا ورنہ مسلمان ان پر عمل درآمد کے مکلف نہ ہوں گے، اس سے ہرگز یہ نہ سمجھا جائے کہ شریعت کے یہ احکام نعوذ باللہ معطل ہو جائیں گے، اس لیے کہ شریعت کا کوئی بھی حکم کبھی معطل نہیں ہو سکتا بلکہ اس سے مراد صرف یہ ہے کہ ان احکام پر

عمل درآمد کرنے کے لیے ضروری شرائط میں حکومت اسلامی کا وجود بھی ہے لہذا جہاں یہ شرط پائی جائے گی وہاں ان احکام پر عمل ہوگا اور جہاں یہ شرط نہ ہو وہاں یہ احکام واجب التعمیل نہیں ہوں گے، اس کو ایک مثال کے ذریعہ اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ روزہ کی فرضیت کے لیے رمضان کا مہینہ شرط ہے اب اگر کوئی شخص شوال میں مسلمان ہوا اور شعبان کے مہینہ میں اس کا انتقال ہو گیا تو یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ اس کے لیے روزہ کی فرضیت معطل ہو گئی تھی بلکہ یہ کہا جائے گا کہ اس کے لیے روزہ کے وجوب کی شرط (وجود رمضان) نہیں پائی گئی اس لیے روزے اس پر فرض نہیں ہوئے، اسی طرح اگر کسی شخص کے پاس زندگی بھر بقدر نصاب مال نہ ہو تو اس پر زندگی بھر زکوٰۃ فرض نہ ہوگی، لیکن یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ اس کے لیے زکوٰۃ کی فرضیت معطل ہو گئی ہے۔ اسی طرح مؤخر الذکر شعبوں کے احکام کی بنیادی شرط دارالاسلام اور اسلامی حکومت ہے۔ اگر یہ شرط پائی جائے گی تو ان احکام پر عمل ہوگا ورنہ نہیں۔ بالفاظ دیگر ان احکام کا دائرہ کار علاقائی ہے۔ جب تک کوئی شخص دارالاسلام سے باہر رہے گا اس پر ان احکام کا اجرا نہیں ہوگا لیکن جب وہ دارالاسلام میں داخل ہو جائے گا تو یہ احکام اس پر منطبق ہونا شروع ہو جائیں گے۔ ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ اقلیتی مسلمانوں کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ وہ ان علاقائی نوعیت کے احکام کے نفاذ کے اسباب اور ماحول پیدا کرنے کی کوشش کریں تاکہ شریعت کے ان احکام پر ان کو عمل کرنے کا موقع ملے۔ لیکن یہ خیال ایک بے اصل اور کمزور خیال ہے جو ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اگرچہ بعض تحریکات اسلامیہ نے اپنے لیے اس خیال کو وجہ استدلال بنایا ہے اگر یہ درست نہیں ہے۔ ڈاکٹر غازی لکھتے ہیں:

”پہلی بات تو یہ ہے کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے کبھی حضرت جعفر طیار یا کسی صحابی کو حبشہ پیغام بھیجا تھا کہ تم وہاں حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش کرو تاکہ شریعت کے فلاں فلاں احکام پر عمل درآمد کا موقع ملے۔ کیا خیر القرون میں کبھی کسی صحابی، تابعی، تبع تابعی، فقیہ یا مجتہد نے ان متعدد مسلم اقلیتوں کو اکسایا کہ جب تک تم اپنے اپنے علاقوں میں حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں نہیں لو گے تم شریعت کے بہت سے احکام پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے گنہ گار ہو گے۔ بعد کے ادوار میں بھی تبلیغ اسلام کے لیے صوفیاء کرام اور بزرگان دین کے غیر مسلم علاقوں میں جا کر بسنے کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ میری ناچیز معلومات کی حد تک ان میں سے کسی نے بھی اپنے نو مسلم مخاطبین کو ایسی تلقین نہیں کی جس سے متاثر ہو کر وہ اپنے اپنے علاقوں میں

اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے کھڑے ہوں، مزید برآں جس طرح کسی شخص کے لیے یہ ضروری نہیں ہے اور نہ شریعت نے اس کو مکلف بنایا ہے کہ وہ زکوٰۃ ادا کرنے کی خاطر پہلے دولت اکٹھی کر کے صاحب نصاب بنے اور پھر زکوٰۃ ادا کرے۔ فرضیت زکوٰۃ کا ہمیشہ یہی مفہوم سمجھا گیا ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس بقدر نصاب پس انداختہ ہو تو وہ زکوٰۃ ادا کرے ورنہ خیر..... یا مثلاً وراثت کے احکام پر عمل کرنے کا مقتضی کسی نے بھی یہ نہیں سمجھا کہ مرنے والا کچھ دولت مرنے سے پہلے جمع کرنے کی کوشش کرے تاکہ اولاد کو وراثت کے احکام پر عمل کرنے کا موقع ملے۔ ہر ذی فہم آدمی نے اس کا مفہوم یہی سمجھا کہ اگر مرنے والا کچھ دولت چھوڑ کر مرے تو اس کو احکام وراثت کے مطابق تقسیم کر دیا جائے گا اور اگر مرنے والا کچھ نہ چھوڑے تو خیر..... مذکورہ بالا شعبوں (عبادات، مناکحات، معاملات، الحظر والاباحۃ) میں سے عبادات کے احکام پر عمل درآمد میں عموماً کوئی بڑی دشواری پیش نہیں آتی۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے احکام پر عمل کرنے کے لیے محض ایمان اور ذرا پختہ قوت ارادی کی ضرورت ہوتی ہے، زیادہ مشکلات بقیہ تین شعبوں میں مناکحات، معاملات اور الحظر والاباحۃ میں پیش آتے ہیں۔“ ۱۲

یہ اصولی مباحث اتنی تفصیل سے اس لیے ذکر کیے گئے ہیں کہ آگے آنے والی بحثوں کا ان اصول و مبادی سے بڑا گہرا اور بنیادی تعلق ہے۔ بڑی حد تک یہ بات صاف ہو جانے کے بعد کہ غیر مسلم معاشرہ میں مسلمانوں کی ذمہ داریاں مسلم اکثریتی معاشروں سے بالکل الگ نوعیت کی ہوتی ہیں۔ اب ہم اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ سیاست کے میدان میں مسلمان کیا رول ادا کر سکتے ہیں اور ان کی ذمہ داری کیا ہوگی۔

### سیکولرزم اور جمہوریت کا تحفظ:

مغرب کے تمام معاشرے سیکولر بلکہ الٹرا سیکولر ہیں وہاں مسلمانوں کے سامنے جو چیلنج ہے وہ الٹرا سیکولرزم ہے جو مذہبی علامتوں تک کو اپنے لیے خطرہ سمجھتا ہے، مثال کے طور پر فرانس میں مسلمانوں کے نقاب اور اسکارف سے ان کو خطرہ محسوس ہوتا ہے، سویڈن اور ڈینمارک میں ان کو مسجد کے میناروں سے خطرہ کی بو آتی ہے، مغرب کے مسلمانوں کے اس بارے میں دو گروپ ہیں۔ ایک گروپ سلفی تحریک سے

متاثر لوگوں کا ہے، جن کے خیالات میں صرفیت پسندی اور ظاہریت نظر آتی ہے۔ ان لوگوں نے اس چیلنج کے مقابلہ کا طریقہ یہ سوچا ہے کہ اپنی فکر میں اور زیادہ شدت پیدا کی جائے۔ چنانچہ جب فرانس میں اسکارف پر پابندی لگی اور پبلک مقامات پر نقاب اور اسکارف پہننے والی عورتوں پر جرمانہ عائد کیا گیا تو وہاں متعدد عورتوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اسکارف نہیں اتاریں گی اور اس کے لیے وہ جرمانہ ادا کریں گی۔ ۱۳

ڈاکٹر طہ جابر علوانی جیسے بڑے عالم نے (جو امریکہ میں مقیم ہیں) مغرب کے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ اس طرح کے معاملات میں غیر ضروری شدت کا اظہار نہ کریں اس سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار اور بھی کئی دانشوروں کی طرف سے لیا گیا۔ ۱۴

ایک سوال یہ بھی آیا کہ امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک کے مسلمان کیا ان ممالک کی فوجوں یا پولس میں شامل ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر وہ شامل ہوں تو کیا وہ اپنے ملک کی فوج کے ساتھ کسی مسلم ملک کے خلاف آپریشن میں حصہ لے سکتے ہیں یا نہیں، چنانچہ کئی علماء کی رائے یہ ہے کہ ان کو جو بھی ذمہ داری تفویض کی جائے وہ ان کو ادا کریں اگرچہ لڑائی میں شرکت کا معاملہ ہی کیوں نہ ہو۔ ۱۵

امریکہ کے مسلمانوں کے سامنے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ وہ ملکی انتخابات میں حصہ لے سکتے ہیں یا نہیں اور امیدواروں کی حمایت کر سکتے ہیں یا نہیں؟ امریکہ میں مقیم کئی عرب علماء و اسکالروں نے اثبات میں جواب دیا کہ وہ انتخاب میں ضرور شرکت کر سکتے ہیں۔ ۱۶ یاد رہے کہ امریکہ میں مقیم مسلمانوں کے سلسلے میں عربوں کے یہاں یہ بحث تھی کہ کیا عرب یا کسی مسلمان ملک سے ہجرت کر کے امریکہ یا مغرب کے کسی ملک میں جایا جاسکتا ہے یا نہیں؟ مصر کے مشہور عالم شیخ رشید رضا مصری نے اس وقت یہ فتویٰ دیا تھا کہ مغرب کی جانب نقل مکانی کرنا جائز نہیں ہے اور بہت سے سلفی علماء آج بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔ ۱۷

ہندوستانی تناظر میں:

مذکورہ بالا سوالات پر ہندوستانی تناظر میں اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں مسلم علماء اور دانشوروں کی اکثریت کی رائے یہ ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں جو سیکولرزم اور جمہوریت رائج ہے وہ مغرب سے کافی حد تک مختلف ہے اور یہ بنیادی طور پر مذہب مخالف نہیں ہے اور یہ مسلم اقلیت کے حق میں ہے، کیونکہ اگر سیکولر اور جمہوری نظام نہ ہوگا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ دائیں بازو کی سیاست غالب آجائے گی۔

مثال کے طور پر یہاں ہندوتوا (ہندو قوم پرستی کا فلسفہ) ۱۸ اس ملک کو قدیم ہندو دھرم اور ویدک نظریات کے مطابق چلانا چاہتا ہے، یہ برہمن منو وادی تحریک مسلمان سمیت ملک کی تمام اقلیتوں کو دوسرے درجے کا شہری بنانا چاہتی ہے۔ جس کے سیاسی بازو بی جے پی نے ملک پر دو مرتبہ حکومت کی ہے اور اب بھی کئی ریاستوں میں اسی کی سرکار ہے، سنگھ پر یوار (بی جے پی، وشو ہندو پریشد و شیو سینا اور بجرنگ دل) کے اس جارحانہ ہندوتوا کے مقابلہ میں کانگریس اور اس کی اتحادی پارٹیاں نرم ہندوتوا کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں، کیونکہ اکثریتی ووٹوں کو وہ بھی نہیں کھوسکتیں۔ مسلمان علماء کی اکثریت اس نرم ہندوتوا والے کانگریسی سیکولرزم کو اھون البلیتین اور اخف الضررین کے فقہی قاعدے کے تحت قابل قبول سمجھتی ہے۔ ہندوستان جیسے معاشرہ میں جمہوریت اور سیکولرزم کی وجہ جواز ان کے نزدیک یہ ہے:

”وطن عزیز نے آزادی کے بعد اپنے لیے سیکولرزم اور جمہوریت کی راہ اپنائی۔ یہ دونوں وضعی نظام ہیں اور دوسرے وضعی نظاموں کی طرح اپنے مثبت و منفی دونوں اثرات رکھتے ہیں۔ ان کے کچھ فائدے ہیں تو کچھ نقصانات، چونکہ آزادی ہند کے مخصوص حالات میں یہ دونوں ہی اس ملک میں قابل عمل ہو سکتے تھے کہ ان کا متبادل یہاں جارح ہندوتوا کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا، لہذا تحریک آزادی میں برابر کا حصہ لینے والے چوٹی کے مسلم علماء و مفکرین نے جن میں سے بیش تر کی تعداد علمائے دیوبند سے تعلق رکھتی تھی، نے برضا و رغبت سیکولرزم اور جمہوریت کی تائید و حمایت کی۔ ان علماء و دانش وروں میں شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد جیسے نابغہ روزگار اور مولانا محمد میاں جیسے دیدہ ورمورخ شامل ہیں۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے مسلم لیگ والی ناعاقبت اندیشانہ راہ نہ اپنا کر ایک حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا۔ یہاں یہ واضح رہے کہ جمہوریت اور سیکولرزم کی یہ نظری و عملی تائید و حمایت بمقابلہ اسلامی نظام سیاست نہیں تھی بلکہ دوسرے وضعی نظامہائے سیاست کے مقابلہ میں تھی ورنہ یہ علماء بھی اسلامی سیاست کی اہمیت اور احیاء دین کے مقام سے بخوبی واقف تھے۔“ ۱۹

بعض علماء اور تنظیمیں جمہوریت و سیکولرزم کو کفر و شرک قرار دیتے ہیں۔ ان کے استدلالات کا جائزہ

لیتے ہوئے لمبی بحث و تجزیہ کے بعد ڈاکٹر غطریف شہباز ندوی نے لکھا ہے:

”راقم سطور کی نگاہ سے اب تک جتنی تنقیدیں اس طبقہ فکر کی جانب سے گزری ہیں ان میں



تجزیہ کی سخت کمی، ناقص استدلال کی کارفرمائی اور چند مغالطوں کے علاوہ کچھ اور نظر نہیں آتا۔ اصل یہ ہے کہ انھوں نے اپنے طور پر پہلے یہ فرض کر لیا کہ سیکولرزم ایک بے خدا نظریہ حیات ہے اور جمہوریت حاکمیت الہیہ کی نفی کرتی ہے، پھر اس مفروضہ پر اور مفروضات و استدالات کی عمارت کھڑی کر لی۔“ ۲۰

اس کے بعد ڈاکٹر ندوی نے سیکولرزم اور جمہوریت کے معنی و مفہوم سے تفصیل سے بحث کی ہے اور دکھایا ہے کہ ان کے جن مفاہیم کو کچھ علماء کفر و شرک بتاتے ہیں وہ دراصل بعض انتہا پسند اور پر جوش نمائندوں کی رائے کو لے کر تجزیہ کی عمارت کھڑی کرتے ہیں جو ایسی ہی غلطی ہے جیسے کچھ غیر مسلم اسکالر اور دانشور انتہا پسند مسلم نوجوانوں کے جنگ جو یا نہ خیالات کو لے کر ان کی بنیاد پر کہتے ہیں، دیکھو اسلام یہ ہے اور وہ اپنے ماننے والوں کو تشدد برپا کرنا اور مرنا مارنا سکھاتا ہے۔“ ۲۱

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ہندوستان جیسے معاشروں جہاں ملک کو دائیں بازو کے انتہا پسندوں اور ہندویت کے جنگجو علمبرداروں کا خطرہ درپیش ہو جمہوریت اور سیکولرزم کی مخالفت کرنا بالکل صحیح نہیں ہے۔ علماء و دانشوروں کی بڑی اکثریت کے نزدیک ایسے ممالک میں نظام وقت میں مسلمانوں کو شامل ہونا چاہیے انتخابات میں حصہ لینا چاہیے، پبلک ایڈمنسٹریشن، سول سروسز، پولس، عدلیہ اور پارلیمنٹ میں داخل ہونا چاہیے کیونکہ ایسا کرنے سے وہ ملک کے مسلمانوں کے ملی و مذہبی مفادات کا تحفظ کر سکتے ہیں۔ موجودہ دور کے ایک بڑے فقیہ اور اسلامک فقہ اکیڈمی نئی دہلی کے جنرل سکریٹری مولانا خالف سیف اللہ رحمانی لکھتے ہیں:

”ایسے مواقع پر شریعت کا بنیادی نقطہ نظر یہ ہے کہ زیادہ درجہ کے مفسدہ سے بچنے کے لیے کم تر درجہ کے مفسدہ کو قبول کر لیا جائے، فقہاء نے اسے مختلف الفاظ میں تعبیر کیا ہے جن میں چند یہ ہیں: (۱) اذا تعارضت مفسدتان روعی اعظمهما ضرراً بارتکاب اخفهما۔ جب مفسد کا تعارض ہو تو بڑے ضرر سے بچنے کے لیے چھوٹے کا ارتکاب کیا جائے گا۔ (۲) الضرر الاشد یزال بالضرر الاخف۔ کم تر نقصان کے ذریعہ بڑے نقصان کو دور کیا جائے گا۔ (۳) یختار اھون الشرین۔ دو شر میں سے کم تر کو گوارا کیا جائے گا۔ (۴) یحتمل الضرر الخاص لمنع الضرر العام۔ اجتماعی نقصان کو دور کرنے کے لیے انفرادی نقصان کو گوارا کیا جائے گا۔“ ۲۲

اس معاملہ میں شریعت کے موقف کی بہترین وضاحت علامہ ابن تیمیہ نے فرمائی ہے وہ لکھتے ہیں:

”اذا تعارضت المصالح والمفاسد والحسنات والسيئات أو تراحمت فانه  
يجب ترجيح الراجح منها اذا ازدحمت المصالح والمفاسد وتعارض  
المصالح والمفاسد، فان الامر والنهي وان كان متضمنا لتحصيل مسئلة ودفع  
مفسدة، فينظر في العارض له، فان كان الذي يفوت من المصالح أو يحصل  
من المفاسد اكثر لم يكن مأموراً به بل يكون محرماً إذا كانت مفسدته أكثر  
من مصلحته“۔ ۲۳

(جب مصالح و مفاسد اور خوبیوں و خامیوں میں تعارض و ٹکراؤ ہو جائے تو ضروری ہے کہ ترجیح  
سے کام لیا جائے اس لیے کہ امر و نہی اگرچہ کسی مصلحت کو حاصل کرنے اور کسی مفسدہ کو دور  
کرنے کو ہی شامل ہوتا ہے، لیکن اس کے ساتھ جو عارض سامنے آرہا ہے اس پر غور کیا جائے،  
چنانچہ اگر فوت ہونے والی مصلحتیں اور پیدا ہونے والے مفاسد زیادہ ہوں تو وہ مامور بہ نہیں  
ہوں گے بلکہ حرام ہوں گے شرط یہ ہے کہ اس کا مفسدہ مصلحت سے زیادہ ہو۔)

### حالات زمانہ کی رعایت:

غیر مسلم معاشروں میں ایک اہم اصول کی نشاندہی علماء نے حالات زمانہ کی رعایت کے طور پر کی  
ہے ویسے یہ زندگی کا ایک عام اصول ہے جو اکثریت اور اقلیت دونوں طرح کے مسلمانوں کو شامل ہے،  
مسلم غیر مسلم معاشرہ میں رہنے والے مسلمانوں کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ علماء نے اس سلسلہ میں صلح  
حدیبیہ سے استشہاد کیا ہے، علامہ صلاح الدین العلانی نے حالات زمانہ کی رعایت کے لیے صلح حدیبیہ کو  
اصل قرار دیا ہے۔ ۲۴ علماء کہتے ہیں حالت اختیار اور حالت اضطرار کے احکام یکساں نہیں ہوتے جیسا کہ  
فقہاء اس مشہور قاعدے سے استشہاد کرتے ہیں: الضرورات تبيح المحذورات اور امام شافعیؒ نے  
اسی قاعدہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ يجوز في الضرورة ما لا يجوز في غيرها۔ ۲۵ مذکورہ تمام  
اصولی قواعد و ضوابط کے مد نظر علماء نے یہ نتیجہ نکالا ہے: ”ظاہر ہے کہ مسلمان اپنے ملک میں بڑی حد تک  
حالت اختیار میں ہوتے ہیں اور جہاں اقلیت میں ہوں، وہاں اس درجہ کے اختیارات حاصل نہیں ہوتے،  
اس لیے اگر ایسے علاقہ میں وہ بعض احکام شرعیہ پر عمل کرنے سے معذور ہوں تو وہ اس کے بارے میں

جواب دہ نہیں ہیں، پس ان دونوں اصولوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے لیے جمہوری ممالک میں انتخاب میں حصہ لینا نہ صرف جائز ہے بلکہ ممکن ہے کہ بعض حالات میں یہ ان پر واجب قرار پائے۔ اس سلسلہ میں ایک نظیر حضرت یوسف علیہ السلام کی حیات طیبہ میں بھی ملتی ہے اس کے لیے علماء علامہ قرطبی کا حوالہ دیتے ہیں۔ ۲۶ طبری، علامہ فخر الدین رازی، ابن کثیر اور مفسر علامہ ابوالسعود عمادی کے نزدیک یہی رائج ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے وزارت مالیات کا مطالبہ کیا تھا۔ اس سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ غیر اسلامی نظام حکومت میں مسلمان حکومت کے کام کاج میں حصہ لے سکتے ہیں، نظام وقت سے تعاون کر سکتے ہیں اور اس میں شرکت کر سکتے ہیں۔ اس کا حصہ بن سکتے ہیں اور اس میں کوئی شرعی مانع نہیں ہے۔ جن علماء اور تحریکوں نے اس مسئلہ میں شدت برتی ہے ان کا استدلال غلط ہے اور اب وہ بھی بتدریج جمہور کی رائے کے قائل ہوتے جا رہے ہیں۔ ۲۷

### بین مذاہب ہم آہنگی اور فرقہ واریت کی مخالفت:

مغربی ملکوں میں اور ہندوستان میں مسلمانوں کو اکثریتی مذہبی انتہا پسندی کا سامنا ہے۔ مغرب میں مثلاً جرمنی، فرانس اور بیلجیم و ڈینمارک اور امریکہ میں یہ خطرہ مسیحی دائیں بازو کی تنظیموں سے ہے تو ہندوستان میں ہندو انتہا پسندوں سے ہے جن کے مجموعے کو سنگھ پر یوار کہتے ہیں۔ ۲۸ یہ قوتیں سیاسی طور پر اور سماجی طور پر بہت مضبوط ہیں، پولیس، عدلیہ، سیاسی حلقوں اور میڈیا پر ان کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ کئی ریاستوں میں ان کی سیاسی ترجمان بی جے پی کی حکومت ہے۔ ان کی طرف سے بڑا چیلنج فرقہ وارانہ فسادات کا ہے جو وہ وقفہ وقفہ سے مختلف شہروں میں برپا کرواتے رہتے ہیں اور جن سے ہمیشہ ہی جان و مال اور عزت و آبرو کے اعتبار سے مسلمانوں کو نقصان ہوتا ہے۔ کیونکہ انتظامی مشینری اور پولس کی پشت پناہی ان بلوائیوں کو حاصل رہتی ہے۔ ان مشکل حالات سے نپٹنے کے لیے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ریلیف فنڈ قائم کریں، لیگل سیل قائم کریں اور میڈیا میں ایسے افراد بھیجیں جو ان پر ہونے والے مظالم کو حکومت وقت تک پہنچا سکیں۔ ان تمام اقدامات کے ساتھ ساتھ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو برقرار رکھنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ مسلمان غیر قوموں سے وسیع پیمانہ پر تعلقات قائم کرے، ان کے مذہب اور تصورات کا مطالعہ کرے اور پھر ان کے ساتھ مذہبی و سماجی ڈائیلاگ، متنازعہ ایشوز پر مذاکرے و گفتگو اعتراضات اور معاندانہ پروپیگینڈے کا جواب، فسادات کی مخالفت، اشتعال انگیز تقریر و تحریر سے مکمل احتراز، قومی سلامتی

کے امور میں زیادہ سے زیادہ شرکت، غیر مسلموں کو اپنے پروگراموں میں بلانے اور مشترکہ امور میں ان کے ساتھ اشتراک عمل کو ترجیحی بنیاد پر انجام دے۔

مسابقت:

دوسرا بڑا چیلنج مسابقت کا ہے، اقلیت میں ہونے اور کمزور ہونے کے سبب مسلمانوں کو برادران وطن سے ہر میدان میں دگنی محنت درکار ہے، انھیں ہر میدان میں آگے بڑھنے اور اپنی صلاحیت دکھانے کی ضرورت ہے، خاص طور پر معیشت کے، تعلیم کے اور روزگار کے میدان میں، میڈیا میں اور مقابلہ جاتی امتحانوں میں آگے نکلنے اور بہترین کارکردگی کے ذریعہ اپنی جگہ بنانے کی ضرورت ہے۔ ایک مفکر کے نزدیک ”جس سماج میں خواندگی کا تناسب ۳۰ فیصد سے کم ہو اور اعلیٰ تعلیم ایک فیصد کو بھی حاصل نہ ہو اس کی نشاۃ ثانیہ اور انسانی قیادت کے منصب پر فائز ہونے کی باتیں کتنی غیر حقیقت پسندانہ معلوم ہوتی ہیں! یہی احساس اس وقت ہوتا ہے جب ہم اس اقتصادی بد حالی اور سیاسی آزادی کے فقدان کا جائزہ لیتے ہیں جس میں پوری دنیائے اسلام مبتلا ہے۔ ان حالات کو تبدیل کیے بغیر ہمارا آگے بڑھنا دشوار ہے۔ اس تبدیلی کے لیے ہمہ گیر منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ ۲۹

ملک و ملت کے لیے نفع بخش بننا:

اس سلسلہ میں بڑی چیز یہ ہے کہ یورپ و امریکہ، ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں مسلمان اپنی اہلیت ثابت کریں۔ وہ ان ملکوں کے لیے ایک Asset بن جائیں، ان پر بوجھ نہ بنیں، وہ ملک کی فوج، پولیس، عدلیہ، تعلیمی نظام، انڈسٹریز، میڈیا اور تجارت میں آگے آئیں۔ مختلف این جی او قائم کر کے سماج کی تعمیر و ترقی کا کام کریں۔ ملکی سیاست میں جو کرپشن ہے اس کی مخالفت میں آواز بلند کریں۔ کمزور طبقات کے ساتھ ہونے والے مظالم کا اسلامی تعلیمات اور اپنے کردار کے ذریعہ علاج کریں اور سماج سے بھید بھاؤ اور طبقاتی فرق کو ختم کر کے مساوات کا علم بلند کریں۔ علماء کی ایک بڑی تعداد ان ملکوں کی سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی میں مسلمانوں کی بھرپور شرکت و فعالیت کو ضروری قرار دیتی ہے۔ جس کے لیے مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اور ڈاکٹر صلاح سلطان کی تحریروں کی طرف رجوع کیا جاسکتا

ہے۔ ۳۰

## قومی و مذہبی تشخص کی حفاظت:

قومی و ملی تشخص کی حفاظت بھی ایک بڑا سیاسی چیلنج ہے جو غیر مسلم معاشروں کے مسلمانوں کو درپیش ہے۔ ان چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے انھیں اپنا ملی، مذہبی اور تہذیبی تشخص برقرار رکھنا ہے۔ جس طرح یہودی پوری دنیا میں موجود ہیں اور ہر جگہ کلیدی کردار میں ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کو بھی اپنے ملکوں میں فعال کردار ادا کرنا ہے۔ اس کے لیے اسکا لرو دانشور یہ رائے دیتے ہیں کہ مسلمان قومی و علاقائی زبانوں میں اپنا لٹریچر منتقل کریں، اپنے مدارس و مکاتب کا تحفظ کریں، لائبریری اور ریڈنگ روم قائم کریں اور میڈیا کے وسائل پر اپنی پکڑ اور دسترس مضبوط کریں، کیونکہ آج کے تیز رفتار زمانے میں جب تک مسلمان حالات کے تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو نہیں ڈھالیں گے، اس وقت تک نہ وہ آگے بڑھ سکتے ہیں اور نہ اپنا ملی و مذہبی تشخص برقرار رکھ سکتے ہیں۔ ۳۱

## امیج بلڈنگ:

ملی مفادات کا تحفظ بھی ایک بڑا سیاسی چیلنج ہے۔ مثال کے طور پر آج پوری دنیا میں مسلمانوں کی امیج کو بگاڑ کر انھیں دہشت گرد اور تشدد پسند کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ اس منہج شدہ تصویر کو درست کرنا مسلمانوں کا ترجیحی کام ہے، کیونکہ اس کے پشت پر نہ صرف مسلمان کو بدنام کیا جا رہا ہے بلکہ ان کے مذہب اسلام پر بھی بالواسطہ اور بلا واسطہ انگلی اٹھائی جا رہی ہے۔ لہذا مسلمانوں کی یہ سیاسی ذمہ داری ہے کہ اگر کہیں بھی دہشت گردانہ حملے ہوتے ہیں اور بد قسمتی سے ان حملوں کے ذمہ دار مسلمان ہیں تو ان کی مذمت کریں، تردید کریں اور اس طرح کی بزدلانہ کاروائیوں کی بیخ کنی کے لیے تمام لوگوں کے ساتھ تعاون کریں اور یہ مثبت پیغام دیں کہ اسلام اس طرح کی حرکتوں کی حوصلہ افزائی نہیں بلکہ حوصلہ شکنی کرتا ہے۔

## ریزرویشن:

ایک اہم کام یہ بھی ہے کہ تعلیم، اقتصاد اور ملازمت میں ریزرویشن حاصل کرنے کی کوشش کی جائے، ریزرویشن اصولی طور پر غلط ہو سکتا ہے مگر سچر کمیٹی کی رپورٹ نے مسلمانوں کا جو آئینہ دکھایا ہے اور ان کی سدھار کے لیے جو تجاویز پیش کی ہیں ان میں ریزرویشن کا حصول بہت ضروری ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ غیر مسلم معاشروں میں رہتے ہوئے اپنے تشخص کی حفاظت کریں۔ مسلمانوں کی سیاسی ذمہ داریوں میں شامل ہے کہ وہ سیاسی طور پر سرگرم رہیں، فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی کوشش کریں اپنی امیج بہتر بنانے کی کوشش کریں اور ملک کی جملہ ترقیوں کے لیے اپنا تعاون پیش کریں۔

## سماجی ذمہ داریاں

### باہمی اعتماد:

ایک مضبوط و سالم معاشرہ کے لیے بنیادی طور پر باہمی اعتماد کا ہونا بہت ضروری ہے، اسی لیے صرف اس معاشرہ کو خوش بخت اور سعادت مند سمجھنا چاہیے جس کے افراد کے درمیان مکمل اتحاد و اطمینان کا رشتہ پایا جاتا ہو، لیکن اگر معاشرہ کے افراد اپنے عمومی فرائض کی سرحدوں کو پار کر لیں اور دوسروں کے حقوق کے ساتھ خیانت کرنے لگیں تو پھر معاشرہ کا باہمی اعتماد بگڑنے لگتا ہے اور انتشار اپنی جڑ مضبوط کرنا شروع کر دیتا ہے۔

انسان کے تمام شعبہ حیات میں کچھ مختلف قسم کے فرائض ہوتے ہیں، جس میں ہر شخص کا حصہ ہوتا ہے اور عقل، فطرت اور دین ہر شخص کے لیے حکم لگاتے ہیں کہ وہ اپنے حصہ کی ذمہ داری کو پورا کرے تاکہ بحیثیت مجموعی تمام کے فرائض ادا ہو سکیں اور ہر ایک کی زندگی میں مسرت و اطمینان اور بھروسہ کی فضا بحال ہو جائے۔ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ ان تمام ذمہ داریوں کو انسانی زندگی سے حذف کر دے یا خدا کی طرف سے یا معاشرہ کی طرف سے عائد پابندیوں سے چشم پوشی کر کے ان کو بے قیمت سمجھنے لگے۔ اس لیے انسان کو اپنی فطرت کے مطابق اپنی آپسی زندگی اور معاشرہ کے درمیان عدم اعتماد باہمی کو فروغ دینے کا حق نہیں ہے، اسی باہمی اعتماد کی بنا پر انسان کے لیے معاشرہ کی طرف سے کچھ اصول و قوانین بنائے جاتے ہیں اور کچھ معاشرتی و سماجی ذمہ داریاں عائد کی جاتی ہیں، جن کی پابندی اور ادائیگی بہر حال ضروری ہوتی ہے تاکہ آپسی تعاون سے زندگی کی مشکلات پر قابو پایا جاسکے۔ اگرچہ اپنی ذمہ داریوں کو نبھانا بہت ہی دشوار ہوتا ہے، کیوں کہ ہر انسان ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ کسی مشقت کو برداشت کیے بغیر راحت و آسائش حاصل کرے۔

شخصی سعادت سے کہیں زیادہ ضروری اجتماعی سعادت ہوتی ہے، بلکہ اجتماعی سعادت ہی افراد کی

سعادت کی بنیاد ہوتی ہے اور خود حدیث نبویؐ میں اجتماعیت پر اللہ کی مدد کا وعدہ ہے: ”یَدُ اللّٰہِ عَلٰی الْجَمَاعَةِ“ معاشرہ کے حقوق کو پورا نہ کرنا اور ذمہ داریوں کو ادا نہ کرنا معاشرہ کے اجتماعی روح کے منافی ہے اور یہ چیز سماجی نظم و نسق میں رخنہ انداز ہوتی ہے۔ زندگی، آزادی، دوسروں کی حیثیت کو ملحوظ رکھنا یہ ساری چیزیں ہر فرد کی شخصی ذمہ داری ہے۔ جو لوگ اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہیں اور معاشرہ کے حقوق کی تکمیل کرتے ہیں ان کے ساتھ لوگوں کا رشتہ محبت و اخوت کا ہوتا ہے اور ایسے لوگوں پر ہی اعتماد و بھروسہ کیا جاسکتا ہے اور یہی لوگ باہمی اعتماد و تعاون حاصل ہونے کی وجہ سے زندگی کی دوڑ میں ہمیشہ آگے رہتے ہیں اور وہ دوسروں کی بھی خوش بختی کا سبب بنتے ہیں اس لیے سماج و معاشرہ میں باہمی اعتماد کا جذبہ فروغ دینے کے لیے ضروری ہے کہ سماجی ذمہ داریاں اور معاشرتی حقوق ادا کیے جائیں۔

مسلمان، سماج، ذمہ داریاں:

ما قبل میں یہ بات گذر چکی کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد غیر مسلم ممالک میں قیام پذیر ہے، انسان چونکہ مدنی الطبع واقع ہوا ہے، اس کے مزاج اور طبیعت میں دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنے کا عنصر شامل ہے، لہذا مسلمانوں کا ایک سماج میں رہنا اور اس کا ایک حصہ بننا فطری بات ہے۔ ایک سماج کے کچھ اصول و قوانین اور کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں جن کی ادائیگی صحت مند معاشرہ کے لیے ضروری ہے چونکہ مسلمان دین متین کے نمائندے ہیں لہذا ایک صالح معاشرہ کی تشکیل کی ذمہ داری بھی دیگر اقوام کے مقابلہ میں ان کے اوپر زیادہ ہے۔ وہ تمام اوصاف جو معاشرہ کو صحت مند اور صالح بنا سکتے ہوں ان کو اختیار کرنا اور دوسروں کو اس پر آمادہ کرنا مسلمانوں کی یہ سماجی ذمہ داری ہے اور اسی طرح افعال شنیعہ سے بھی اجتناب مسلمانوں کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔

(۱) ظلم کا خاتمہ:

انسانی معاشرہ سے ظلم کا خاتمہ شرعی مقاصد میں سے ایک مقصد ہے۔ انسانی سماج میں پھیلے ہوئے ظلم کی بہت ساری شکلیں ہیں۔ کہیں یہ ظلم ریاست اپنے شہریوں پر کر رہی ہے جیسا کہ دنیا میں بہت سے ممالک اور حصوں میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر برما کا علاقہ، شام، فلسطین (اسرائیل) خود ہمارے ملک کی بعض ریاستیں، کہیں یہ ظلم اکثریت اقلیت پر کرتی ہے اور کہیں مالدار غریب پر کرتے ہیں۔ کہیں مردوں کے غلبہ والا سماج عورتوں پر مظالم ڈھاتا ہے، کہیں ادنیٰ و اعلیٰ کا فرق ہے اور کہیں دوسری

طرح کے مظالم رائج ہیں۔ فقہاء اسلام کے مطابق ظلم والاسماج اور جابر حکومت اگر مسلمان کی بھی ہو تو قابل قبول نہیں ہوگی۔ اس کے مقابلے میں کفر کو برداشت کیا جائے گا۔ اگر کفر ظلم و ستم نہ کرتا ہو۔ بقول پروفیسر نجات اللہ صدیقی: ”قیام عدل کے لیے ضروری ہے کہ ظلم کو دور کیا جائے، ظلم عدل کا متضاد ہے۔ ظلم کی تعریف ہے وضع الشئ فی غیر محله یعنی کسی شئی کا بے جا استعمال۔ قرآن کریم میں ظلم کی بڑی مذمت کی گئی ہے اور اس سے دور رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ظلم کی تمام شکلوں کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔“ اس کے بعد پروفیسر صدیقی نے سورہ ص کی آیات ۲۱ تا ۲۴ کا حوالہ دیا ہے جن کے اندر ظلم و زیادتی کی بہت ساری شکلیں بیان کر دی گئی ہیں۔ ۳۲

## (۲) عدل و انصاف کا قیام:

ظلم کے خاتمہ سے عدل و انصاف کا قیام ہوتا ہے اور عدل و انصاف کا قیام مسلمانوں کی ایک اہم سماجی ذمہ داری ہے۔ قرآن کریم کے مطابق رسولوں کو بھیجے اور ان کے اوپر آسمانی کتابیں نازل کرنے کا اہم مقصد یہ بھی رہا ہے کہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔ پروفیسر نجات اللہ صدیقی کے لفظوں میں ”عدل و قسط پر قائم رہنے کی تاکید قرآن کریم کی متعدد آیات میں کی گئی ہے۔ جو یثیٰ، عزالدین ابن عبدالسلام، ابن تیمیہ اور ابن القیم نے بھی اسے مقاصد شریعت میں شمار کیا ہے اس مقصد کے تحت شریعت میں احکام دیے گئے ہیں اور اس کے لیے اجتہاد بھی کیا جائے گا..... عدل و انصاف کو صراحت کے ساتھ مقاصد شریعت میں شمار کرنے کی آواز حال ہی میں احمد احمیلی نے بھی اٹھائی ہے۔ ۳۳

## (۳) غربت و ناداری کا خاتمہ:

آج ہمارے سماج میں اور خاص طور پر ہندوستان جیسے غیر اسلامی معاشرہ میں بہت سارے مسائل غربت، ناداری اور سماجی و معاشی ناہمواری سے پیدا ہوتے ہیں، سماج سے غربت کا خاتمہ بھی اسلامی شریعت کے مقاصد میں سے ہے۔ اور اسلامی نظام معیشت کا تو یہی مقصد اولین بھی ہے۔ غیر اسلامی معاشرہ میں مسلمانوں کی عام ذمہ داری ہے کہ وہ سماج سے ازالہ غربت کی کوشش کریں۔ اس میں سب سے پہلے تو ان کو مسلم معاشرہ سے اس کے ازالہ کی کوشش کرنا ہے پھر عام سماج سے۔ اس سلسلہ میں مالی تصرفات کے بارے میں مقاصد شرعیہ کا مطالعہ مفید ہوگا۔ ۳۴

اس بارے میں ائمہ اور علماء اسلام نے واضح طور پر لکھا ہے کہ یہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے



کہ سماج سے غربت کو دور کرنے کی کوشش کرے، اس سے استدلال کیا جاسکتا ہے کہ اس سے کم درجہ میں یہ عام مسلمان معاشرہ کی بھی ذمہ داری ہوگی۔ عزالدین ابن عبدالسلام نے سیدنا عمر فاروقؓ کا یہ قول نقل کیا ہے: ”لوگو! اللہ نے مجھ پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ میں اس کے حضور کی جانے والی دعاؤں کو روکوں“ اس کی تشریح کرتے ہوئے ابن عبدالسلام کہتے ہیں ”اللہ کے حضور کی جانے والی دعاؤں کو روکنے کا مطلب یہ ہے کہ امام ظالموں کے مقابلہ میں مظلوموں کے ساتھ انصاف کرے اور ان کو اس بات کی ضرورت باقی نہ رہے کہ وہ اللہ رب العالمین سے ان کی تکمیل کے طالب ہوں، حکمرانوں پر مسلمانوں کے جملہ حقوق کے بارے میں یہ جملہ کتنا جامع اور واضح ہے۔ ۳۵

### (۴) اوقاف کی بحالی:

دنیا کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں مسلمان اس حیثیت میں ہیں کہ ان کے یہاں اوقاف کو مذہبی، کلچرل اور تہذیبی اہمیت حاصل ہے۔ ماضی میں اوقاف کی وجہ سے مسلمانوں کے جملہ علوم و فنون کے ادارے، مساجد، لائبریریاں اور تحقیقی ادارے چلا کرتے تھے اور ان کو ہر طرح کے افراد اور خدمات حاصل ہوا کرتی تھیں۔ یہ اوقاف زیادہ تر بادشاہ، شہزادے، امراء اور سماج کے معزز حضرات کی طرف سے قائم ہوتے تھے اور ان کو علم و فن، علوم اسلامیہ، مذہب کی دعوت و تبلیغ اور عوامی رفاہ کے کاموں کے لیے خرچ کیا جاتا تھا، خانقاہوں و مزارات اور مدارس کی سرگرمیوں کا بہت حد تک ان پر انحصار رہتا تھا۔ ان اوقاف کو رفتہ رفتہ زوال ہوا اور خاص طور پر ۱۹ویں صدی میں جب مغربی استعمار نے مسلم ممالک پر حملے کیے اور اکثریتی علاقوں پر قبضہ کیا اس وقت سامراج نے یکے بعد دیگرے مختلف ممالک میں اوقاف کو ختم کر دیا۔ ان کو لوٹ لیا اور بحق سرکار ضبط کر لیا۔ اس کے بعد ان ممالک کو بیرونی استعمار سے آزادی ملی تو خود میں سے بہت سے ممالک میں مثال کے طور پر ہندوستان میں جو اکثریتی اقتدار ہوا جو بظاہر جمہوری اور سیکولر ہے مگر اندرونی طور پر مسلمانوں کے تینے تعصبات کا شکار ہے۔ اس نے اربوں کھربوں کی اوقاف کی جائداد کو مسلمانوں کے حق میں استعمال کرنے کے بجائے ان میں خرد برد کرنا شروع کر دیا۔ آج آزادی کے اتنے سال گذر جانے کے بعد بھی مسلمان اپنی سیاسی و معاشی کمزوریوں کے باعث ان اوقاف کی بحالی کا کام نہیں کر سکے ہیں۔ مرکزی اور ریاستی حکومتیں اس معاملہ میں غیر مخلص ہیں، وقف کمیٹیاں خود ان جائدادوں کی بے جا لوٹ میں شریک ہیں اور مسلمان تنظیموں کا کام کانفرنسوں، جلسوں یا احتجاج سے آگے نہیں بڑھتا۔ ضرورت

اس بات کی ہے کہ اوقاف کی بحالی کو بھی ایک تحریک کی شکل دی جائے اور ان سے ہونے والی کھربوں کی حقیقی آمدنی کو مسلمانوں کی ترقی و تعلیمی اسکیموں پر خرچ کیا جائے۔ ۳۶

غیر مسلم معاشرہ میں اوقاف کی بحالی اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کے ذریعہ مسلمان سماجی اور معاشی طور پر دوسروں کے شانہ بشانہ چل سکتے ہیں اور سماج کی تعمیر و ترقی میں ایک مثبت کردار ادا کر سکتے ہیں۔

### (۵) چیریٹی ورک:

مسلمانوں کی سماجی ذمہ داریوں میں اور مذکورہ بالا مقاصد کے حصول کے لیے موجودہ زمانہ کے لحاظ سے چیریٹی اور چیریٹیبل اداروں کا قیام بھی ضروری ہے۔ جن میں اوقاف کی بحالی ایک بڑا کردار ادا کر سکتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں چیریٹی ورک نے زبردست اہمیت حاصل کر لی ہے۔ عیسائی اور یہودی تنظیموں کے تحت قائم ہونے والے چیریٹی ادارے دنیا بھر میں کام کر رہے ہیں۔ یہ ادارے اپنے اخبار، ٹی وی چینل اور ریڈیو اسٹیشن چلاتے ہیں۔ اپنے وسیع نیٹ ورک کی وجہ سے ایک بڑا پریشر گروپ بن جاتے ہیں۔ خود ہمارے ملک ہندوستان میں آکسفام جیسے ادارے کام کر رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کے مختلف ادارے بھی چیریٹی ورک میں سرگرم ہیں۔ ہندوادی تنظیمیں بھی رفاہی کام کر رہی ہیں اور بعض مسلمان تنظیمیں بھی جن کے اثرات خاصے محدود ہیں۔ ۳۷

### (۶) این جی اوز کا قیام:

چیریٹی ورک اور سماجی خدمت کو بڑے اور منظم پیمانے پر کرنے کے لیے ایسے این جی اوز کا قیام بھی ضروری ہے جن کے ذریعہ سماجی تعمیر و ترقی کے کام کیے جاسکیں۔ ان اداروں میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے ادارے، خیراتی شفا خانے، ووکیشنل ٹریننگ سنٹرز، دماغی و جسمانی معذورین کے مراکز صحت، فساد متاثرین کی باز آباد کاری اور بحالی کے ادارے، سیلاب زدگان کی مدد اور قدرتی آفات سے متاثر افراد کی امداد کا کام منظم طریقہ سے انجام دیا جاسکتا ہے۔ یوں تو یہ سارے کام آج بھی انجام پا رہے ہیں لیکن غیر منظم طور پر۔ اکثر دینی جماعتیں اور تنظیمیں قدرتی آفات یا فرقہ وارانہ فسادات کے موقعوں پر متاثرین کے لیے ریلیف ورک کرتی ہیں، لیکن جس بڑے اور منظم طریقہ پر ان کاموں کو کرنے کی ضرورت ہے وہ تبھی پورا ہو سکتا ہے جب ان کو ادارہ جاتی بنیاد پر کیا جائے۔ اس کے لیے ہمیں ایسے اداروں کی ضرورت ہوگی جو

ملی و قومی سطح پر مسلمانوں کے لیے بنائی جانے والی پبلک پالیسی کا مطالعہ اور تحقیق کریں، مسلمانوں اور حکومتوں نیز متعلقہ ایجنسیوں کی اپنے تحقیقی جائزوں اعداد و شمار، ڈیٹا اور تحقیق کے نتائج کے ذریعہ رہنمائی کریں۔ خاص طور پر تعلیمی مشعل کو عام کرنے کے لیے حکومتی امداد کے انتظار میں نہ رہیں بلکہ مختلف اداروں کی ماتحتی میں پورے معاشرے کو علم کے نور سے منور کرنے کی کوشش کریں۔ اس حقیقت کا اعتراف بلا تردد کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم و تربیت کے لیے سب سے بڑا اور منظم اور غیر سرکاری نیٹ ورک اسلامی و عربی مدارس و مکاتب کا ہے۔ یہ رضا کارانہ طور پر اتنے این جی او کام کر رہے ہیں جس کی کوئی مثال دنیا میں نہیں۔ ۳۸

یہ وسیع نیٹ ورک تعلیم اور خواندگی کے کام کو بہت بڑے پیمانے پر انجام دے رہا ہے اور نئی مسلم نسل کو خاص طور پر دیہاتی علاقوں میں انجام دے رہا ہے۔ تاہم مدارس اسلامیہ عربیہ محض دینی تعلیم اور عربی زبان و قدیم اسلامی فنون کی تعلیم کے ادارے ہیں، جن میں سے زیادہ تر اب اپنی افادیت کھو چکے ہیں، ان میں عصری ضروریات کی تکمیل کی صلاحیت نہیں۔ مدارس اسلامیہ کو نئے زمانہ کے تقاضوں اور چیلنجوں کا ادراک ہونا چاہیے۔ زمانہ سے ہم آہنگ ہونے اور جدید ذہن کے شبہات کے ازالے کے لیے عصری مضامین کو اپنے نصاب میں شامل کرنے پر توجہ دینی چاہیے اور اسی لحاظ سے افراد سازی کرنی چاہیے، تبھی قیام مدارس کے حقیقی مقاصد (تبلیغ دین) حاصل ہوں گے۔

(۷) نجی سیکٹر:

زمانہ ماضی میں حکومتیں ہی معاشرہ میں سب سے اہم رول ادا کرتی تھیں۔ سرکاری اور حکومتی ملازمتیں ہی ترقی کی معراج تھیں۔ آج زمانہ بہت بدل گیا ہے، آج وہ سارے کام این جی او، غیر سرکاری ادارے اور پرائیویٹ کمپنیاں کر رہی ہیں، نجی سیکٹر کا دخل زندگی کے ہر شعبہ میں بڑھ رہا ہے اور حکومت و ریاست کا رول گھٹتا چلا جا رہا ہے اور محض نظم و نسق تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ زمانہ کی اس رفتار کا ساتھ دینے کے لیے مسلمانوں کے پاس بھی نجی زمرے کے ادارے ہوں تاکہ ان کے ذریعہ ملک و ملت کی فلاح و بہبود کے کام انجام دیں۔ ۳۹

(۸) معاشی ترقی:

سماج کا تصور معاش کے بغیر نہیں ہوتا۔ اس معاملہ میں مختلف معاشروں کے اعتبار سے مسلمانوں

کے حالات مختلف ہیں۔ ہندوستانی تناظر میں دیکھا جائے تو ہمیں نظر آئے گا کہ مسلمانوں کی اکثریت غربت و افلاس کا شکار ہے۔ مسلمانوں کی خستہ حالی کے اسباب کیا ہیں ان پر روشنی ڈالتے ہوئے مشہور ماہر معاشیات پروفیسر نجات اللہ صدیقی رقم طراز ہیں:

”حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر معاشی ترقی کے لیے جدوجہد کے محرکات انتہائی کمزور ہیں اور ان کے درمیان اس کے لیے کوئی جوش و خروش پیدا نہیں ہو سکا ہے۔ اس مظہر کے بہت سے اسباب ہیں جو سارے ہندوستانیوں میں مشترک ہیں۔ رواجی زندگی پر قناعت، ہر اس تبدیلی کو محال سمجھنا جواب تک واقع نہ ہو، اپنی ناطاتی کا احساس اور بہتری اور تبدیلی کے عمل کا خارج سے انتظار، معاشی وسائل کو صرف ذاتی آرام و آسائش میں اضافہ کا ذریعہ سمجھنا اور اخلاقی و روحانی زندگی کے لیے اس کی اہمیت کا شعور نہ ہونا اور بنا بریں اقتصادی جدوجہد اور کاروبار کو اخلاقی و روحانی اعتبار سے استخفاف کی نظر سے دیکھنا۔ وغیرہ وغیرہ“۔

خلاصہ:

غیر مسلم معاشرہ میں مسلمانوں کے اوپر عائد بے شمار ذمہ داریوں میں اہم باہمی اعتماد کی فضا بحال کرنے کی کوشش، حقوق و فرائض کی ادائیگی کی فکر، اوصاف قبیحہ مثلاً خیانت جیسی صفت سے اجتناب اور کمزور طبقوں کے حقوق کی ادائیگی اور ان کے ساتھ احسان، حسن سلوک اور ان کی ضروریات کی تکمیل کرنا، بیماری میں ان کی عیادت کرنا، مصیبت میں ان کی مدد کرنا، مسلمانوں کی سماجی ذمہ داریوں میں شامل ہے تاکہ وہ معاشرہ جہاں ان تمام اوصاف سے متصف مسلمان رہتے ہوں ایک مثالی معاشرہ بن سکے اور یہ بات علی الاعلان کہنا ممکن ہو کہ اسلام انسانیت نواز مذہب ہے اور انسانیت کی بقا، سلامتی اور اس کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے مذہب کی شرط نہیں لگاتا ہے، مذہب کی بنیاد پر غیر مسلموں کے سماجی بائیکاٹ کا حکم صادر نہیں کرتا ہے نہ لوگوں کو ان سے عداوت و دشمنی پر بھڑکاتا ہے اور نہ ان کی حق تلفی کی اجازت دیتا ہے۔ بلکہ وہ تمام انسانی اور شہری حقوق جو کسی انسان کو مل سکتے ہیں ان کو عطا کرتا ہے۔ وہ انسانوں سے محبت کرنا سکھاتا ہے، مصیبت زدوں کے لیے راحت پہنچانے کی تعلیم دیتا ہے، بیماروں کی عیادت کی ترغیب دیتا ہے، اخوت اور معاشرتی استحکام کی بنیاد کھڑی کرتا ہے اور فرد و معاشرہ کے درمیان باہمی ذمہ داری کا احساس پیدا کرتا ہے اور ایک مسلمان کو سماجی ذمہ داریوں اور اخلاقی اقدار کے تئیں حساس بناتا ہے۔

## دینی ذمہ داریاں

### (۱) ملی تشخص کی حفاظت:

اسلام ایک جامع مذہب اور کامل و مستقل تہذیب ہے۔ اس کی روح یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر دے جو کہ ساری کائنات کا مالک و خالق اور سب کا رب ہے۔ اسلام مذہب بھی ہے اور تہذیب بھی، وہ عقیدہ و عمل میں یکسانیت چاہتا ہے۔ چنانچہ اس کے عقائد کی بنیاد پر اس کی تہذیب وجود میں آئی اور اس کا تشخص قائم ہوا۔ مغربی ملکوں یا ہندوستان جیسے ممالک جہاں مسلمانوں کی تعداد اقلیت میں ہے ان کے لیے سب سے بڑا چیلنج خود اپنے تشخص کی حفاظت ہے، کیونکہ مغربی تہذیب نے سوچنے کے انداز بدل دیے، فحاشی، عریانیت، لہو و لعب اور شراب نوشی جیسی برائیاں مغربی تہذیب کا اہم جز ہیں اور پوری زندگی کا نظام اسی پر قائم ہے۔ مخرب اخلاق، فلمی گانے، نغمے، میوزک اور اس کی مختلف اقسام، ناچ رنگ، مقابلہ حسن، ریتھلی شوز اور عریاں لٹریچر مغربی زندگی کا لازمی جز ہے۔ متعدد ملکوں میں سیکس ایجوکیشن کو ابتدائی درجات سے ہی نظام تعلیم کا حصہ بنادیا گیا ہے۔ عورتوں اور لڑکیوں کا مطالبہ ہے کہ ان کو مردوں کے برابر حقوق دیے جائیں، انھیں زندگی میں ہر وہ آزادی چاہیے جو مردوں کا مقدر ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان میں بھی بہت حد تک مغربی ماحول کی پراگندگی چھا چکی ہے۔ اب اسی ماحول میں مسلمانوں کو رہنا ہے اور ان کو اپنے تشخص کی حفاظت کرنی ہے۔ یہی تشخص کا چیلنج ہے۔

مسلمانوں کے لیے اس طرح کے ماحول میں دو چیلنج ہیں کہ وہ کس طرح اسلامی طرز زندگی کو اپنائیں اور اس عمومی ماحول میں اپنے تشخص کو کیسے بچائیں۔ اسی تشخص سے وابستہ مسلم پرسنل لا کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ ان کو مغربی ملکوں میں بھی درپیش ہے اور ہندوستان میں بھی درپیش ہے۔ پرسنل لاء سے مراد اسلام کے عائلی اور معاشرتی قوانین ہیں۔ اہم جس میں نکاح، طلاق اور میراث سے متعلق قوانین ہیں۔ یہ قوانین کسی اسمبلی یا پارلیمنٹ کے وضع کردہ نہیں ہیں بلکہ اسلام کے عائلی اور معاشرتی قوانین کی بنیاد قرآن و سنت میں ہے۔ انسانی تاریخ کی بہترین صلاحیتوں اور اعلیٰ دماغوں (صحابہ، تابعین و مجتہدین) نے ان قوانین کی تشریح و تعبیر کا فریضہ انجام دیا ہے۔ ان قوانین میں ایسا کوئی ابہام اور خلا نہیں ہے جسے دور کرنے اور پُر کرنے کے لیے ملک کی عدالتوں اور ججوں کو مغز ماری کرنی پڑے۔ اس کے باوجود صورت حال یہ ہے

کہ آزادی کے بعد ہی سے سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ ایسے فیصلے دیتی آئی ہیں جن میں اسلامی قانون کو پامال کر دیا گیا ہے اور من مانی تشریح کی گئی ہے۔ ۴۲ عدالتوں کو ایسی من مانی تعبیر سے روکنا اور اہل ملک کے سامنے اسلامی پرسنل لا کی جدید اسلوب میں وضاحت کرنا بھی مسلمانوں کے سامنے ایک مسئلہ اور چیلنج ہے، جس کو مسلم پرسنل لا بورڈ اسلامی فقہ اکیڈمی، علماء اور ملی تنظیموں کو مل جل کر کرنا ہے کیونکہ یہ چیلنج اتنا بڑا ہے کہ پرانے گھسے پٹے طریقوں سے اس میں کامیابی نہیں ہوگی بلکہ اجتماعی اجتہاد کی راہ اپنانی ہوگی۔ ۴۳

## (۲) مسلم پرسنل لا کا تحفظ اور اس کی تفہیم جدید:

جیسا کہ ماقبل میں گذرا کہ ہر مذہبی فرقہ کے اپنے عائلی قوانین (پرسنل لا) ہوتے ہیں، جن کو اس مذہب کے پیرو عزیز رکھتے ہیں یہاں تک کہ ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے دوران بھی عائلی قوانین کے ساتھ کسی قسم کی چھیڑ خانی نہیں کی گئی۔ حالانکہ اس اقتدار نے غیر عائلی قوانین مثلاً معاہدوں، نقل ملکیت، شہادت اور جرائم کے سلسلہ میں یکساں اور مشترکہ قوانین جو برٹش سیکولر قوانین سے ماخوذ تھے، نافذ کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ لیکن آزادی کے بعد سے یہ مسئلہ ایک مستقل ایشو تمام اقلیتوں کے لیے خاص طور پر مسلمانوں کے لیے بنا ہوا ہے۔ دستور ہند میں یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کے لیے دفعہ ۴۴ کا اضافہ کر دیا گیا جس کے تحت ریاست کو اس بات کا پابند بنادیا گیا کہ وہ اس بات کے لیے کوشاں رہے گی کہ ہندوستان میں رہنے والوں پر مشترکہ عائلی قوانین Uniform civil code کا نفاذ کیا جائے۔ سول کوڈ کے مخالفین اور پرسنل لا کے حامیوں کے لیے تسلی کی بات یہ تھی کہ دفعہ ۴۴ کو دستور ہند کے چوتھے جز میں موجود ریاستی پالیسی کے رہنما اصول Directive Principles of State Policy کا حصہ بنایا گیا۔ فوری طور پر قابل نفاذ دفعات کا حصہ نہیں بنایا گیا۔ مگر آج تک عدالتیں اسی دفعہ کی آڑ میں متنازعہ فیصلے کرتی آرہی ہیں۔ واضح رہے کہ اس باب میں ۱۹ رہنما اصول ہیں۔ ۴۴ تضاد یہ ہے کہ دستور کے اندر بنیادی انسانی حقوق کی ضمانت جن دفعات میں دی گئی ہے ان سے دفعہ ۴۴ متصادم ہے۔ اور جب بھی یہ ٹکراؤ ہوگا ظاہر ہے کہ رہنما اصول میں ہونے کی وجہ سے دفعہ ۴۴ کو ہی عملی فوقیت اور ترجیح دی جائے گی۔ مسلم ممبران پارلیمنٹ نے اس دفعہ کی اصول سازی کے وقت بھی تشویش ظاہر کی تھی مگر مختلف حیلوں اور بہانوں سے ان کی آواز دبا دی گئی۔ مولانا حسرت موہانی نے بڑی بے جگری سے پارلیمنٹ میں کہا تھا ”کسی پارٹی کو خواہ وہ سیاسی پارٹی ہو یا فرقہ وارانہ پارٹی ہو، کسی فرقہ کے بالخصوص مسلمانوں کے عائلی

قوانین میں مداخلت کا حق نہیں ہے۔ مسلمانوں کے شخصی قوانین، ان کی شادی بیاہ، طلاق اور وراثت کے قوانین براہ راست قرآن سے ماخوذ ہیں۔ ان کی تعبیرات بھی قرآن میں محفوظ ہیں۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے پرسنل لا میں مداخلت کر سکتا ہے تو میں اس کو بتا دوں کہ اس قسم کی حرکت کا انجام بے حد نقصان دہ ہو سکتا ہے، میں اس ایوان کے فرش سے ان کو آگاہ کر دوں کہ ان کو اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔ مسلمان اپنے پرسنل لا میں مداخلت ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔ وہ جہاں بھی جائیں گے ان کو ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کا سامنا کرنا ہوگا کیونکہ مسلمان ہر طرح سے ان کی مخالفت کا عزم کر لیں گے۔“ ۳۵

آئین ساز کمیٹی کے صدر ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر نے مسلمانوں کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ ”کسی کو یہ اندیشہ نہ رہے کہ اگر ریاست کے پاس یہ قوت ہوتی تو ریاست فوراً اس طرح سے اس کا استعمال کرنے کے لیے دوڑ پڑے گی جو مسلمانوں یا عیسائیوں یا اس ملک میں آباد دوسرے فرقوں کے لیے دل آزاری کا باعث ہو۔ میرا خیال ہے کہ اگر کوئی حکومت ایسا کرتی ہے تو وہ صرف جنونی ہو سکتی ہے“۔ ۳۶ امبیڈکر کی یہ پیش قیاسی اس معنی میں تو صحیح ہوئی کہ کسی حکومت نے یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کی حماقت نہیں کی۔ مگر عدلیہ اپنی من مانی کرتی آرہی ہے اور اس کی طرف سے کوئی تحفظ مسلمانوں کو حاصل نہیں ہے۔ اس صورت حال میں ان کے سامنے دو چیلنج ہیں ایک قانونی لڑائی جاری رکھنے کا اور دوسرا اپنے عائلی قوانین کی عصری اسلوب میں تشریح اور وضاحت کرنے کا۔ جب ہی وہ اپنے پرسنل لا کا تحفظ کر سکتے ہیں اور غیر مسلم معاشرہ میں اپنے وجود اور تشخص کی لڑائی جیت سکتے ہیں۔

### (۳) اصلاح عقائد و رسوم:

یوں تو مسائل زندگی کے ہر گوشہ کو محیط ہیں اور مختلف ممالک اور علاقوں کے اعتبار سے ان میں فرق بھی پایا جاتا ہے۔ یہاں ہم ہندوستان میں پائی جانے والی بعض ناہمواریوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہونے کے باوجود ایک معقول اور معتد بہ تعداد میں ہیں، لیکن افسوس ناک صورت حال یہ ہے کہ وہ مختلف قبائل، مختلف گروہ اور مختلف مسلکوں میں بٹے ہوئے ہیں، محمود حسن الہ آبادی کے نزدیک ”مذہبی انتشار کا حال یہ ہے کہ مسلک کو دین کا درجہ دے دیا گیا ہے، مفتیانِ کرام جب بھی فتاویٰ دیتے ہیں تو وہ اپنے اپنے فتوؤں کو مسلک کا نام دیتے ہیں۔ اس وقت مسلمانوں میں اتنے مسلک ہیں اور ان کی بنیاد پر اتنی جماعتیں بن چکی ہیں کہ غیر مسلم بجا طور پر پوچھتے ہیں کہ اصل اسلام کس کے پاس

ہے؟ ہر جماعت تنہا خود کو برسر حق اور دوسروں کو گمراہ یا خارج از اسلام قرار دینے کی کوشش کرتی ہے، حتیٰ کہ جماعتی بنیاد پر کفر تک کے فتوے دیے جاتے ہیں اور آپس میں سلام و کلام بھی ممنوع قرار دیا گیا ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ مسجدیں تک الگ کر لی گئی ہیں۔“ ۷۷ء خاندانی زندگی پر نظر ڈالیں عجیب طرح کی پرشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، طرح طرح کی رسوم کے جال نے انہیں چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ ان رسوم کو تقدس کا درجہ دے دیا گیا ہے اس لیے ان کا اثر عقائد پر بھی حاوی ہو چکا ہے۔ سچ پوچھیے تو رسوم ہی دین بن چکے ہیں..... یوم پیدائش اور یوم وفات کو میلاد و عرس کا نام دے دیا گیا ہے جواب اجزائے دین بن چکے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ دین اسی کام کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ ۷۸ء ضرورت اس بات کی ہے کہ غیر مسلم معاشرہ میں مسلمان اپنے آپ کو عقائد باطلہ سے پاک و صاف رکھتے ہوئے ایک سچے اسلام کی تصویر پیش کرے تاکہ غیر اقوام شکوک و شبہات میں پڑنے کے بجائے اسلام کی حقانیت سے متاثر ہوں اور ہدایت کے دروازے ان کے لیے کھل جائیں۔

### دعوت و تبلیغ:

مسلم اہل فکر، باشعور علما اور دینی تنظیموں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مسلمان ایک دعوتی جماعت ہیں، اسلام ایک تبلیغی دین ہے، ماضی کی طویل تاریخ میں بھی دعوت و تبلیغ کی اسپرٹ کی بنیاد پر مسلمان تمام خارجی حملوں اور چیلنجوں کا مقابلہ کرتے رہے اور آج بھی اسی طریقے پر وہ اپنے مسائل حل کر سکتے ہیں۔ افسوس ناک صورت حال یہ ہے کہ مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے نے نعت خوانی اور عرس و قوالی کو ہی دین کی تبلیغ کا ذریعہ سمجھ لیا ہے اور دوسرے طبقے نے دعوت و تبلیغ کو صرف چلہ کشی اور تحریک نماز تک محدود کر دیا ہے۔ ایسے افراد اور جماعتیں نہ کے برابر ہیں جو غیر مسلم دنیا کو اور غیر مسلم برادران وطن تک دین کی دعوت پہنچانے کو ضروری سمجھتے ہوں۔ ہندوستان میں نیز یورپ اور دیگر مغربی ممالک میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان حریفانہ کشمکش پیدا ہو گئی ہے، بد قسمتی سے مسلمان حکمت کا وہ پہلو جو مومن کا گم شدہ متاع ہے اس کو جھوڑ کر بہت جلد جذباتیت کا شکار ہو کر غیر مسلموں سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ غیر مسلم اقوام دعوت ہیں۔ جن سے نفرت کرنے کے بجائے راہ حق کی طرف بلانے کی ضرورت ہے، حسن الدین احمد کے لفظوں میں ”مسلمانوں نے غیر مذاہب کے پیروؤں کو غیر ضروری طور پر اپنا مد مقابل کر لیا اور ایک خاص قسم کے Complex میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ غیر مسلم اقوام دعوت ہیں۔ چونکہ مسلمانوں کا



فرض ہے کہ وہ جس حق کو پاچکے ہیں اس کو دوسروں تک پہنچادیں اس لیے ضروری ہے کہ اقوام دعوت کے دلوں میں راہ پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اگر حق کو پیش کرنے کا طریقہ درست ہے تو اس کا اثر ہو کر رہے گا۔ عین ممکن ہے کہ آج جو عناصر اسلام کی مخالفت کر رہے ہیں وہ کل اسلام کے سپاہی بن جائیں۔ ۴۹۔ امت مسلمہ کا یہ بنیادی فریضہ ہے کہ وہ شہادت حق کا فریضہ انجام دیں۔ قرآن کریم میں شہادت حق کی ادائیگی کے بابت ارشاد فرمایا گیا:

”وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا“۔ (البقرہ: ۱۴۳)

(اور اسی طرح ہم نے تم کو امت معتدل بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور پیغمبر (آخر الزماں) تم پر گواہ بنیں۔)

یہ امت مسلمہ کا عین مقصد وجود ہے جسے اگر مسلمانوں نے پورا نہ کیا تو گویا زندگی ضائع کر دی، یہ اللہ کی طرف سے مسلمانوں پر عائد ذمہ داری ہے کیوں کہ خدا کا حکم یہ ہے کہ:

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ“۔ (النساء: ۱۳۶)

(اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، خدا کی خاطر اٹھنے والے اور ٹھیک ٹھیک راستی کی گواہی دینے والے بنو۔)

ایک دوسری جگہ اس ذمہ داری کو مزید موکد کرنے کی غرض سے ارشاد فرمایا:

”وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللَّهِ“۔ (البقرہ: ۱۴۰)

(اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جس کے پاس اللہ کی طرف سے ایک گواہی ہو اور وہ

اسے چھپائے)

ذمہ داری کی عدم ادائیگی کی صورت میں یہودیوں کے انجام کو بیان کر کے نتیجے کی طرف اشارہ کر دیا گیا کہ یہودی بھی حق کی گواہی کے ذمہ دار بنائے گئے تھے مگر انہوں نے کچھ تو حق کو چھپایا اور کچھ حق کے خلاف گواہی دی اور یہی نہیں بلکہ وہ باطل کے گواہ بن کر رہ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے انہیں دھتکار دیا اور ان پر زبردست پھٹکار پڑی:

”وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ“۔ (البقرہ: ۶۱)

(اور ذلت اور محتاجی ان سے چمٹادی گئی اور وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہو گئے۔)

## شہادت حق سے مراد:

مسلمانوں پر جس شہادت حق کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ جو حق مسلمانوں کے پاس آیا ہے، جو صداقت ان پر منکشف کی گئی ہے اور انسان کے لیے فلاح و نجات کی جو راہ ہے اور وہ صرف ایک راہ ہے جو مسلمانوں کو دکھائی گئی ہے، مسلمان دنیا کے سامنے اس کے حق اور صداقت ہونے پر اور اس راہ کے راست ہونے پر گواہی دیں۔ ایسی گواہی جو اس کے حق اور صادق ہونے کو مبرا بن کر دے اور دنیا کے لوگوں پر دین کی حجت پوری کر دے۔ اسی شہادت کے لیے انبیاء علیہم السلام دنیا میں بھیجے گئے اور اس کا ادا کرنا ان پر فرض تھا۔ پھر یہی شہادت تمام انبیاء کے بعد ان کی امتوں پر فرض ہوتی رہی۔ اور اب خاتم النبیین کے بعد یہ فرض امت مسلمہ پر بحیثیت مجموعی اسی طرح عائد ہوتا ہے جس طرح حضور ﷺ پر آپ کی زندگی میں شخصی حیثیت سے عائد تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ غیر مسلم معاشرہ میں قولی و فعلی دونوں طریقوں سے شہادت حق اور تبلیغ دین مسلمانوں کا عین مقصد وجود ہے۔ ان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے حسن انتظام سے، اپنے امن کے اصولوں سے، معاشرتی فلاح و بہبودگی سے، حقوق انسانی کے تئیں بیداری سے اور ملکی قوانین کے تئیں اپنی وفاداری سے اس بات کی شہادت دیں کہ ہم جس دین کے پیروکار ہیں اور جس حق کو لوگوں تک پہنچانے کے ذمہ دار ہیں، وہ درحقیقت انسانی فلاح کا ضامن ہے اور اسی کی پیروی میں نوع انسانی کی بھلائی کا راز مضمر ہے۔

## دعوت حق سے صرف نظر کا خمیازہ:

جب ہم شہادت حق کی ذمہ داری میں کوتاہی کرنے لگے اور اپنے عمل سے باطل کی شہادت دینے لگے اور ہمارے قدم باطل کی طرف برق رفتاری سے بڑھنے لگے، اسی رفتار سے ہم گرتے چلے گئے، پچھلی دو تین صدی کا اگر جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ بہت سے ایسے ممالک اور ایسے علاقے جہاں مسلمانوں کی حکومت تھی اور جہاں خدائی دستور تھا، مسلمانوں کے غلط طرز عمل، کج روی اور ذمہ داری کے تئیں بے حسی کی وجہ سے وہ ممالک مسلمانوں کے قبضہ سے نکل گئے اور غیروں کے زیر اثر آ گئے۔ مراکش سے لے کر شرق الہند تک، ملک کے ملک ہمارے ہاتھوں سے نکل گئے، مسلمان قومیں حاکم کے بجائے محکوم اور غالب کے بجائے مغلوب ہوتی چلی گئیں، مسلمانوں کا نام جو باعث افتخار سمجھا جاتا تھا ذلت و رسوائی اور پس ماندگی کا

نشان بن گیا، جہاں مسلمانوں کی اپنی حکومتیں باقی رہ گئیں وہاں بھی انھوں نے شکستوں پر شکستیں کھائیں اور آج ان کا یہ حال ہے کہ وہ بااختیار حکومت نہیں چلا سکتے بلکہ غیر اقوام اور غیر ممالک کا عمل دخل ہے، افغانستان اور عراق اس کی تازہ ترین مثال ہیں۔

### تحقیر کی وجہ:

مسلمانوں کی عزت و آبرو کو مٹائے جانے اور ان کو ذلت و مسکنت کا نشانہ بنائے جانے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے شہادت حق سے انحراف اور شہادت زور کو اختیار کیا جو کہ خدا کے نزدیک جرم عظیم ہے جس کی سزا مسلمانوں کو انحطاط و تنزلی کی شکل میں مل رہی ہے۔ جب تک مسلمان حق کے گواہ ہونے کی حیثیت سے اپنا فرض اور اپنی دینی ذمہ داری ادا نہیں کرتے اس وقت تک دنیا میں جو گمراہی پھیلے گی، جو ظلم و فساد اور سرکشی برپا ہوگی، جو بد اخلاقیوں اور بد کرداریاں رواج پائیں گی، ان کی جواب دہی سے مسلمان بری نہیں ہو سکتے۔ اگر وہ ان برائیوں کے پیدا کرنے کے ذمہ دار نہیں ہیں تو ان کی پیدائش کے اسباب باقی رکھنے اور انہیں پھیلنے کی اجازت دینے کے ذمہ دار ضرور ہیں۔

ان تمام تفصیلات سے یہ واضح ہوا کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں غیر مسلم معاشرہ میں کیا کرنا چاہیے تھا اور ہم کیا کر رہے ہیں اور جو کچھ کر رہے ہیں اس کا کیا خمیازہ بھگت رہے ہیں؟ اس پہلو سے اگر آپ حقیقت معاملہ پر نگاہ ڈالیں تو یہ بات خود ہی منکشف ہو جائے گی کہ مسلمانوں نے غیر مسلم معاشرہ میں جن مسائل کو اپنے لیے اصل مسائل سمجھ رکھا ہے اور جنہیں حل کرنے کے لیے وہ کچھ اپنے ذہن سے گھڑی ہوئی اور کچھ دوسروں سے سیکھی ہوئی تدبیروں پر ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں، دراصل ان میں سے کوئی بھی ان کا اصل مسئلہ نہیں ہے اور اس کے حل کی تدبیریں وقت، قوت اور مال کا سارا صرفہ صرف ایک زیاں کاری ہے۔ یہ سوالات کہ مسلمان اقلیت غالب اکثریت کے درمیان رہتے ہوئے اپنے وجود اور حقوق کو کیسے محفوظ رکھے اور ایک پس ماندہ قوم وہ ترقی و خوش حالی اور طاقت کیسے حاصل کرے جو دنیا کی طاقتور قوموں کو حاصل ہے۔ یہ تمام مسائل مسلمانوں کے لیے مستقل مسائل نہیں ہیں یہ ہماری غفلت کے نتیجے میں ہیں جو ہم اپنے اصل کام اور اصل ذمہ داری (شہادت حق) سے برتتے رہے ہیں اور آج تک برتے جا رہے ہیں۔ اگر ہم نے اپنی ذمہ داری ادا کی ہوتی تو آج اتنے بہت سے پیچیدہ اور پریشان کن مسائل ہمارے لیے پیدا ہی نہ ہوتے اور ہماری تحقیر و تذلیل نہ ہو رہی ہوتی۔

اگر ہم مسائل میں الجھنے کے بجائے ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی طرف اپنی توجہ اور سعی مبذول کریں تو یہ مسائل خود بخود ختم ہو جائیں گے جو کہ ایک گھنے جنگل کی شکل میں چاروں جانب سے ہمیں گھیرے ہیں، جن کی صفائی اور اصلاح کے ذمہ دار ہم خود تھے۔ ہم نے اپنا فرض منصبی ادا کرنا چھوڑا تو دنیا خاردار جنگلوں سے بھر گئی اور ان کا سب سے زیادہ پر خار حصہ مسلمانوں کے نصیب میں لکھا گیا۔

**مشکل حالات میں مسلمانوں کا مطلوب طرز عمل:**

حقیقت یہ ہے کہ یہ ہمارے مسائل خود ہمارے اعمال اور ذمہ داریوں سے بھاگنے کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں۔ دنیا میں ہماری حیثیت اسلام کے نمائندے کی ہے، اگر مسلمان اس کی صحیح پیروی کریں، اپنے قول و عمل سے اس کی سچی شہادت اور اجتماعی و انفرادی زندگی میں اس کا ٹھیک ٹھیک مظاہرہ کرنے لگے، تو دنیا میں بھی سر بلند ہوں گے اور آخرت میں بھی انھیں سرخروئی عطا ہوگی۔ خوف اور حزن، ذلت و مسکنت، مغلوبی و محکومی کے یہ سیاہ بادل جو مسلمانوں پر چھائے ہوئے ہیں یہ چھٹ جائیں گے۔ ان کی دعوت حق اور سیرت صالحہ غیروں کے دلوں اور دماغوں کو مسخر کرتی چلی جائے گی، ان کی ساکھ اور دھاک دنیا پر بیٹھتی چلی جائے گی، انصاف کی امیدیں ان سے کی جائیں گی، ان کی امانت و دیانت پر بھروسہ کیا جائے گا، بھلائی کی توقعات قائم کی جائیں گی، اسلام مخالف طاقتیں ٹوٹ ٹوٹ کر اسلامی کیمپ میں نظر آئیں گی اور ہر جگہ اسلامی پرچم ہی نظر آئے گا۔ یہ مستقبل تو ہمارا اس صورت میں ہے جب ہم اسلام کے مخلص اور سچے گواہ ہوں، لیکن اس کے برعکس اگر ہمارا رویہ یہ رہا کہ ہم غیر مسلم معاشرہ میں تہذیبی طور پر خلط ملط ہو گئے، خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت پر سانپ بن کر بیٹھے ہیں نہ خود اس سے مستفید ہوتے ہیں اور نہ دوسروں کو اس کا فائدہ پہنچنے دیتے ہیں۔ اپنے آپ کو مسلمان کہہ کر اسلام کے نمائندے تو بنے ہوئے ہیں مگر اپنے مجموعی قول و عمل سے شہادت زیادہ تر جاہلیت، شرک، دنیا پرستی اور اخلاقی بے راہ روی کی دے رہے ہیں، دعویٰ خدا کی بندگی کا کرتے ہیں اور بندگی شیطان کی کر رہے ہیں اور اپنی زندگی کو اسلام کی برکتوں سے محروم کر رکھا ہے اور دنیا کو اس کی طرف راغب کرنے کے بجائے الٹا متنفر کر رہے ہیں تو اس صورت میں نہ دنیا درست ہو سکتی ہے اور نہ آخرت سنور سکتی ہے بلکہ اس کا انجام وہی ہے جو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

## مقصد کے تئیں آگہی

ہمیں اس حقیقت کا ادراک ہمیشہ رہنا چاہیے کہ ہم کس غرض کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ ہماری یہ دینی ذمہ داری ہے کہ ہم ان لوگوں کو جو اسلام کو اپنا دین مانتے ہیں، یہ دعوت دیں کہ وہ اس دین کو واقعی اپنا دین بنائیں، انفرادی طور پر اپنی زندگیوں میں اور اجتماعی طور پر اپنے گھروں میں، اپنے خاندان میں، اپنی سوسائٹی میں، اپنی تعلیم گاہوں میں، اپنے کاروبار میں اور اپنے قول و عمل میں اسلامی صداقت پیدا کریں اور سچی گواہی دیں کہ اسلام ایک برحق مذہب ہے اور اس کے اصول و قوانین انسانیت کے فلاح و نجات کے لیے بنائے گئے ہیں۔ ہماری یہ بھی ذمہ داری ہے کہ ہم یہ شعور بیدار کریں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے اقامت دین اور شہادت حق ہماری زندگی کا اصل مقصد ہے اس لیے ہماری تمام سعی و عمل کا مرکز و محور اسی چیز کو ہونا چاہیے، ہماری تمام تر کوشش اس بات میں صرف ہونی چاہیے کہ دین پورا کا پورا عملاً قائم ہو جائے اور غیروں کے دلوں کو مسخر کرتا چلا جائے اور اس کی طرف دنیا کو ایسی دعوت دی جائے جو تمام حجت کے لیے کافی ہو۔ چونکہ دین کا ایک قلیل حصہ انفرادی زندگی سے تعلق رکھتا ہے، اس لیے اجتماعی سعی سے ہی دین مکمل ہوگا اور اس کی شہادت پوری ہوگی لہذا مسلمان متحد و منظم ہو جائیں، دین کو عملاً قائم کرنے اور دنیا کو اس کی طرف دعوت دینے کی کوشش کریں اور ان مزاحمتوں اور رکاوٹوں کو راستے سے ہٹائیں جو اقامت دین اور شہادت حق کی ادائیگی کی راہ میں حائل ہوں۔

ماقبل کی تفصیلات سے یہ معلوم ہوا کہ غیر مسلم معاشرہ میں مسلمانوں کی یہ بنیادی دینی ذمہ داری ہے کہ وہ اقامت دین اور شہادت حق کی ذمہ داری ادا کریں اور اس کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ وہ خود دین کو اپنے اندر قائم کریں اور قولی و عملی دونوں طریقوں سے اس دین کے حق ہونے کی شہادت دیں اور لوگوں کو دین کی دعوت دیں، وہیں دوسری طرف کچھ خارجی امور ایسے ہیں جن کا لحاظ کیا جانا شہادت حق اور اقامت دین میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

### داعیانہ اوصاف:

ایک سچے اور داعی مسلمان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ جس معاشرہ میں رہتا ہے وہاں یہ جاننا لازمی ہے کہ اس کے پڑوس میں جو لوگ رہتے ہیں ان کے مذہبی عقائد کیا ہیں، تہذیبی روایات کیا ہیں، اصول حیات کیا ہیں اور ان کی پسند و ناپسند کے معیارات کیا ہیں، یہ واقفیت ان سے بہتر تعلقات پیدا

کرنے میں، اچھا سلوک کرنے میں اور اپنی بات کو ان تک پہنچانے میں معاون و مددگار ثابت ہوتی ہے اور اعتماد و اخلاق کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے تمام انبیاء کرام کو اللہ نے جس قوم کی طرف بھیجا ان کی زبان سے واقف کرایا اور ان کے عقیدہ اور تہذیبی اصولوں سے واقف کرایا۔ قرآن کریم میں مختلف قوموں اور ان کے عقیدوں کے جو تذکرے ملتے ہیں اس کا پس منظر یہی ہے مثلاً مشرکین، صابین، یہود اور انصاری سے مذہبی عقائد اور تہذیبی شعائر کا تذکرہ ملتا ہے۔

دوسرے مذاہب کے عقائد اور تہذیبی شعائر سے واقفیت کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے عقیدہ اور تہذیب سے ان کو واقف کرایا جائے اور حکمت و دل سوزی کے ساتھ شہادت حق اور دعوت دین کا فریضہ انجام دیا جائے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

”ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ“۔ (النحل: ۱۲۵)

(اے نبی، اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت و حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ بلاؤ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو تمہارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہ راست پر ہے)

شہادت حق میں اس بات کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے کہ اپنے مذہب اور تہذیب کو غیروں پر تھوپا نہ جائے بلکہ فکر و نظر کی آزادی اور تسلیم و انکار کا اختیار باقی رکھا جائے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

”وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَأَمَنَّ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلَّهُمْ جَمِيعًا أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ. وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تُؤْمِنَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَيَجْعَلُ الرَّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ“۔ (یونس: ۹۹-۱۰۰)

(اگر تیرے رب کی مشیت یہ ہوتی (کہ زمین میں سب مومن اور فرماں بردار ہی ہوں) تو سارے اہل زمین ایمان لے آئے ہوتے۔ پھر کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن ہو جائیں۔ کوئی تنفس اللہ کے اذن کے بغیر ایمان نہیں لاسکتا۔ اور اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے وہ ان پر گندگی ڈال دیتا ہے)

اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کو خواہ وہ کسی عقیدہ، تہذیب، رنگ یا نسل سے تعلق رکھتا ہو محترم بنایا ہے لہذا مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ انسانی احترام کو ہر حال میں ملحوظ رکھیں اور حرمت کو پامال نہ ہونے

دیں جب ہی وہ اپنے لیے ماحول سازگار بنا سکتے ہیں اور اپنا فرض منصبی (شہادت حق) ادا کر سکتے ہیں۔  
قرآن کریم میں اللہ ارشاد فرماتا ہے:

”وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا“۔ (بنی اسرائیل: ۷۰)

(یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انہیں خشکی و تری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فوقیت بخشی۔)

دین کی دعوت دینے اور شہادت حق کی ادائیگی میں اس بات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ اپنے دین کی برتری کو ثابت کرنے کے لیے دوسرے مذاہب اور ان کے مذہبی رہنماؤں کی تحقیر نہ کی جائے، کیوں کہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ غیر قومیں بھی جواباً اس طرح کا انداز اختیار کر کے اللہ کو گالی دینے کا سنگین جرم کر بیٹھیں۔ اس لیے اس طرح کی منفی حرکتوں سے اجتناب ضروری ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

”وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذَلِكَ زَيْنًا لِّكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلُهُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ مَرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ“۔ (الانعام: ۱۰۸)

(اے مسلمانوں! یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انہیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ (یہ شرک سے آگے بڑھ کر) جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔ ہم نے تو اسی طرح ہر گروہ کے لیے اس کے عمل کو خوشنما بنا دیا ہے پھر انہیں اپنے رب کی طرف ہی پلٹ کر آنا ہے، اس وقت وہ انہیں بتا دے گا کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں۔)

قرآن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہدایت دیتا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ اچھی زبان، شیریں کلام اور معقول رویہ اختیار کیا جائے اور دل نشیں لب و لہجہ میں بات کی جائے، زبان و بیان کی جراحت سے حتی الامکان گریز کیا جائے کیوں کہ زبان کی کوتاہی اور بدکلامی کے ذریعہ شیطان خوشگوار سماجی تعلقات کو ناخوشگوار اور دشمنی میں بدل دیتا ہے ایسی صورت میں شہادت حق کی ادائیگی کی راہ دشوار ہو سکتی ہے۔ اللہ ارشاد فرماتا ہے:

”وَقُلْ لِّعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنْزِعُ بَيْنَهُمْ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِينًا“۔ (بنی اسرائیل: ۵۳)

(اور اے نبی میرے بندوں (یعنی مومن بندوں) سے کہہ دو زبان سے وہ بات نکالا کریں جو

بہترین ہو۔ دراصل یہ شیطان ہے جو انسان کے درمیان فساد ڈلوانے کی کوشش کرتا ہے  
حقیقت یہ ہے کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔)

غیر مسلموں کو اپنا ہم خیال اور ہم نوا بنانے اور اپنی باتوں سے متاثر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ  
ان کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ کیا جائے تاکہ دین حق کی صداقت و عدالت پر دلیل کامل قائم ہو۔  
اللہ ارشاد فرماتا ہے:

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ  
عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اْعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا  
تَعْمَلُونَ“۔ (المائدہ: ۸)

(اے لوگوں جو ایمان لائے ہو اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی  
دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اس بات پر مشتعل نہ کر دے کہ تم انصاف سے پھر جاؤ،  
عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، جو کچھ تم  
کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔)

غیر مسلم معاشرہ میں اقامت دین اور شہادت حق کے سلسلے میں مسلمانوں کو بہت سی پریشانیوں اور  
تکالیف کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ یوں تو اسلام نے بدلہ لینے کا فطری حق ہر انسان کو دیا ہے مگر خدا ترس  
مومن کو صبر و تحمل سے کام لینے اور ایذا رسانیوں کو برداشت کرنے کی تلقین بھی کی ہے۔ قرآن کہتا ہے:

”لَتُبْلَوْنَ فِيْ أَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ  
وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيْرًا وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزْمِ  
الْأُمُوْر“۔ (آل عمران: ۱۸۶)

(مسلمانوں، تمہیں مال و جان کی آزمائشیں پیش آکر رہیں گی اور تم اہل کتاب اور مشرکین  
سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے اگر تم ان حالات میں صبر اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہو  
تو یہ بڑے حوصلہ کا کام ہے۔)

قرآن پاک میں برائی کا بدلہ برائی سے دینے کے بجائے بھلائی سے دینے کی تلقین کی گئی ہے اور  
سماجی اور نفسیاتی نکتہ مسلمانوں کے گوش گزار کیا گیا ہے کہ اگر برائی کا بدلہ برائی سے دو گے تو مقابل کی  
مخالفت میں شدت پیدا کرو گے مگر اس کا دل نہ جیت سکو گے اور اگر برائی کا بدلہ بھلائی سے دو گے تو لوگوں



کے دلوں میں اپنے لیے جگہ بناؤ گے، ان کا دل جیت سکو گے جو کہ دعوت اور شہادت حق کی راہ میں بہت ہی مددگار ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

”وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ. وَمَا يُلْقَاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلْقَاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ“۔ (حم سجدہ: ۳۴-۳۵)

(اور اے نبیؐ نیکی اور بدی یکساں نہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو تو دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت بڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔ یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں، اور مقام حاصل نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیب والے ہیں۔)

اسی طرح ایک داعی کے لیے یہ بھی مناسب بلکہ ضروری ہے کہ تمام انسانوں کے ساتھ محبت و شفقت کا معاملہ رکھے کیوں کہ یہی رویہ رسول کریم ﷺ کا تھا اور اسی کی تعلیم آپ نے اپنی امت کو دی اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

”فِيمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لَنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَا نَفَعُوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ“۔ (آل عمران: ۱۵۹)

((اے پیغمبر) اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے نرم مزاج واقع ہوئے ہو ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سخت دل واقع ہوتے تو یہ سب گرد و پیش سے چھٹ جاتے، ان کے قصور معاف کر دو، ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو اور دین کے کام میں بھی ان کو شریک کرو، پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ رکھو، اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اسی کے بھروسے سے کام کرتے ہیں۔)

یہ وہ اوصاف ہیں جن سے متصف ہونا ایک داعی مسلمان کے لیے ضروری ہے جو غیر مسلم معاشرہ میں اقامت دین اور شہادت حق کی ذمہ داری ادا کرنا چاہتا ہو، جو اپنی دعوت کو مؤثر بنانا چاہتا ہو اور جو یہ چاہتا ہو کہ تمام انسان معبودان باطل کی غلامی کی زنجیر سے نجات پا کر ایک اللہ رب العزت کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیں۔

## تعلیمی نظام:

عصر حاضر میں دعوت و تبلیغ کے فرائض انجام دینے کے لیے تعلیم کے زیور سے آراستہ ہونا اشد ضروری ہے۔ تعلیم سے مراد صرف دینی تعلیم کو نہ لیا جائے کیونکہ عصری تقاضوں کو جانے بغیر ہم دوسروں تک دین نہیں پہنچا سکتے، اس لیے عصری تعلیم بھی مقصد کے لحاظ سے نہایت ضروری ہے۔ مسلم سماج کی یہ بہت بڑی کمزوری ہے جو طبقہ عصری تعلیم گاہوں کی طرف رجوع کرتا ہے وہ دینی تعلیم سے بالکل نابلد رہتا ہے اور جو دینی تعلیم کی طرف رجوع کرتا ہے وہ عصری درس گاہوں کی طرف دیکھنا بھی مناسب نہیں سمجھتا ہے۔ چونکہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ عصری درس گاہوں کی طرف جاتا ہے اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان ایسے ادارے کھولیں جہاں کی درسیات میں عصری اور اسلامی تعلیم کا حسین امتزاج ہو، دوسری طرف یہ بھی ضروری ہے کہ مدارس اسلامیہ میں حالات حاضرہ سے ہم آہنگ مضامین کی طرف ارباب حل و عقد توجہ کریں تاکہ فارغین مدرسہ زمانے کے قدم سے قدم ملا کر چل سکیں اور ان تک ان کی زبان میں دین پہنچا سکیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ دینی اور عصری علوم کے حامل افراد علیحدہ علیحدہ خانوں میں بٹ گئے ہیں۔ روایتی علماء جدید تعلیم سے نا آشنا ہیں اور عصری تعلیم یافتہ طبقہ دینی علم سے یکسر غافل ہے۔ جس کا بڑا نتیجہ یہ نکلا کہ اس معاشرہ میں جہاں مسلمان تعداد کے اعتبار سے کم ہیں وہاں عصری اور دینی تفریق کی وجہ سے وہ اور کم اور کمزور ہو گئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ غیر مسلم معاشرہ میں مسلمانوں کی یہ بنیادی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر طرح کے علوم و فنون سے اپنے آپ کو آراستہ کریں اور ان کو مخلوق خدا کی رہنمائی اور راستہ دکھانے کا ذریعہ بنائیں۔

## مؤثر میڈیا کا قیام:

جیسا کہ ماقبل میں عرض کیا جا چکا ہے کہ امت مسلمہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ جو روشنی ان تک ہدایت ایمان کی شکل میں پہنچی ہے اس کو اپنی ذات تک محدود نہ رکھیں بلکہ پورے عالم کو اس سے منور کرنے کی کوشش کریں۔ خاص طور پر جب غیر مسلم معاشرہ میں رہائش پذیر ہوں تو اپنے افعال و کردار اور اخلاق کے ذریعہ دین اسلام کی تبلیغ کریں۔ اب سوال یہ ہے کہ حق کی ترویج و اشاعت کے لیے محدود وسائل پر ہی قناعت کرنی چاہیے یا پھر تمام اسباب و وسائل جو اس راہ میں مؤثر ثابت ہو سکتے ہیں ان کو اختیار کر کے یہ فریضہ انجام دینا چاہیے۔ اگر ہم عصر حاضر میں میڈیا کی بات کریں، خواہ وہ پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک

میڈیا، تو کیا ان کے ذریعہ ہم دعوت و تبلیغ کا کام کر سکتے ہیں، جب کہ عصر حاضر میں میڈیا لوگوں کی اہم ضرورت ہے، گھر گھر تک اس کی رسائی ہے اور یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ معاشرہ اور سوسائٹی میں فحاشی اور عریانی کے فروغ کی ایک بڑی وجہ میڈیا بھی ہے۔ ان سوالات کا جواب اس طرح دیا جاسکتا ہے کہ یہ بات بلاشبہ درست ہے کہ میڈیا منکرات کے فروغ کا بڑا ذریعہ ہے تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے اس کے اندر مثبت پہلو بھی ہے۔ اگر ہم بجائے اس کے کہ اس سلسلہ میں دوسروں پر اعتبار کریں مسلمانوں کے اپنے اخبارات ہونے چاہیے جو کسی ایک زبان میں محدود نہ ہوں بلکہ اس سوسائٹی اور معاشرے میں رائج تمام زبانوں میں ہوں تاکہ ان کی افادیت عام ہو اور ان کو خبر نویسی کے ساتھ ساتھ حق کی ترسیل کا ذریعہ بنایا جاسکے۔ اسی طرح اپنے T.V چینلز ہوں جو شرور و فتن سے مبرا ہوں اور فحاشی اور عریانی سے پاک ہوں اور جن کے قیام کا مقصد صرف اور صرف دعوت اسلام ہو کیونکہ اسلام میں نیت پر ہی اعمال موقوف ہیں۔ لہذا حالات حاضرہ کی ضرورت اور میڈیا کی افادیت کو محسوس کرتے ہوئے ارباب حل و عقد اور علماء دین کو اس سلسلے میں مثبت پہل کرنی چاہیے۔ تاکہ اسلام گھر گھر تک پہنچ سکے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دینی ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے موثر میڈیا کا قیام ایک کارگر نسخہ ہے۔ ۵۰

### اجتماعی اجتہاد:

غیر مسلم معاشروں میں مسلمانوں کو بہت سارے ایسے حالات پیش آتے ہیں جن کا شرعی حکم معلوم کرنا ان کے لیے مشکل ہوتا ہے ایسی صورت میں ان کی یہ دینی ذمہ داری ہے کہ وہ اجتماعی اجتہاد سے کام لیں، اس اجتماعی اجتہاد کے ذریعہ وہ فقہ الاقلیات سے کام لے سکیں گے۔ ۵۱

اجتہاد کے بارے میں اب عام طور پر علماء بھی آواز اٹھانے لگے ہیں۔ فقہ الاقلیات یوں تو اکثریتی ملکوں کی بھی ضرورت ہے لیکن اقلیت میں ہونے کے باعث غیر مسلم معاشروں کے مسلمانوں کی ذمہ داری مزید بڑھ جاتی ہے۔ عام علماء میں اس کے تعلق سے منفی رجحان پایا جاتا ہے، مگر بعض بڑے علماء اس بارے میں مثبت رجحان رکھتے ہیں۔ مثلاً مولانا منت اللہ رحمانی لکھتے ہیں: ”شرعی اصولوں کو سامنے رکھ کر مسائل کا استخراج کرنا ہوگا اور باتوں کا جواب دینا ہوگا..... اس مشکل کا یہ حل کہ فقہاء اسلام کی مدونہ فقہ ہر مسلمان کے لیے عام کردی جائے اور جس مسئلہ میں جو نسی فقہ مشکل کو حل کرتی ہو اسے اختیار کیا جائے۔ ہمارے خیال میں اس طریقہ کار سے ہماری دقتیں حل نہ ہوں گی۔ آج بھی ایسے مسائل ہیں جن میں تمام فقہاء کی



## اخلاقی ذمہ داریاں

### اقوام عالم کی اخلاقی صورت حال:

معمولی حالات میں جب کہ زندگی کا دریا سکون کے ساتھ بہہ رہا ہو، انسان ایک طرح کا اطمینان محسوس کرتا ہے، کیوں کہ اوپر کی صاف شفاف سطح ایک پردہ بن جاتی ہے جس کے نیچے تہ میں بیٹھی ہوئی گندگیاں اور غلاظتیں چھپی رہتی ہیں اور پردے کی اوپری صفائی آدمی کو اس کا تجسس کرنے کی ضرورت کم ہی محسوس ہونے دیتی ہے کہ تہ میں کیا چھپا ہوا ہے، لیکن جب دریا میں طوفان برپا ہوتا ہے اور اس میں طغیانی آتی ہے تو اس کی ساری گندگیاں اور غلاظتیں ابھر کر سطح دریا پر بہنے لگتی ہیں اور پھر ہر بینا شخص صاف دیکھ لیتا ہے کہ زندگی کا دریا غلاظتوں سے کس قدر پُر تھا اور یہی وقت ہوتا ہے جب عام انسانوں میں اس بات کو جاننے کا تجسس پیدا ہوتا ہے کہ اس منبع کا سراغ لگائیں جہاں سے یہ گندگیاں آرہی ہیں اور اس تدبیر کی جستجو کریں کہ کس طرح اس دریا کو پاک کریں۔ فی الواقع اگر گندگیوں کا ادراک ہو جانے کے بعد بھی انسانوں کے اندر صفائی اور پاکیزگی کی ضرورت کا احساس بیدار نہ ہو تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ نوع انسانی اپنی غفلت کے نشے میں مدہوش ہو کر نفع و نقصان سے بے فکر اور غافل ہو چکی ہے۔

یہ زمانہ جس سے ہم آج کل گزر رہے ہیں انہی غیر معمولی حالات کا زمانہ ہے۔ زندگی کا دریا اس وقت طغیانی پر ہے، ملک ملک اور قوم قوم کے درمیان سخت کشمکش برپا ہے اور یہ کشمکش اتنی گہرائی تک ہے کہ نہ صرف افراد کی جمعیت کو بلکہ فرد فرد کو میدان کارزار میں کھینچ لاتی ہے۔ اس طرح اقوام عالم نے اپنے وہ تمام اخلاقی اوصاف اُگل کر منظر عام پر رکھ دیے ہیں جو کچھ مدتوں تک ان کے باطن میں پرورش پا رہے تھے۔

یہ مشاہدہ ہے کہ پوری پوری قومیں بہت بڑے پیمانے پر ان بدترین اخلاقی صفات کا مظاہرہ کر رہی ہیں جن کو ہمیشہ سے انسانیت نے انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ بے انصافی، بے رحمی، ظلم و ستم، جھوٹ، دغا، فریب، مکر، بدعہدی، خیانت، بے شرمی، نفس پرستی، استحصال، قتل و غارت گری اور دوسرے ایسے ہی جرائم محض انفرادی جرائم نہیں رہے ہیں بلکہ قومی اخلاق کی حیثیت سے ظاہر ہو رہے ہیں۔ دنیا کی بڑی بڑی قومیں اجتماعی حیثیت سے وہ سب کچھ کر رہی ہیں جس کا ارتکاب کرنے والے افراد سزا

کے مستحق ہوتے ہیں۔ قریب قریب تمام قوموں کا حال یہ ہے کہ ان کے یہاں لینے اور دینے کے پیمانے مختلف ہیں اور جتنے معیار وہ اپنے مفاد کے لیے قائم کرتی ہیں، دوسروں کا مفاد سامنے آتے ہی وہ سب معیار بدل جاتے ہیں، اور جن معیاروں کا مطالبہ وہ دوسروں سے کرتی ہیں ان کی پابندی خود کرنا حرام سمجھتی ہیں، بدعہدی کا مرض اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ ایک قوم کو دوسری قوم پر کوئی اعتماد نہیں رہا۔ مکاری کا حال یہ ہے کہ بڑے بڑے پاکیزہ اخلاقی اصولوں کی گفتگو کی جاتی ہے صرف اس لیے کہ دنیا کو بے وقوف بنا کر اپنے مفاد کو حاصل کیا جائے اور سادہ لوح انسانوں کو یقین دلایا جائے تم سے جان و مال کی قربانی کا مطالبہ جو ہم کر رہے ہیں یہ کچھ اپنے لیے نہیں ہے بلکہ ہم بے غرض یہ ساری تکلیفیں محض انسانیت کی بھلائی کے لیے برداشت کر رہے ہیں۔ سنگ دلی و بے رحمی اس درجے کو پہنچ چکی ہے کہ ایک ملک جب دوسرے ملک پر حملہ آور ہوتا ہے تو اس کی آبادی، معصوموں، کمزوروں اور عورتوں کو اپنے ظلم و بربریت کا نشانہ بنانے میں کوئی عار اور شرم محسوس نہیں کرتا اور مزے لے لے کر دنیا کو اپنے ان کارناموں کی اطلاع دیتا ہے۔ خود غرضانہ شقاوت اس انتہا کو پہنچ چکی ہے کہ ایک قوم دوسری قوم پر فتح حاصل کرنے کے بعد صرف اسی پر بس نہیں کرتی بلکہ یہ ایک منظم طریقے سے اسے لوٹتی اور کھسٹتی ہے اور انسانیت کی تمام حدوں کو توڑ کر اس کے ساتھ وحشیانہ سلوک کرنے کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتی ہے۔

یہ چند اخلاقی خرابیاں ہیں جن سے اقوام عالم متاثر ہیں اور جو ان کے اندر گھر کیے ہوتی ہیں، اگر تفصیل سے تمام خرابیوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پوری انسانیت کا جسم اخلاقی حیثیت سے سڑ گیا ہے۔ پہلے صرف قبحہ خانے اور قمار بازی کے اڈے اخلاقی پستی کے اڈے سمجھے جاتے تھے، لیکن اب انسانی تمدن پورا کا پورا ہی ایک پھوڑا نظر آتا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ صفات جو انسان کی بہترین اخلاقی صفات سمجھی جاتی تھیں، مثلاً شجاعت، ایثار، قربانی، فیاضی، صبر و تحمل، اولوالعزمی، بلند حوصلگی وغیرہ۔ آج ان کو بھی چند بڑی اور بنیادی بداخلاقیوں کا خادم بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اجتماعی خرابیاں اس وقت ابھر کر نمایاں ہوتی ہیں جب انفرادی خرابیاں پایہ تکمیل کو پہنچ چکی ہوتی ہیں، اس چیز کا تصور قطعی نہیں کیا جاسکتا کہ کسی معاشرہ کے بیش تر افراد نیک کردار کے ہوں اور وہ معاشرہ بحیثیت مجموعی بدکردار اور بداخلاقی کا مظاہرہ کرے۔ یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ نیک کردار کے لوگ اپنی قیادت اور نمائندگی بد اخلاق لوگوں کے ہاتھ میں دے دیں اور اس بات پر راضی ہو جائیں کہ

ان کے قومی، ملکی اور بین الاقوامی معاملات کو غیر اخلاقی اصولوں پر چلایا جائے۔ حالات اس بات کی نشان دہی کر رہے ہیں کہ سربراہی اور نمائندگی بد اخلاق لوگوں کے ذریعہ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ہو رہی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ آج نوع انسانی اپنی تمام علمی و تمدنی ترقیوں کے باوجود ایک شدید اخلاقی متزلزل میں مبتلا ہے اور اس کے بیش تر افراد اس سے متاثر ہو چکے ہیں۔ یہ حالت اگر یوں ہی ترقی کرتی رہی تو وہ وقت دور نہیں جب انسانیت کسی بڑی تباہی سے دوچار ہوگی اور ایک طویل عہد ظلمت اس پر چھا جائے گی۔

### اخلاق انسانی زندگی کی اہم ضرورت:

اخلاق کو انسانی زندگی میں جو اہمیت حاصل ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ تاریخ میں کسی ایسی قوم کی مثال نہیں ملتی جس میں نیکی و بدی کا سرے سے کوئی تصور نہ پایا جاتا رہا ہو۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ سچائی، خیر پسندی اور دیانت داری انسان کی مطلوب صفات ہیں۔ انسانی ضمیر کے لیے یہ کبھی ممکن نہیں ہو سکتا کہ وہ ایفائے عہد کے مقابلہ میں مکر و فریب کو، ایثار و قربانی کے مقابلہ میں خود غرضی کو اور جذبہ اخوت و ہمدردی کے مقابلہ میں بغض و حسد اور ظلم و ستم کو بہتر سمجھنے لگے۔

انسانوں سے کسی خاص قسم کے اخلاق کے مطالبہ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم انسان کو صاحب اختیار و ارادہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے جہاں کوئی ارادہ و اختیار نہ پایا جاتا ہو وہاں کسی اخلاق و کردار کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اخلاق کا تعلق انسان کے ارادہ و اختیار سے ہے۔ انسان کو دنیا میں ارادہ و اختیار کی آزادی حاصل ہے اس لیے اس کا ایک اخلاقی وجود ہے۔ یہی چیز ہے جو اسے عام حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔ اخلاقی اقدار کا حصول انسان کی بنیادی ضرورت ہے، اخلاق انسان کے لیے کوئی ناخوشگوار بوجھ ہرگز نہیں ہے۔ رنگ و بو پھولوں پر بوجھ نہیں و پرندوں کے پر پرندوں پر بوجھ نہیں بلکہ یہ پر پرندوں کے لیے باعث زینت بھی ہیں اور پرواز میں ان کے مددگار بھی۔ یہی حال پھولوں کے رنگ و بو اور آنکھوں کی پلکوں کا بھی ہے۔ انسانی زندگی میں بھی حقیقی حسن و خوبی اخلاق ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اخلاق سے عاری ہو جانے کے بعد انسان کے پاس کوئی قابل قدر شئی باقی نہیں رہتی۔ اخلاقی مطالبات ہماری فطرت کے اظہار کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں۔

اخلاق درحقیقت ایک عالمگیر اور آفاقی اصول کا نام ہے۔ وہی ہماری باطنی زندگی کا بھی قانون ہے۔ اخلاق ہی ہے جس کے ذریعہ انسان کی اندرونی زندگی میں توازن اور اس کی انفرادی و اجتماعی زندگی

میں ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ اخلاق ہی ہے جس کے ذریعہ آدمی کی تکمیل ممکن ہوتی ہے۔ کمال کا حصول اخلاق کے بغیر ناممکن ہے، اخلاق کے ذریعہ ہی زندگی کی تشکیل ہوتی ہے اور اخلاقی قدروں کا لحاظ زندگی کے تمام گوشوں میں مطلوب ہے۔

انسانی معاشرہ سے انسان کا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ وہ اپنے سماج کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ مختلف افراد سے مل کر ایک سماج کی تشکیل ہوتی ہے۔ مثالی شخصیت کا کامل اظہار معاشرہ کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ اس لیے سماجی ذمہ داریوں کو انسانی اخلاق سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ اخلاق کا اعلیٰ اور کامل تصور وہی ہے جس میں فرد کی بہبود اور اجتماعی لحاظ سے نوع انسانی کی بھی فلاح کا راز پوشیدہ ہو، جس سے مشکلیں آسان ہوتی ہوں، الجھے ہوئے مسائل کا خاتمہ ہوتا ہو اور ہمارے دل و دماغ کو سکون و راحت حاصل ہوتی ہو اور جس کے ذریعہ دنیا ظلم و فساد، بدعہدی، حق تلفی اور مکر و فریب سے پاک ہو سکتی ہو۔

اخلاق کی اہمیت اور اس کی ضرورت کا ذکر کرنے کے بعد اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کے لیے اخلاقی اصول و قوانین کہاں سے اخذ کیے جائیں جو سب کے لیے قابل تسلیم ہوں اور جس میں کوئی شک و شبہ نہ ہو۔ انسانی عقل و وجدان میں چونکہ تفاوت اور فرق ہے ان کے ذریعہ ہم اچھے اور بُرے اخلاق کا ادراک تو کر سکتے ہیں لیکن ان کو منبع اور سرچشمہ نہیں بنا سکتے۔ اس کا واضح جواب یہ ہے کہ مذہب ہی اصل منبع اور سرچشمہ ہے اور اسی سے اخلاقی قوانین و اصول اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

اسلام اور اخلاق:

اس سلسلے میں جب ہم اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں جو کامل، مستند اور خدا کی طرف سے آیا ہوا آخری دین ہے جو خدا کا پسندیدہ مذہب ہے تو ہمیں خیر و شر، نیک و بد، صحیح اور غلط کا واضح علم یہاں حاصل ہوتا ہے۔ خدا نے جو قانون اخلاق عطا فرمایا ہے اس کے واجب الاطاعت ہونے کے لیے یہی بنیاد کافی ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے۔ خدا سے محبت، اس کی رضا اور خوشنودی کی طلب اور اس کی ناراضگی سے بچنے کی فکر اخلاق کی پابندیوں اور بُرے اخلاق سے اجتناب کے لیے اصل محرک ہے۔ اسلام حصول کمال کی خواہش کو جسے فکر انسانی کی نظر میں ایک اخلاقی محرک کی حیثیت حاصل ہے رد نہیں کرتا ہے۔ بلکہ اسلام نے اس کی تصدیق کی ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

”سَبَّحَ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى. الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّى. وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَى. وَالَّذِي



أَخْرَجَ الْمَرْعَىٰ. فَجَعَلَهُ غُثَاءً أَحْوَىٰ۔ (الاعلیٰ: ۱-۵)

(اپنے خدائے برتر کے نام کی تسبیح کرو جس نے خاکہ بنایا تو تناسب بھی قائم کیا اور جس نے

مقدر کیا تو رہنمائی بھی فرمائی اور جس نے سبزہ اُگایا تو اسے گھنا اور سرسبز و شاداب بھی کیا۔)

مراد یہ ہے کہ خدا نے پیدا ہی نہیں کیا بلکہ اچھی ساخت بھی عطا کی۔ پھر اس نے اچھی ساخت اور

حسن فطرت ہی نہیں بخشی بلکہ مقصود و غایت کی طرف رہنمائی بھی فرمائی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ زمین میں سبزہ

اور گھاس اُگاتا ہے اور اس میں جو صلاحیتیں پوشیدہ ہوتی ہیں انھیں ابھارنے اور ترقی دینے کا نظم بھی کرتا

ہے۔ یہاں تک کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ننھے ننھے پودے بڑھ کر نہایت گھنے، شاداب اور خوشنما درخت

ہو جاتے ہیں۔ اس قانون سے انسان کی زندگی الگ نہیں ہے۔ خدا نے انسان کو صرف زندگی عطا نہیں کی

بلکہ وجود دے کر اس نے اسے اس کے مقصد و وجود کا علم بھی بخشا۔ وہ انسان کی اس راہ کی طرف رہنمائی کرتا

ہے جس پر چل کر وہ اپنے حقیقی مقصدِ حیات کو پاسکتا ہے اور اپنی زندگی کو درجہ کمال تک پہنچا سکتا ہے۔

اسلام ہماری زندگی کے نازک سے نازک پہلوؤں کا محافظ ہی نہیں ہے بلکہ وہ ان کو درجہ کمال تک پہنچانا

چاہتا ہے۔ انسان کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ وہ اپنی ذات اور اپنے نفس کو پامال کر دے اور تکمیل سے

اسے محروم رکھے۔ قرآن میں ارشاد ہے:

”قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا. وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا۔“ (التیس: ۹-۱۰)

(کامیاب ہو گیا جس نے اُسے (اپنے نفس کو) نکھارا اور ناکام ہوا جس نے اسے دبایا اور

خراب کیا۔)

انسان کی تکمیل حقیقت میں اپنے رب کی طرف بڑھنے ہی سے ہوتی ہے، خدا سے بے نیاز و بے

تعلق ہو کر انسان پستی میں جا گرتا ہے اور کامیابی کے بلند مرتبے پر پہنچنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ اسلام

ذہن و دماغ اور دل کی ضرورتوں کو نظر انداز نہیں کرتا بلکہ وہ انسان کے سارے ہی جذبات اور اس کی

خواہشات کا احترام کرتا ہے۔ البتہ وہ اسی خوشی کو معتبر قرار دیتا ہے جو فطری اور احکام خدا کے ماتحت ہو۔

اخلاقی فرائض کی انجام دہی میں جو مسرت حاصل ہوتی ہے اسے اسلام نے دین و ایمان کی علامت قرار دیا

ہے۔ چنانچہ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

”اذا سرتك حسنتك وساءتک سيئتک فانت مومن“۔ ۵۵

(جب تمہیں اپنے اچھے کام سے خوشی ہو اور اپنے بُرے کام سے تکلیف اور افسوس ہو تو تم مومن ہو۔)

قرآن کریم نے خیر و شر کا ایسا نظریہ پیش کیا ہے جس کی بلندیوں کا تصور بھی عام ذہن نہیں کر سکتا ہے۔ قرآن خیر کو ”معروف“ کہتا ہے یعنی اس کے نزدیک خیر وہ ہے جس سے انسان کی فطرت مانوس ہے۔ جو اس کی فطرت کے عین مطابق ہے۔ جسے وہ پہچانتی ہے۔ شر کو قرآن ”منکر“ کہتا ہے یعنی شر اس کے نزدیک وہ ہے جس کا انسان کی فطرت انکار کرتی ہے، جو انسانی فطرت کے لیے اجنبی ہے، جس کو وہ جانتی نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اسلام میں نیکی و بدی کی اساس انسانی فطرت پر قائم ہے۔ اس کے نزدیک نیکی یہ ہے کہ فطرت کے مطابق ٹھیک ٹھیک چلا جائے۔ مطلوب یہ ہے کہ آدمی ترقی کر کے اس مرتبے کو پالے جہاں دین کی کوئی چیز اس کی مرضی کے خلاف نظر نہ آئے۔ سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق ہو۔ اسلامی نقطہ نظر سے فطرت کے خلاف عمل کرنے کا نام بدی ہے اور اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ آدمی تنزلی اور گراؤ کے اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جہاں کوئی چیز مرغوب و پسندیدہ نہ پائی جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اخلاق کی اصل بنیاد انسان کی اپنی فطرت کی پہچان اور اس کے مطابق عمل کرنا ہے۔ معروف کا التزام اور منکر سے اجتناب یہی فطرت صحیحہ کا تقاضہ ہے اور اسی کو اخلاق کہتے ہیں جس کا منبع اور سرچشمہ اسلام ہے جو فطرت کے عین مطابق مذہب ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اخلاقیات کا جامع تصور اسلام نے ہی پیش کیا اور اس کے اصول و قوانین بھی اسلام سے ہی کما حقہ اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

غیر مسلم معاشرہ میں اخلاقی ذمہ داریاں:

غیر مسلم معاشرے میں مسلمانوں کی اخلاقی ذمہ داریوں کا مسئلہ بہت اہم یوں ہے کہ ان کا تعامل اور انٹرایکشن عام انسانوں سے اور غیر مسلموں سے ہوتا ہے، جس میں مذہبی، قومی اور فرقہ وارانہ تعصبات حائل ہو سکتے ہیں۔ مسلمانوں کو ان تعصبات سے اوپر اٹھ کر قرآن و سنت کی روشنی میں اپنی ذمہ داریاں ادا کرنی ہوں گی۔ صدر اسلام میں اسلام کی دنیا پر فتح کا سب سے بڑا عنصر اور سب سے اہم وجہ مسلمانوں کی اخلاقی و روحانی برتری تھی۔ پورے اعتماد سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ سیاست اور تلوار کے ذریعہ مسلمانوں کو وہ فتح کبھی حاصل نہیں ہوئی جو اخلاق کی تلوار کے ذریعہ ہوئی۔ زوال و ادبار کے ان تاریک زمانوں میں جب مسلمانوں کی تیغ بے نیام کند ہو کر رہ گئی تھی، سیاست اور عسکریت کے میدان میں وہ

تاتاریوں سے پوری طرح شکست کھا چکے تھے، یہ اخلاق کی تلوار ہی تھی جس نے ان کو سنبھالا، ان کے زوال و ادبار کو روکا اور ایک بار پھر عروج کا راستہ دکھایا۔ ۵۶

اخلاقی ذمہ داریوں کا دائرہ بہت وسیع ہے ان کو محدود نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی کسی خاص قوم یا طبقے کے ساتھ انہیں خاص کیا جاسکتا ہے بلکہ آپ جس معاشرے میں رہتے ہیں، اس کے ہر فرق کے ساتھ اخلاق سے پیش آنے کی تعلیم اسلام دیتا ہے اور ان میں کسی طرح کی نسل رنگ اور علاقہ و مذہب کی تفریق نہیں کرتا۔

ہمدردی و صلہ رحمی:

اسلام کا ورود انسانوں کو آپس میں جوڑنے کے لیے ہوا تھا، یہی وجہ ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ رحمت و محبت اور ہمدردی و صلہ رحمی کا پیکر بنیں اور پوری بنی نوع انسانیت کے ساتھ اپنا رشتہ انسانیت کی بنیاد پر استوار رکھیں۔ انسانی تعلقات کے استحکام کا پہلا ذریعہ صلہ رحمی کا ہوتا ہے۔ اس کا تعلق بالعموم خونی رشتوں سے، دور کے قرابت داروں سے اور پڑوسیوں سے ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تینوں قرابتوں کے خوشگوار اثرات پورے معاشرے پر پڑتے ہیں۔ قرآن کریم نے صلہ رحمی کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا: الذین یوفون بعہد اللہ الخ (الرعد: ۲۰-۲۱) جو لوگ اسے کیے گئے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اس کے عہد کو نہیں توڑتے اور جوان رشتوں کو جوڑتے ہیں جن کے جوڑنے کا حکم اللہ نے دیا ہے اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور جنہیں بڑے حساب کا خوف لاحق رہتا ہے۔“

غیر مسلم والدین کے حسن سلوک:

جب کوئی شخص اسلام قبول کرتا ہے تو اس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ شادی بیاہ کے معاملہ میں کوئی موروثی مسلمان اسے جلدی سے قبول نہیں کرتا، دوسری طرف وہ خود اپنے رشتہ داروں اور مشرک والدین سے کٹ جاتا ہے۔ قرآن پاک کی تعلیمات اور اسوۂ رسول سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلم والدین سے اپنا رشتہ منقطع کرنا نہ موروثی مسلمان کے لیے صحیح ہے اور نہ کسی نو مسلم کے لیے صحیح ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے ووصینا الانسان بوالدیہ احساناً الخ (لقمان: ۱۴-۱۵) ”ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی تاکید کی ہے۔“ اس کی ماں نے کمزوری پر کمزوری اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے۔ اس لیے ہم نے اسے وصیت کی کہ تم میرا بھی شکر ادا کرو اور

اپنے والدین کا بھی۔ میری طرف تم کو پلٹ کر آنا ہے۔ اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ شرک کرے جس کا تجھے علم نہیں ہے تو ان کی بات نہ مان اور ان کے ساتھ معروف کے مطابق اپنا برتاؤ رکھ۔“

مفسر ابو بکر جصاص ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کا مفہوم یہ ہے: ”حسن سلوک کا یہ حکم مسلم اور غیر مسلم والدین دونوں کے لیے ہے..... والدین اگر محتاج ہوں تو ان کا نان و نفقہ اولاد پر واجب ہوگا۔ اس لیے یہ ساری چیزیں معروف کے ساتھ برتاؤ میں آتی ہیں۔ ۷۵

علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں: ”والآیة دلیل علی صلة الابوين الکافرين بما امکن من المال ان کانا فقیورین الخ“۔ ۵۸ آیت میں جہاں تک ممکن ہو مال سے کافر ماں باپ کے ساتھ صلہ رحمی کے لیے دلیل ہے اگر وہ نادار ہوں، ساتھ میں ان کے لیے نرم بات کہنا اور ان کو نرمی و لطف سے اسلام کی دعوت دینا بھی اس کا تقاضا ہے۔

حدیث سے مشرک والدین کے ساتھ حسن سلوک کا ثبوت ملتا ہے جس پر حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ صدیق کے مشہور واقعہ سے استدلال کیا جاسکتا ہے۔ حضرت اسماءؓ کی والدہ جو مشرک تھیں اسلام سے پہلے ہی حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انہیں طلاق دے دی تھی۔ وہ صلح حدیبیہ کے بعد اسماءؓ سے ملنے آئیں اور کچھ تحفہ بھی ساتھ لائیں۔ اسماءؓ کو تردد ہوا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کریں تو انھوں نے حضرت محمد ﷺ سے استفسار کیا، آپؐ نے فرمایا کوئی مضائقہ نہیں ان کا استقبال کریں تحفہ بھی لیں گھر بھی آنے دیں اور خود بھی تحفہ دیں اور صلح رحمی کریں۔ ۵۹

دوسرے غیر مسلم رشتہ دار:

ماں باپ کے علاوہ دوسرے غیر مسلم رشتہ داروں کے ساتھ بھی حسن سلوک کی بار بار تاکید کی گئی ہے۔ یقیناً بعض قانونی احکام میں مسلم اور غیر مسلم رشتہ داروں کے درمیان فرق کیا جاتا ہے، لیکن عمومی حسن سلوک تعاون و ہمدردی کے مستحق سبھی غیر مسلم رشتہ دار ہیں۔ قانونی فرق کی مثال یہ ہے مثلاً مسلمان کا وارث مسلمان ہی ہو سکتا ہے۔ غیر مسلم رشتہ دار نہیں ہو سکتے۔ مگر وصیت ضرور اس کے حق میں کی جاسکتی ہے۔ جیسا کہ ثابت ہے کہ ام المومنین حضرت صفیہؓ نے اپنے مال میں سے ایک عزیز کو تیس ہزار درہم کی وصیت کی تھی۔ ۶۰

علامہ قرطبیؒ کہتے ہیں کہ یہ آیت (سورة الاحزاب کی آیت نمبر ۶) واولو الارحام بعضهم اولی

بعض ..... الا أن تفعلوا الى اولياءكم معروفاً“ اس سلسلہ میں نازل ہوئی ہے کہ مسلمان یہودی اور نصرانی کو وصیت کر سکتا ہے۔ ۶۱۔ صلہ رحمی میں وقت ضرورت قرض دینا اور غیر مسلم قرابت دار مجبور ہوں تو ان کا قرض معاف کر دینا بھی آتا ہے۔ عبد اللہ ابن مروان کہتے ہیں کہ انھوں نے حضرت مجاہد سے پوچھا کہ میرا ایک رشتہ دار میرا مقروض ہے، کیا میں اس کا قرض معاف کر دوں، انھوں نے کہا ہاں قرض چھوڑ دو اور اس کے ساتھ صلہ رحمی کرو۔ ۶۲۔ اسلام چاہتا ہے کہ غیر مسلم رشتہ داروں کے ساتھ سماجی تعلقات بحال رکھے جائیں اور ان کے ساتھ محبت و ہمدردی اور تعاون کا رول اختیار کیا جائے۔ اس کا ایک بہترین ذریعہ تحفہ تحائف دینا بھی ہے جس کا ثبوت ہمیں حضرت عمرؓ کے اس واقعہ سے ملتا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ کا تحفہ میں دیا ہوا ایک ریشمی جوڑا اپنے ایک اخیانی مشرک بھائی کو تحفہ میں بھیجا تھا۔ ۶۳۔ اس کے علاوہ خود رسول اللہ ﷺ اپنے ہاں آنے والے بھی غیر مسلم قاصدوں اور ایلچیوں کو تحفے دیا کرتے تھے۔

### غیر مسلم پڑوسیوں سے تعلقات:

بات چونکہ غیر مسلم معاشرہ میں رہنے والے مسلمانوں کی چل رہی ہے کہ ان کی اخلاقی ذمہ داریاں کیا کیا ہیں، چونکہ عام طور پر اس طرح کے معاشرے میں پڑوسی زیادہ تر غیر مسلم ہوتے ہیں۔ اس لیے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام میں پڑوسیوں کے حقوق کافی وضاحت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں تو کیا اگر ہمارے پڑوسی غیر مسلم ہوں تو ان کے بھی وہی حقوق ہوں گے جو ایک عام مسلم پڑوسی کے ہوتے ہیں یا پھر اس میں کچھ تخصیص ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام اس طرح کی کوئی تفریق نہیں کرتا اس کا حکم عام پڑوسیوں کے بارے میں ہے خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔

مغربی ممالک ہوں یا ہندوستان جیسے ممالک، مسلمانوں کے پڑوس میں زیادہ تر غیر مسلم رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ کارخانوں، ملوں، کالجوں، تجارت میں، کاروبار میں، بازار میں، سفر میں گویا ہر جگہ آج ہمیں غیر مسلموں کا جوار (پڑوس) حاصل ہے۔ ایک مصنف پڑوس کی اہمیت واضح کرتے ہوئے یوں لکھتا ہے:

”انسان کا عملاً سب سے قریبی تعلق اس کے پڑوس سے ہوتا ہے۔ یہ تعلق جتنا مضبوط ہو وہ اتنا ہی سکون و اطمینان محسوس کرتا ہے۔ اگر کسی کو یہ یقین ہو کہ پڑوسی اس کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے، اس سے اسے کوئی نقصان اور گزند نہیں پہنچے گا بلکہ اس کی جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ رہے گی اور وہ اس کے دکھ درد اور آسائش و راحت میں شریک رہے گا تو وہ پوری

یکسوئی اور دل جمعی کے ساتھ کاروبار حیات میں اپنی ذمہ داری ادا کر سکتا ہے ورنہ وہ سخت دشواریوں سے گزرے گا۔“ ۶۳۔

حدیث مرفوع ہے: ”من كان يومن بالله واليوم الآخر فلا يؤذ جاره“ ۶۵۔ (جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اسے اپنے پڑوسی کو اذیت نہ دینی چاہیے)

حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں: ”میرے محبوب ﷺ نے مجھ سے تاکید کے ساتھ فرمایا کہ جب سالن پکاؤ تو پانی بڑھا دو اور اپنے پڑوسیوں میں سے جس کے گھر ضرورت ہو تو اس میں سے کچھ بھیج دو۔“

پڑوسیوں کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی یہ اسلامی تعلیم عام ہے۔ فہم صحابہ نے ہمیں یہی بتایا ہے، چنانچہ ان احادیث نبویہ کی روح کو حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے اپنے ایک قول سے واضح فرمایا:

”ہوایوں کہ ایک مرتبہ ان کے یہاں بکری ذبح ہوئی تو انھوں نے گھر والوں سے پوچھا کہ ہمارے فلاں پڑوسی کو اس میں کچھ بھیجایا نہیں؟ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جبریل مجھے پڑوسی کے بارے میں اس قدر تاکید کرتے تھے کہ مجھے خیال ہوتا تھا کہ وہ اسے وارث نہ بنادیں۔“ ۶۶۔

اس حدیث کے حوالہ سے علامہ رشید رضا مصری کہتے ہیں: ”هذا دليل على أن ابن عمر كان يرى عن الوصايا المتعلقة في الجار أنها تشمل المسلم وغير المسلم وناهيك بفهمه وعلمه۔ ۶۷ یعنی یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ عبداللہ ابن عمرؓ نے پڑوسی کے متعلق حسن سلوک کی تاکیدوں سے یہ سمجھا کہ ان میں مسلمان اور غیر مسلم پڑوسی سب شامل ہیں اور عبداللہ ابن عمرؓ کا یہ فہم تمہیں کافی ہونا چاہیے۔ اس کے بعد پڑوسیوں کے حقوق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”ومن الاحسان الى الجار الاهداء اليه ودعوته الى الطعام وتعاهدہ بالزيادة والعيادة“ ۶۸۔ پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک میں یہ بھی شامل ہے کہ اسے ہدیہ اور تحفہ دیا جائے۔ کھانے پر بلایا جائے اور ملاقات و عیادت کے ذریعہ اس کی خبر لی جاتی رہے۔

جیسا کہ اوپر آچکا ہے کہ جس طرح محلہ کا پڑوسی ہے، گاؤں اور شہر کا پڑوسی ہے اسی طرح وطن کا پڑوسی ہے بلکہ آج تو تیز رفتار ذرائع مواصلات اور انفارمیشن اور ٹکنالوجی نے گلوبل پڑوسی کا تصور پیدا کر دیا ہے۔ یوں ہر انسان دوسرے انسان کا پڑوسی ہو جاتا ہے۔ اور اس جوار اور پڑوس میں جغرافیہ کے علاوہ مذہب و عقیدہ اور عام انسانی اقدار و روایات سب کا کردار اہم ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے اسلام کی ان

عمومی تعلیمات میں ایک عصری معنویت بھی شامل ہو جاتی ہے کہ جوار اور پڑوس کا تصور خاص اور محدود نہیں بلکہ عام اور غیر محدود ہے، اس میں سبھی انسان آ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جوار کا یہ اسلامی تصور دارالاسلام اور دارالحرب کے رواجی تصور کی معنویت کو بھی ختم کر دیتا ہے اور ہمیں سارے انسانوں سے بالخصوص برادران وطن سے انسانی بنیادوں پر جوڑ دیتا ہے۔ ہم وطنی بھی حق الجوار میں سے ایک حق ہے جو فرائض و واجبات اور حقوق و ذمہ داریوں کی ایک پوری فہرست ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے۔ ۶۹۔

ہندوستان کے پس منظر میں اس تصور کو پرزور طریقہ پر پیش کرنے اور رائج کرنے کی ضرورت آج پہلے سے زیادہ اس لیے ہے کہ آج مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے تعصب، مسلمانوں کی اپنی شدید کوتاہیوں، قیادت کی کمی اور قومی میڈیا کے غیر ذمہ دارانہ رویہ اور جانب دارانہ رپورٹنگ کے باعث مسلمانوں کی شبیہ اس ملک میں ایک دہشت گرد کمیونٹی کی بنادی گئی ہے، اس امیج کو درست کرنے اور معاندانہ پروپیگینڈے کا توڑ اسلام کی مذکورہ بالا تعلیمات کو مثبت طریقہ پر پیش کرنے اور اجاگر کرنے سے ہو سکتا ہے۔ اس سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے روابط اور تعلقات میں استحکام پیدا ہوگا اور بہت ساری غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگا۔

اسلامی فقہ میں غیر مسلموں سے متعلق اور بھی بہت سے احکام ہیں جو ہمارے موضوع سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں، مثلاً یہ کہ غیر مسلم کا پانی پاک ہے، چونکہ اشیاء میں اصل حلت ہے اور خود رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ نے غیر مسلموں کا پانی کھانے پینے حتیٰ کہ عبادات تک میں استعمال کیا ہے، اس لیے ان کا پانی پاک ہے۔ ۷۰۔

اخلاقی روابط بڑھانے اور اس کو استحکام فراہم کرنے کے لیے نہ صرف یہ کہ غیر مسلموں کی دعوت کی جاسکتی ہے بلکہ ان کی دعوت قبول بھی کی جاسکتی ہے، خود نبی کریم ﷺ نے غیر مسلموں کو دعوت دی، ان کی دعوت قبول بھی کی جیسا کہ غزوہ خیبر میں یہودیہ کی دعوت میں جانے کا فیصلہ سیرت کی تمام کتابوں میں موجود ہے۔ ۷۱۔

ایک اہم سوال یہ ہے کہ غیر مسلموں کو سلام اور دعا کے الفاظ کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟ اس سلسلے میں احقر کی ذاتی رائے یہ ہے کہ اسلام کی وسعت نظری کا تقاضا یہ ہے کہ ان کو سلام اور دعا کہنے میں کوئی قباحہ نہیں ہونی چاہیے اور جب بھی ان کو سلام یا دعا کریں تو یہ ارادہ کریں کہ اللہ انہیں راہ راست کی

طرف ہدایت دے۔ تفسیر مفتاح القرآن کے مولف علامہ شبیر احمد ازہر میرٹھی کے نزدیک بھی یہ ہے کہ غیر مسلموں کو سلام اور دعا دی جاسکتی ہے۔ ۷۲

غیر مسلم مریض کی عیادت:

جب ہم غیر مسلم معاشرہ میں رہتے ہیں تو ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اخلاقی اقدار کی پاسداری کریں۔ ان اقدار میں بیماروں کی عیادت بھی شامل ہے خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو۔ متعدد روایات سے یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غیر مسلموں کی عیادت کی ہے، کتب حدیث و سیرت میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ ۷۳

غیر مسلم کی تعزیت:

امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف سے ثابت ہے کہ غیر مسلم کی تعزیت کی جاسکتی ہے۔ یہی اسلامی تعلیم کے عین مطابق ہے اور اس سلسلہ میں تشدد برتنا مناسب نہ ہوگا کیونکہ غیروں میں اس سے ایک منفی پیغام جائے گا۔ ۷۴

غیر مسلم عزیز کی قبر کی زیارت:

رسول اللہ ﷺ نے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کی، امام نووی نے اس حدیث کے ذیل میں لکھا ہے: اس میں مشرکین کی زندگی میں زیارت و ملاقات اور مرنے کے بعد ان کی قبروں کی زیارت کا جواز ہے۔ اس لیے کہ جب ان کی زیارت مرنے کے بعد ثابت ہے تو زندگی میں بدرجہ اولیٰ ہونی چاہیے۔ ۷۵

غیر مسلموں کے تہواروں میں بعض حدود کے ساتھ شرکت:

اس سلسلے میں بعض علماء اور فقہاء کے یہاں شدت پائی جاتی ہے۔ اس موضوع پر اسلامک فقہ اکیڈمی نے ایک سمینار میں بحث کی ہے اور اس میں پیش کردہ مقالات کا ایک خلاصہ ”مسلم و غیر مسلم“ کے نام سے شائع کیا ہے، اس کی قراردادوں کے بموجب مسلمان صریح کفریہ اور شعائر کفریہ کی تعظیم والے تہواروں کو چھوڑ کر ان کے تہواروں، سیکولر تقریبوں اور سماجی محفلوں میں شرکت کر سکتے ہیں۔ ۷۶

غیر مسلموں سے مشترکہ امور میں تعاون:

انسانوں سے تعاون علی البر خود قرآن کریم کا حکم ہے (المائدہ: ۲) اور یہ حکم عام ہے۔ اس سے



استدلال کیا جاسکتا ہے۔ بہت سے ایسے مشترکہ امور و معاملات ہو سکتے ہیں جو تمام انسانوں مسلم اور غیر مسلم سب کے درمیان مشترک ہیں۔ اعلیٰ انسانی قدریں بھی سب کے درمیان مشترک ہیں۔ ایک ہی معاشرہ اور دنیا کے ہونے کے باعث بہت سے مسائل اور ایشوز ایسے ہو سکتے ہیں جو سب کے درمیان مشترک ہوں۔ مثال کے طور پر آج کی مادی تہذیب، گلوبل وارمنگ، اوزون کی پرت پگھلنے سے، ماحولیاتی آلودگی، جرائم کی کثرت اور جبر و تشدد کا دور دورہ ہونے سے بنی نوع انسانی کی بقا کو خطرات لاحق ہیں اور انسان کا وجود خطرہ میں ہے۔ اس طرح کے مشترکہ خطرات اور اس جیسے دیگر مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے غیر مسلموں کے ساتھ تعاون کرنا نہ صرف اخلاقی فریضہ ہے بلکہ انسانوں کی بنیادی ضرورت ہے۔ اور اس طرح کے مسائل کے تصفیہ کے لیے تنگ نظری، وقتی اور جغرافیائی مصالح کو چھوڑ کر آفاقی اصولوں، مسلمہ اقدار اور وسیع انسانی مفادات کی بنیاد پر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جانا وقت کی اہم ضرورت ہے اور شریعت میں اس طرح کے امور میں تعاون کرنے پر ابھارا گیا ہے جیسا کہ ماقبل میں مذکور آیت سے ثابت ہے۔

خلاصہ:

انسان معاشرہ میں پیدا ہوتا ہے اور اسی میں جیتا اور مرتا ہے۔ ارسطو نے اسے ایک ”معاشرتی جانور“ کہا ہے۔ ماں کی آغوش سے لے کر لحد کی آغوش تک اس کی زندگی معاشرہ کے مختلف علاقوں اور رابطوں میں جکڑی ہوتی ہے، ان سے علیحدگی اختیار کر کے وہ ایک انسان کی طرح زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ ہماری اس خصوصیت نے ہمارے وجود کے گرد حقوق و فرائض کا وسیع جال بن دیا ہے۔ ہم پر ہمارے گھر کے حقوق ہیں، ہمارے محلہ کے حقوق ہیں، ہمارے شہر، ہمارے ملک اور کل دنیا کے حقوق ہیں اور ان سب پر ہمارا حق ہے جو شخص ان حقوق اور ذمہ داریوں کو برتنے میں جتنا زیادہ کامیاب ہو، اسے اتنا ہی زیادہ شریف، شائستہ، بااخلاق اور معیاری شہری سمجھا جاتا ہے۔

ایک سچا مسلمان چونکہ تمام محاسن اور خوبیوں کا مجموعہ ہوتا ہے اس لیے اس سے اس بات کی توقع کی جاتی ہے کہ وہ حقوق و فرائض کی ادائیگی میں کسی طرح کی تساہلی نہیں برتے گا اور اپنے اخلاق کو بہتر صفات سے مزین کر کے دنیا کے سامنے ایک بے نظیر نمونہ پیش کرے گا، کیوں کہ جس مذہب کا وہ پیروکار ہے وہ مذہب اخلاق حسنہ کو ایمان کی پہچان اور اس کے نتائج و ثمرات بتاتا ہے۔ جس مسلمان کے اخلاق

جتنے اچھے ہوں گے اتنا ہی اس کا ایمان مضبوط اور اس کی عبادت مقبول ہوگی، لیکن اگر کوئی شخص ایمان کا تو دعویدار ہو اور خدا کی عبادت کا اہتمام بھی رکھتا ہو مگر اخلاق کی دولت سے محروم ہو اور اہل و عیال، اعزاء اقرباء، دوست و احباب، پڑوسی، اہل وطن اور ساری انسانی برادری حتیٰ کہ جانوروں تک سے جو اس کا تعلق ہے اسے بحسن و خوبی انجام نہ دیتا ہو تو یہ عملی ثبوت اس بات کا ہوگا کہ اس کا ایمان، اس کی زبان سے اتر کر اس کے نفس کی گہرائیوں تک نہیں پہنچا ہے گویا کہ ہمارے اخلاق، ہماری ایمانی حالت کی کسوٹی ہیں۔ ہم اپنے اخلاق کے آئینہ میں اپنی روح کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔

غیر مسلم معاشرہ میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے چند ضروری اصول:

تکثیری معاشرہ میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے چند زریں اصول ہیں جو ان کے لیے دینی، سیاسی، سماجی اور اخلاقی طور پر آسانیاں فراہم کرتے ہیں۔ یہ وہ اصول ہیں جو مہاجرین حبشہ کے مقدمہ، بیانات اور اجمالی حالات سے اخذ کیے گئے ہیں۔

(۱) مسلمان جہاں کہیں ہوں وہ حق پر قائم رہیں اور حق بات ہی کہیں حالات جیسے بھی ہوں، یہی ان کی مذہبی اور تہذیبی زندگی کی اساس ہے۔

(۲) دین کی دعوت، حکمت، معقولیت اور مدلل طریقے سے اپنے ہم وطنوں کو دیں اور ہمیشہ طاقت کا مقابلہ حکمت سے کرنے کی سعی کریں۔ اقلیت کے لیے یہ ہتھیار زیادہ کارگر ہے۔

(۳) جس ملک میں رہیں اس کے خیر خواہ اور محب وطن بن کر رہیں، چنانچہ نجاشی کے لیے دعاؤں کا اہتمام کر کے صحابہ نے اپنی خیر خواہی کا ثبوت دیا تھا۔

(۴) ملک کے نظام عدل سے واقفیت حاصل کریں اور اسے اپنے تحفظ کے لیے اور اپنا حق حاصل کرنے کے لیے استعمال کریں۔ حضرت جعفر نے نجاشی کے دربار میں یہی کارنامہ انجام دیا تھا۔

(۵) جس ملک میں رہیں وہاں امن پسند شہری کی حیثیت سے رہیں اور تخریبی کاروائیوں میں ملوث نہ ہوں۔ حضرت جعفر کی تقریر کا یہ جملہ کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کی، حرام کاموں سے بچنے کی اور خونریزی سے گریز کرنے کی تعلیم دی۔ یہی سبق اور نصیحت دیتا ہے۔

(۶) مسلمان جہاں بھی ہوں باہمی اتحاد و اتفاق، مشاورت اور یک جہتی سے کام لیں، اپنا کوئی امیر بھی منتخب کریں، چنانچہ حضرت جعفر طیار کی امارت میں مہاجر صحابہ کا باہمی مشورہ سے ایک موقف

طے کرنا یہی اسوہ فراہم کرتا ہے۔

(۷) اپنے موقف، مقصد حیات اور طرز زندگی سے ہم وطنوں کو واقف کرائیں تاکہ وہ غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ ان کے لیے تحفظ کے مسائل پیدا نہ کریں اور اسلام کو حریف کے طور پر نہ سمجھیں۔ حضرت جعفر کی پوری تقریر کا لب لباب یہی ہے۔

(۸) ہم وطنوں کے مذہب، مزاج اور تہذیبی شعار سے ضروری واقفیت حاصل کریں تاکہ بقائے باہم کی راہ ہموار ہو۔ ہجرت حبشہ سے قبل سورہ مریم کا نزول اور نجاشی کی عدالت میں حضرت جعفر کی تلاوت سے اس کی طرف واضح اشارہ ملتا ہے۔

(۹) مسلمانوں کو اگر کوئی مذہبی یا سماجی صدمہ سے دوچار ہونا پڑے تو وہ صبر و استقلال اور دوراندیشی سے کام لیں، عجلت اور جذباتیت سے ممکن حد تک گریز کریں، جیسا کہ عبداللہ بن جحش کے ارتداد پر مسلمانوں کے محتاط رد عمل سے معلوم ہوتا ہے۔

(۱۰) مسلمان جس ملک میں ہوں محنت و مشقت اور حلال روزی کو اپنا وطیرہ بنائیں۔

## حواشی و مراجع

- ۱۔ اوصاف احمد، اسلامی مالیات اور مسلم اقلیتی ممالک، انسٹی ٹیوٹ آف آئیجکٹو اسٹڈیز، نئی دہلی، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۶ء، ص ۱۴
- ۲۔ محمود احمد غازی، اسلام کا قانون بین الممالک (خطبات بہاولپور) شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی یونیورسٹی، اسلام آباد، پاکستان، ۲۰۰۷ء، ص ۴۹۰
- ۳۔ ایضاً، ص ۴۹۵
- ۴۔ ایضاً، ص ۴۹۵
- ۵۔ ایضاً، ص ۴۹۵ تا ۴۹۷
- ۶۔ ایضاً، ص ۴۹۵
- ۷۔ ایضاً، ص ۴۹۷
- ۸۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں جماعت اسلامی کا موقف پہلے یہ تھا کہ نظام وقت یا طاغوت سے تعاون کرنا جائز نہیں، چنانچہ ان کے یہاں ارکان پروٹ دینے تک پر پابندی تھی، مگر اب بتدریج نہ صرف قیام بھی عمل میں آچکا ہے جس کا دروازہ غیر مسلم حضرات کے لیے بھی کھلا ہے۔
- ۹۔ محمود احمد غازی، حوالہ بالا، ص ۵۱۰
- ۱۰۔ ایضاً، ص ۵۱۱
- ۱۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: عروج احمد قاری، امت مسلمہ کا نصب العین، مرکزی مکتبہ اسلامی نئی دہلی، طبع سوم، ۱۹۸۹ء
- ۱۲۔ محمود احمد غازی، حوالہ بالا، ص ۵۱۱-۵۱۲
- ۱۳۔ پروفیسر عبدالرحمن مومن، غیر مسلم معاشرہ میں مسلم اقلیتیں، مطالعات، جنوری تا مارچ ۲۰۰۸ء
- ۱۴۔ شیخ الازہر سید محمد طنطاوی نے فتویٰ دیا کہ جو مسلمان خواتین قرآن میں رہتی ہیں وہ اضطراری حالت میں اسکارف چھوڑ سکتی ہیں، شیخ الازہر کے اس فتویٰ کا اقتباس ڈاکٹر ظفر علی راجا نے اپنے طویل مقالے ”اسکارف احجاب کا مسئلہ اسلام اور یورپی نفسیات“ ماہنامہ محدث لاہور، مجلس التحقیق الاسلامی لاہور

پاکستان، اپریل ۲۰۰۴ء کے شمارے میں پیش کیا ہے۔

- ۱۵ نجات اللہ صدیقی، مقاصد شریعت، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی، مئی ۲۰۰۹ء، ص ۱۸۷
- ۱۶ ایضاً، ص ۱۸۷
- ۱۷ محمد صالح العثیمین، غیر مما لک میں سفر و سکونت کا شرعی حکم (اردو ترجمہ، عبدالقوی نعمان) ماہنامہ محدث لاہور، اپریل ۲۰۰۷ء، ص ۹۹
- ۱۸ حارث بشیر، آریس ایس ایک مطالعہ، کوسموز بکس، ابوالفضل انٹلیونٹی دہلی، ۲۰۰۳ء
- ۱۹ مسلمان سیکولرزم اور ہندوستان، مجلہ ترجمان دارالعلوم، تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند، نئی دہلی، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۲۶ تا ۳۵
- ۲۰ ایضاً
- ۲۱ ایضاً
- ۲۲ خالد سیف اللہ رحمانی، ”مسلمان اور الیکشن“ ماہنامہ ندائے حرم، جامعہ کنز العلوم احمد آباد گجرات، دسمبر ۲۰۱۲ء
- ۲۳ شیخ الاسلام احمد ابن تیمیہ، مجموع الفتاویٰ، مکتبہ العبدیکان، الریاض، ۱۹۹۷ء، ص ۱۲۶-۱۲۹
- ۲۴ صلاح الدین العلانی، المجموع المہذب فی قواعد المذہب، ص ۳۸، الوجہ الاول
- ۲۵ الشافعی، الام، مصر ۱۹۶۱ء، ج ۴، ص ۱۶۸
- ۲۶ محمد ابن احمد الانصاری القرطبی، احکام القرآن، مکتبہ الرشید ۱۹۹۱ء، ج ۹، ص ۲۱۵
- ۲۷ سلطان احمد اصلاحی، ”مسئلہ حاکمیت الہ اور اس کے تقاضے“، سہ ماہی علم و ادب، علی گڑھ، اپریل تا جون ۲۰۰۷ء
- ۲۸ حارث بشیر، آریس ایس ایک مطالعہ
- ۲۹ نجات اللہ صدیقی، تحریک اسلام عصر حاضر میں، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء، ص ۱۸۷
- ۳۰ سلطان احمد اصلاحی، مسلمان اقلیتوں کا مطلوبہ کردار، ادارہ علم و ادب، علی گڑھ
- ۳۱ ایضاً
- ۳۲ نجات اللہ صدیقی، مقاصد شریعت، ص ۱۱۱
- ۳۳ ایضاً، ص ۴۳
- ۳۴ نور الدین مختار الخادمی، علم مقاصد الشریعہ، آئی او ایس سنٹر فار عربک اینڈ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ فکری

دلچسپی کے ساتھ دیکھے جاتے ہیں۔

- ۵۱ فقہ الاقلیات کے موضوع پر بہت ساری کتابیں اردو میں شائع ہو چکی ہیں، مثال کے طور پر (۱) فقہ الاقلیات، آئی او ایس سینٹر فار عربک اینڈ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ نگر نئی دہلی (۲) ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی، فقہ الاقلیات کا تعارف، آئی او ایس (۳) فقہ الاقلیات، مجموعہ مقالات، اسلامی فقہ اکیڈمی نئی دہلی۔
- ۵۲ منت اللہ رحمانی، سفر نامہ حجاز و مصر، ضمیمہ الف، ص ۱۳۶-۱۳۷
- ۵۳ محمد طیب صاحب، مشمولہ فکر اسلامی کی تشکیل جدید، (مجموعہ مقالات)، مرتبہ ضیاء الحسن فاروقی، مشیر الحق ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، ص ۴۳-۴۴
- ۵۴ نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے، اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)، نئی دہلی، اپریل ۲۰۰۹ء
- ۵۵ مسند احمد، دار الحدیث قاہرہ، ۱۴۱۶ھ/۱۹۹۵ء، ج ۱۶، ص ۲۲۳
- ۵۶ سید ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت و عزیمت، ج ۱، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ، طبع چہارم، ۱۹۹۲ء، ص ۳۲۲
- ۵۷ ابوبکر جصاص، احکام القرآن، المطبعة البہیہ مصر، ۱۳۴۷ھ، ج ۳، ص ۴۳۳
- ۵۸ قرطبی، ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاری، الجامع لاحکام القرآن، البہیہ المصریۃ العامۃ، ۱۹۸۷ء، ج ۱۴، ص ۱۶۵
- ۵۹ بخاری، کتاب الہبۃ، باب الہدیۃ للمشرکین، مکتبہ رشیدیہ دہلی
- ۶۰ ابوعبداللہ محمد الدارمی، کتاب الوصایا، باب الوصیۃ لابل الذمۃ، طبع الہند، ج ۲، ص ۵۱۷
- ۶۱ احکام القرآن للقرطبی، ج ۱۴، ص ۱۲۶
- ۶۲ ابوعبید، کتاب الاموال، ص ۵۴۳، بحوالہ سید جلال الدین عمری، ”غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق“، ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ، ص ۱۹۹
- ۶۳ بخاری، کتاب الہبۃ
- ۶۴ سید جلال الدین عمری، ”غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق“، ص ۴۸
- ۶۵ ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی حق الجوار
- ۶۶ ایضاً
- ۶۷ رشید رضا مصری، تفسیر المنار، دار المنار، مصر ۱۳۶۵ھ، جلد ۵، ص ۹۲
- ۶۸ حوالہ بالا

دہلی، ۲۰۰۹ء، ص ۱۷۴

۳۵ نجات اللہ صدیقی، مقاصد شریعت، ص ۴۴-۴۵

۳۶ اوقاف کے سلسلے میں مزید معلومات کے لیے سید خالد رشید کی تصنیف کا مطالعہ کیا جائے۔

waqf managment in india the past present and future

Administrative and stataory control on Auqaf by Khalid Rasheed

قاضی پبلشرز نظام الدین نئی دہلی

۳۷ مثال کے طور پر دہلی میں ہیومن ویلفیئر ٹرسٹ، آئی او ایس، مسلم اسٹوڈنٹ ٹرسٹ اور فاؤنڈیشن فار سوشل کیئر لکھنؤ وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔

۳۸ غطریف شہباز ندوی، مدارس اسلامیہ، مطلوبہ نظام تعلیم کے خدوخال، سہ روزہ دعوت نئی دہلی، ۶ جون، ۲۰۰۶ء

۳۹ محمود احمد غازی، الشریعہ کی خصوصی اشاعت، الشریعہ اکیڈمی گونجران والا، پاکستان، جنوری/فروری ۲۰۱۱ء

۴۰ نجات اللہ صدیقی، تحریک اسلام عصر حاضر میں، ص ۱۱۵

۴۱ عتیق احمد بستوی، ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کا مسئلہ، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نئی دہلی، مارچ

۲۰۱۰ء، ص ۲۷

۴۲ ایضاً، ص ۱۷

۴۳ ابوالحسن علی ندوی، اجتماعی جہاد، اسلام فقہ اکیڈمی نئی دہلی

۴۴ Constituent Assembly debates vol viii, (From 4th Nov to 8th jan

1949) Constituent Assembly Secretariate New Delhi, 1949

۴۵ خالد رشید، ”آئینی ترمیم کے ذریعہ ہندوستان میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا تحفظ“، مطالعات کا ہندوستانی

مسلم اقلیتی نمبر، نئی دہلی، جنوری تا مارچ ۲۰۱۲ء

۴۶ ایضاً، ص ۶۰

۴۷ محمود حسن الہ آبادی، ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل، مشمولہ مطالعات کا محولہ بالا شمارہ، ص ۹۱

۴۸ ایضاً، ص ۹۲

۴۹ مطالعات کا ہندوستانی مسلم اقلیت نمبر، نئی دہلی، جنوری تا مارچ ۲۰۱۲ء، ص ۱۱۹

۵۰ آج ہندوستان میں مختلف T.V. چینلز اس سلسلے میں کام کر رہے ہیں، مثلاً ”پیس ٹی وی“، ”زی سلام“،

”ای ٹی وی، اردو“ بہت سارے اسلامی تعلیمات پر مبنی پروگرام ان کے ذریعہ نشر ہو رہے ہیں اور پوری

- ۶۹ راشد الغنوشی، حقوق المواطنة، حقوق غیر المسلم فی المجتمع الاسلامی المعهد العالی للفکر الاسلامی، الولایة المتحدة الامریکیة، ۱۹۹۳ء
- ۷۰ سید جلال الدین عمری، ”غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق“، ص ۶۷
- ۷۱ ایضاً، ص ۷۱
- ۷۲ شبیر احمد ازہر میرٹھی، تفسیر مفتاح القرآن، مکتبہ ازہریہ میرٹھ، سن اشاعت غیر مرقوم، ص ۱۵۰
- ۷۳ مسند احمد بن حنبل، المکتبۃ الاسلامی بیروت، ج ۳، ص ۱۵۱
- ۷۴ سید جلال الدین عمری، ”غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق“، ص ۹۳
- ۷۵ نووی، شرح مسلم، دارالریان للتراث قاہرہ، ۱۹۸۷ء، ج ۳، جز ۷، ص ۴۵
- ۷۶ ”مسلم غیر مسلم تعلقات“، تلخیص مقالات، اسلامک فقہ اکیڈمی نئی دہلی، جون ۲۰۰۴ء





## کتابیات

- (۱) ابن تیمیہ، اقتضاء الصراط المستقیم، مطابع المجد التجاریہ، سن اشاعت غیر مرقوم
- (۲) ابن تیمیہ، مجموع الفتاویٰ، مکتبہ العبیکان، الریاض، ۱۹۹۷ء
- (۳) ابن حجر عسقلانی، الاصابہ فی تمییز الصحابہ، مکتبہ المثنیٰ بغداد، ۱۳۲۸ھ
- (۴) ابن قیم، زاد المعاد، مطبع میمدیہ، مصر، سن اشاعت غیر مرقوم
- (۵) ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، دار الفکر العربی، ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء
- (۶) ابن کثیر، قصص الانبیاء، مکتبہ الصفا، ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء
- (۷) ابن نجیم، الاشباہ والنظائر، ادارہ نشر و اشاعت، دار العلوم دیوبند، ۱۴۰۶ھ
- (۸) ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، مطبع مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر، ۱۹۵۵ء
- (۹) ابن یوسف زیلعی، نصب الرایۃ، دار المامون شبرا، ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء
- (۱۰) ابن یوسف زیلعی، نصب الرایۃ، مجلس علمی ڈابھیل، ۱۴۰۸ھ/۱۹۸۶ء
- (۱۱) ابوالاعلیٰ مودودی، اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر، مکتبہ جماعت اسلامی، دارالاسلام پٹھان کوٹ، سن اشاعت غیر مرقوم
- (۱۲) ابوالحسن علی ندوی، اجتماعی اجتہاد، اسلامی فقہ اکیڈمی، نئی دہلی
- (۱۳) ابوالحسن علی ندوی، اسلام اور مغرب، لکھنؤ پبلیشنگ ہاؤس، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء
- (۱۴) ابوالحسن علی ندوی، سیرت رسول اکرم ﷺ، سید احمد شہید اکیڈمی، رائے بریلی، ۲۰۰۲ء
- (۱۵) ابوالحسن علی ندوی، کاروان زندگی، مکتبہ اسلام، لکھنؤ، ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء
- (۱۶) ابوالحسن علی ندوی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ
- (۱۷) ابوالحسن علی ابن ابی بکر الفرغانی، ہدایہ، شرکت علمیہ ملتان، سن اشاعت غیر مرقوم
- (۱۸) ابوالحسن مسلم بن الحجاج، الصحیح المسلم، کتب خانہ رشیدیہ، دہلی
- (۱۹) ابوبکر احمد بن حسین ابن علی البیہقی، السنن الکبریٰ، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۰ھ
- (۲۰) ابوبکر بن حسین ابن علی البیہقی، السنن الکبریٰ، مطبع معارف عثمانیہ حیدرآباد، ۱۹۵۴ء

- (۲۱) ابو بکر صاص، احکام القرآن، دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۰۵ھ
- (۲۲) ابو جعفر، تفسیر ابن جریر طبری، مطبع المینہ، مصر، ۱۳۲۱ھ
- (۲۳) ابوداؤد سجستانی، سنن ابوداؤد، یاسر ندیم اینڈ کمپنی، دیوبند
- (۲۴) ابوعبداللہ محمد بن مفلح، الآداب الشرعیہ، موسسۃ الرسالۃ بیروت، ۱۴۱۷ھ
- (۲۵) ابوعبداللہ محمد بن یزید القزوینی، سنن ابن ماجہ، کتب خانہ رشیدیہ، دہلی
- (۲۶) ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ الترمذی، جامع ترمذی، اشرفیہ بکڈ پو، دیوبند
- (۲۷) ابومحمد عبدالملک بن ہشام، السیرۃ النبویہ، دار الفکر قاہرہ، ۱۹۵۵ء
- (۲۸) ابویعلیٰ، مسند ابویعلیٰ، دار ایمان للتراث، دمشق، ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۸ء
- (۲۹) ابویوسف ابن ابراہیم، کتاب الخراج، مطبع المیریہ مصر، ۱۳۰۲ھ
- (۳۰) احمد بن حنبل، مسند احمد، دار الحدیث قاہرہ، ۱۴۱۶ھ/۱۹۹۵ء
- (۳۱) احمد بن حنبل، مسند احمد، مطبعہ مینہ مصر، ۱۳۱۳ھ
- (۳۲) احمد بن شعیب بن علی نسائی، سنن النسائی، یاسر ندیم اینڈ کمپنی، دیوبند
- (۳۳) احمد بن یحییٰ بن جابر البلاذری، فتوح البلدان، نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۲ء
- (۳۴) اسماعیل ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، دار الفکر، ۱۹۸۰ء
- (۳۵) اشرف علی تھانوی، بیان القرآن، تاج پبلشرز، پیری والا باغ، نئی دہلی، سن اشاعت غیر مرقوم
- (۳۶) اشفاق محمد خان، ہندوستانی معاشرہ میں مسلمانوں کے مسائل، پیٹریاٹ پبلیشرز نئی دہلی، ۱۹۹۰ء
- (۳۷) اقبال احمد سلفی، اسلام اور پیغمبر اسلام اہل انصاف کی نظر میں، فوٹو آفسیٹ پرنٹرز دہلی، ۱۹۸۸ء
- (۳۸) الشافعی، الام، مصر ۱۹۶۱ء
- (۳۹) انتظام اللہ شہابی، اسلامی اخلاق، محمد سعید اینڈ سنز کراچی، سن اشاعت غیر مرقوم
- (۴۰) اوصاف احمد، اسلامی مالیات اور مسلم اقلیتی ممالک، انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل اسٹڈیز، نئی دہلی، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۶ء
- (۴۱) آر-امین، ہم کون ہیں، شرکت پرنٹنگ پریس، ۲۰۰۳ء
- (۴۲) بدر الحسن قاسمی، الاقلیات المسلمۃ، کویت
- (۴۳) جسونت سنگھ، اتحاد سے تقسیم تک (اردو ترجمہ فرحت احساس)، روپا اینڈ کو، نئی دہلی، ۲۰۰۹ء
- (۴۴) جلال الدین عمری، اسلام میں خدمت خلق کا تصور، ادارہ تحقیق و تصنیف علی گڑھ، ۱۹۹۶ء

- (۴۵) حارث بشیر، آرائس الیس ایک مطالعہ، کوسموز بکس، ابو الفضل انکلیوٹی، دہلی، ۲۰۰۳ء
- (۴۶) حبیب الرحمان عثمانی، اشاعت اسلام، شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند، ۱۹۹۷ء
- (۴۷) حسن ابراہیم مصری (اردو ترجمہ: علیم اللہ صدیقی) انظم الاسلامیہ، مسلمانوں کا نظام مملکت، محبوب پریس، دہلی، ۱۹۴۷ء
- (۴۸) حمودہ عبدالعاطی، اسلام ایک روشن حقیقت (مترجم: شریف احمد خان)، ہندوستان پبلی کیشنز، دہلی، ۱۹۸۲ء
- (۴۹) حنیف ندوی، افکار ابن خلدون، لاہور، ۱۹۸۷ء
- (۵۰) خطابی، معالم السنن مع تہذیب ابن قیم
- (۵۱) دیوبند لیوی، اسلامی سماج (مترجم مشیر الحق)، ترقی اردو بیورو، دہلی، ۱۹۸۷ء
- (۵۲) راشد القوشی، حقوق المواطنة، حقوق غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی المعهد العالی للفکر الاسلامی، الولایۃ المتحدة الامریکیۃ، ۱۹۹۳ء
- (۵۳) رشید احمد گنگوہی، فتاویٰ رشیدیہ، گلستان کتاب گھر دیوبند، ۱۹۸۷ء
- (۵۴) رشید رضا مصری، تفسیر المنار، دار المنار، مصر، ۱۳۶۵ھ
- (۵۵) سلطان احمد اصلاحی، مسلمان اقلیتوں کا مطلوبہ کردار، ادارہ علم و ادب، علی گڑھ
- (۵۶) سلیمان منصور پوری، سیرت رحمۃ للعالمین، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۵۳ء
- (۵۷) شبلی نعمانی، الفاروق، مطبع برلاس پریس مراد آباد، ۱۹۰۷ء
- (۵۸) شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، سیرت النبی، مکتبہ مدینہ لاہور، ۱۴۰۸ھ
- (۵۹) شبیر احمد ازہر میرٹھی، تفسیر مفتاح القرآن، مکتبہ ازہریہ میرٹھ، سن اشاعت غیر مرقوم
- (۶۰) شوقی ابوظلیل، اطلس القرآن (مترجم محمد امین) دارالسلام، ریاض، ۱۴۲۴ھ
- (۶۱) شوکانی، نیل الاوطار، دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۹ء
- (۶۲) صفی الرحمان مبارکپوری، الریح الختم، مجلس علمی مبارک پور، اعظم گڑھ، طبع پنجم
- (۶۳) ضیاء الدین علوی، علم سماجیات، علی گڑھ
- (۶۴) طاہر القادری، اسلام میں انسانی حقوق، ادبی دنیا، دہلی، ۲۰۰۷ء
- (۶۵) عابد حسین، مسلمانوں کے عصری مسائل، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۲ء
- (۶۶) عبدالصمد صارم، قرآن، اسلام اور رسول اللہ ﷺ غیر مسلموں کی نظر میں، ادارہ اشاعت اسلام دیوبند، ۲۰۰۸ء

- (۶۷) عبدالقادر، ابتدائی سماجیات، نئی دہلی، ۱۹۷۹ء
- (۶۸) عتیق احمد بستوی، ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کا مسئلہ، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نئی دہلی
- (۶۹) عروج احمد قاری، امت مسلمہ کا نصب العین، مرکزی مکتبہ اسلامی نئی دہلی، طبع سوم، ۱۹۸۹ء
- (۷۰) عمر بن محمد عوض السنائی، نصاب الاحساب، مکتبہ الطالب الجامعی، مکہ، سن اشاعت غیر مرقوم
- (۷۱) غزالی، اسلام کی اخلاقی تعلیمات (مترجم: رشید الوحیدی)، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، ۱۹۸۱ء
- (۷۲) غلام حسین پانی پتی، اسلام و اصلاح معاشرت، رفاه عام پریس لاہور، سن اشاعت غیر مرقوم
- (۷۳) غلام رسول مہر (مرتب)، انبیاء کرام علیہم السلام، پرویز بکڈپو، دہلی، سن اشاعت غیر مرقوم
- (۷۴) غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل، ایفاپبلی کیشنز، نئی دہلی، مارچ ۲۰۰۶ء
- (۷۵) فاطمہ شجاعت، سماجیات کے اصول، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء
- (۷۶) فتاویٰ عالمگیری، دارالکتب دیوبند، سن اشاعت غیر مرقوم
- (۷۷) فتاویٰ محمودیہ، ادارہ صدیق ڈابھیل گجرات، ۲۰۰۷ء
- (۷۸) قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، دارالکتب العربی بیروت، ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء
- (۷۹) کاسانی، بدائع الصنائع، مطبع جمالیہ مصر، ۱۳۲۶ھ/۱۹۱۰ء
- (۸۰) گنسبرگ، Studies in Sociology، نیویارک، ۱۹۳۲ء
- (۸۱) محمد اسحاق سندیلوی، اسلام کا سیاسی نظام، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۵۷ء
- (۸۲) محمد امین بن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار، مکتبہ زکریا، دیوبند، ۱۴۱۷ھ
- (۸۳) محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح البخاری، مطبع المجتہائی، دہلی
- (۸۴) محمد بن عبدالباقی الزرقانی، زرقانی، مطبع ازہریہ، مصریہ، ۱۳۲۷ھ
- (۸۵) محمد بن محمد بن سلیمان، جمع الفوائد، مطبع خیرہ میرٹھ، ۱۹۴۵ء
- (۸۶) محمد تقی امینی، اسلام اور جدید دور کے مسائل، مکتبہ فیض دیوبند
- (۸۷) محمد زکریا، اسلامی سیاست، کتب خانہ اشاعت العلوم سہارنپور، سن اشاعت غیر مرقوم
- (۸۸) محمد سرور فاروقی، اسلام میں غیر مسلموں کے حقوق، مکتبہ پیام امن لکھنؤ، ۲۰۰۸ء
- (۸۹) محمد سرور فاروقی، قرآن میں انسان کا مقام اور اس کا اعلیٰ مقصد، پیام امن لکھنؤ، ۲۰۰۹ء

- (۹۰) محمد سعود عالم قاسمی، عصر حاضر میں اسوۂ رسول کی معنویت، فیکلٹی دینیات، علی گڑھ، ۲۰۰۸ء
- (۹۱) محمد سعود عالم قاسمی، قرآن کی دعوت فکر، فیکلٹی دینیات، علی گڑھ، ۲۰۱۰ء
- (۹۲) محمد صالح العثیمین، غیر ممالک میں سفر و سکونت کا شرعی حکم (اردو ترجمہ، عبدالقوی نعمان) ماہنامہ محدث لاہور، اپریل ۲۰۰۷ء
- (۹۳) محمد طیب صاحب، مشمولہ فکر اسلامی کی تشکیل جدید، (مجموعہ مقالات)، مرتبہ ضیاء الحسن فاروقی، مشیر الحق ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی
- (۹۴) محمود احمد غازی، اسلام کا قانون بین الممالک (خطبات بہاولپور) شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی یونیورسٹی، اسلام آباد، پاکستان، ۲۰۰۷ء
- (۹۵) مسلم غیر مسلم تعلقات (تلخیص مقالات)، اسلامک فقہ اکیڈمی، نئی دہلی، جون ۲۰۰۴ء
- (۹۶) محمد طفیل، نقوش (رسول نمبر)، ادارہ فروغ اردو، لاہور، دسمبر ۱۹۸۲ء
- (۹۷) محمد طیب، اسلام اور مغربی تہذیب، اتحاد بکڈ پوڈیو بند، سن اشاعت غیر مرقوم
- (۹۸) محمد علیم اللہ صدیقی، مسلمانوں کا نظام مملکت، محبوب المطالع پریس، دہلی، ۱۳۶۶ھ/۱۹۴۷ء
- (۹۹) محمد مظہر الدین، اسلام کا نظریہ اخلاق، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۵۵ء
- (۱۰۰) محمد ہاشم قدوائی، مبادی سیاسیات، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۵ء
- (۱۰۱) محمود آلوسی، روح المعانی، ادارۃ الطباعة المصطفائیة، دیوبند، سن اشاعت غیر مرقوم
- (۱۰۲) منظور نعمانی، معارف الحدیث، مطبع الفرقان بکڈ پوڈیو، ۲۰۰۰ء
- (۱۰۳) منوسرتی، اردو ترجمہ، مطبع نول کشور کانپور، ۱۹۶۵ء
- (۱۰۴) میریا کالی کٹ، تاریخ اسپین، مطبع جان مری البی، اسٹریٹ، ۱۸۴۰ء
- (۱۰۵) میک آئیور، سوسائٹی، لندن، ۱۹۷۹ء
- (۱۰۶) نجات اللہ صدیقی، تحریک اسلام عصر حاضر میں، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء
- (۱۰۷) نجات اللہ صدیقی، مقاصد شریعت، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی، مئی ۲۰۰۹ء
- (۱۰۸) نور الدین مختار الحادمی، علم مقاصد الشریعہ، آئی او ایس سنٹر فار عربک اینڈ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ نگر نئی دہلی، ۲۰۰۹ء
- (۱۰۹) نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے، ایفا پبلی کیشنز، نئی دہلی، اپریل ۲۰۰۹ء

- (۱۱۰) ولیم ایف اوگبرن، سوشولوجی، نیویارک، غیر مرقوم
- (۱۱۱) وہبہ الرحمی، الفقہ الاسلامیہ واولیہ، دار الفکر بیروت، ۲۰۰۲ء
- (۱۱۲) یسین مظہر صدیقی، ملکی اسوہ نبوی: مسلم اقلیتوں کے مسائل کا حل، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۲۰۰۵ء
- (۱۱۳) Bosworth Smith, Mohammad and Mohammadanism, London, 1874
- (۱۱۴) Constituent Assembly debates vol viii, constituent Assembly Secretariate New Delhi, 1949
- (۱۱۵) waqf managment in india the past present and future Adminitrative and stataory control on Auqaf by Khalid Rasheed قاضی پبلشرز نظام الدین نئی دہلی

### رسائل، مقالے، اخبارات

- (۱) اب آپ بھی احتساب کریں تو بات بنے، مولانا اسرار الحق قاسمی، راشٹریہ سہارا (اردو) نئی دہلی، ۳ مارچ، ۲۰۰۹ء
- (۲) تحقیقات اسلامی (مدیر: جلال الدین عمری)، نبی کریم علی گڑھ، جلد ۲۸، شمارہ ۴، شوال - ذی الحجہ، ۱۴۳۰ھ / ۲۰۰۹ء
- (۳) تحقیقات اسلامی، (مدیر: جلال الدین عمری)، جلد ۱، شمارہ ۱، جمادی الاولی - رجب، ۱۹۸۹ء، پان والی کوٹھی علی گڑھ
- (۴) ترجمان دارالعلوم (مدیر: افضال الحق)، تنظیم ابنائے قدیم، نئی دہلی، اپریل تا جون، ۲۰۱۰ء
- (۵) خالد رشید، ”آئینی ترمیم کے ذریعہ ہندوستان میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا تحفظ“، مطالعات کا ہندوستانی مسلم اقلیتی نمبر، نئی دہلی، جنوری تا مارچ ۲۰۱۲ء
- (۶) خالد سیف اللہ رحمانی، ”مسلمان اور الیکشن“، ماہنامہ ندائے حرم، جامعہ کنز العلوم احمد آباد گجرات، دسمبر ۲۰۱۲ء
- (۷) سلطان احمد اصلاحي، ”مسئلہ حاکمیت الہ اور اس کے تقاضے“، سہ ماہی علم و ادب علی گڑھ، اپریل تا جون، ۲۰۱۰ء
- (۸) ظفر علی راجا، ”اسکراف، حجاب کا مسئلہ“، اسلام اور یورپی نفسیات، ماہنامہ محدث لاہور، پاکستان، اپریل ۲۰۰۴ء
- (۹) عام انتخابات اور مسلمان، ڈاکٹر خاور ہاشمی، روزنامہ جدید خبر اردو، نئی دہلی، ۱۱ اپریل، ۲۰۰۹ء
- (۱۰) عبدالرحمن مومن، غیر مسلم معاشرہ میں مسلم اقلیتیں، مطالعات نئی دہلی، جنوری تا مارچ، ۲۰۰۸ء
- (۱۱) غطریف شہباز ندوی، مدارس اسلامیہ، مطلوبہ نظام تعلیم کے خدو خال، سہ روزہ دعوت نئی دہلی، ۶ جون، ۲۰۰۶ء
- (۱۲) متزلزل ستون پرنگی جمہوریت، ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی، راشٹریہ سہارا (اردو) نئی دہلی، ۲۷ جنوری، ۲۰۰۸ء

- (۱۳) محمود احمد غازی، الشریعہ کی خصوصی اشاعت، الشریعہ اکیڈمی گونجران والا، پاکستان، جنوری فروری ۲۰۱۱ء
- (۱۴) مسلم پرسنل لا بورڈ - کارکردگی کے چند روشن نقوش، مولانا نظام الدین قاسمی، تعمیر حیات، لکھنؤ، ۱۰ مارچ، ۱۴۰۹ھ
- (۱۵) مسلم پرسنل لا بورڈ - پس منظر، قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، تعمیر حیات، لکھنؤ، ۱۰ مارچ، ۲۰۱۰ء،
- (۱۶) مسلمان سیکولرزم اور ہندوستان، مجلہ ترجمان دارالعلوم، تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند، نئی دہلی، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۸ء
- (۱۷) مسلمانوں کے لیے سیاسی پارٹی کا جواز، ڈاکٹر قاسم رسول الیاس، راشٹریہ سہارا (اردو) نئی دہلی، ۲۷ فروری ۲۰۰۹ء
- (۱۸) موجودہ سیاست اور اقتدار کے بیچ پیٹا سماج، پروفیسر احمد سجاد، سہ روزہ دعوت، نئی دہلی، ۲۲ جون، ۲۰۱۰ء
- (۱۹) موجودہ سیاست میں مسلمانوں کی شرکت اور شرعی حدود، پروفیسر سعود عالم قاسمی، بنگلور، ۲۵ اپریل، ۲۰۱۰ء
- (۲۰) Why We need that Extra Proof of Loyalty from Indian Muslim  
برکھادت، روزنامہ ہندوستان ٹائمز دہلی، ۱۴ مارچ، ۲۰۰۶ء





**GHAIR MUSLIM MUAASHRE ME MUSALMANO  
KI DINI WA AKHLAQI ZIMMEDARI**

**THESIS**

**SUBMITTED FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF**

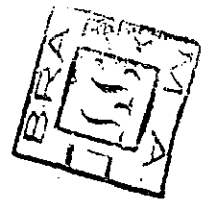
**Doctor of Philosophy**

**IN**

**SUNNI THEOLOGY**

**BY**

**NADEEM ASHRAF**



**UNDER THE SUPERVISION OF**

**PROF. M. SAUD ALAM QASMI**

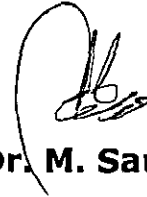
**DEPARTMENT OF SUNNI THEOLOGY  
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY  
ALIGARH (INDIA)**

**2011**



**TO WHOM IT MAY CONCERN**

This is to certify that **Mr. Nadeem Ashraf** Research Scholar Dept. of Sunni Theology, AMU, Aligarh has submitted his thesis of Ph.D. entitled "غیر مسلم معاشرے میں مسلمانوں کی دینی و اخلاقی ذمہ داری" under my supervision. It is further certified that the work is original and based on library research.



**(Prof. Dr. M. Saud Alam)**